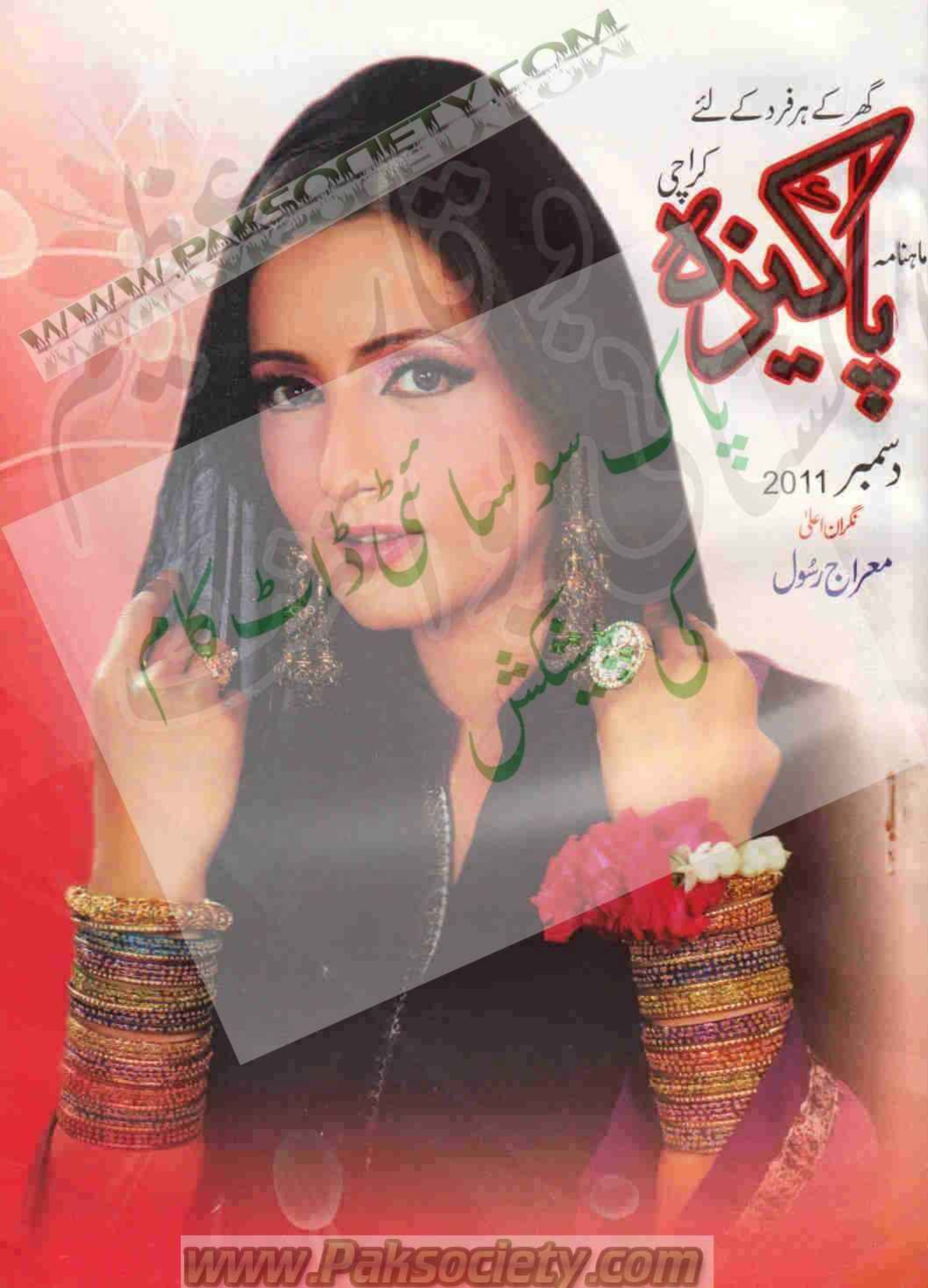

گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
دسمبر 2011
نگران اعلیٰ
معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار .... معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضمون

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 — نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0332-4214400 — رانا اے حمید 0323-2895528

ٹائٹل ڈیزائن: شاہد — فوٹوگرافر: موسیٰ رضا — ماڈل: ثانیہ

جلد 39 • شمارہ 09 • دسمبر 2011 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

دنیا کے اکثر انقلاب وقت کے ساتھ ساتھ اپنا اثر کھوتے جاتے ہیں اور بالآخر نقش بر آب ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد سیاسی و نظریاتی اقتدار ہوتا ہے۔

جذبہ قومیت، وطنیت اور سیاسی اغراض کے انقلابات شہرت دوام حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں...... لیکن کربلا کے انقلاب میں کوئی جذبہ قومیت کارفرما نہیں، کسی بھی دنیوی اغراض و مقاصد کا شائبہ نہیں۔ یہ ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کا انقلاب تھا۔ اسی لیے اسے شہرت دوام حاصل ہوا۔

کربلا کا پیغام ہے کہ عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی جائے۔ اگر انسان کی زندگی میں ایک ایسی صورت آجائے کہ یا مرجائے یا ذلت قبول کرے...... تو پھر پیغام کربلا یہ ہے کہ...... مرجانا بہتر ہے کیونکہ ذلت نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ممنوع راستہ ہے اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے...... اس لیے اسے ذلت کا راستہ کسی صورت اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

واقعہ کربلا ایک وقتی حادثہ نہ تھا بلکہ رہتی دنیا تک آنے والے تمام انسانوں، نسلوں اور قوموں کے لیے حق و انصاف کی راہ میں مر مٹنے کا ایک لافانی پیغام ہے۔

کربلا راہ حق میں استقلال اور ثبات کا درس دیتی ہے۔ امام حسینؓ کا ہر قدم مصائب کے ہجوم میں پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھتا رہا۔ آپ نے ہر آنے والے مصائب کا نہایت پامردی اور استقلال سے مقابلہ کیا۔ گفتار اور کردار دو مختلف چیزیں ہیں۔ کہنا آسان اور عمل کرنا مشکل...... مگر امتحان استقلال میں کربلا کے شہیدوں کا کردار لاثانی ہے۔

امام عالی مقامؓ نے جب یہ فرمایا: میں بیعت نہیں کروں گا تو اس وقت لوگوں کو اس جملے کے صحیح مفہوم کا علم نہیں تھا۔ کربلا میں آپ کے اس ”نہیں“ کے وزن کا دنیا کو علم ہوا...... اور کسی طمع اور لوف نے یہ لا نہیں کے عزم آہنی پر اثر نہیں کیا۔ غور کریں دنیا میں کوئی چھوٹا سا لشکر ہزاروں کے مقابلے میں اس شان سے کھڑا ہو جیسے امام حسینؓ کے جانثار کھڑے تھے...... اگر یہ استقلال و ثبات نہ ہوتا تو عام واقعات کی طرح کربلا بھی ایک فسانہ بن جاتا۔ شہید کربلا، حضرت امام حسینؓ کا ابدی پیغام آج کے ہر انسان کی ضرورت ہے۔

مدیرہ

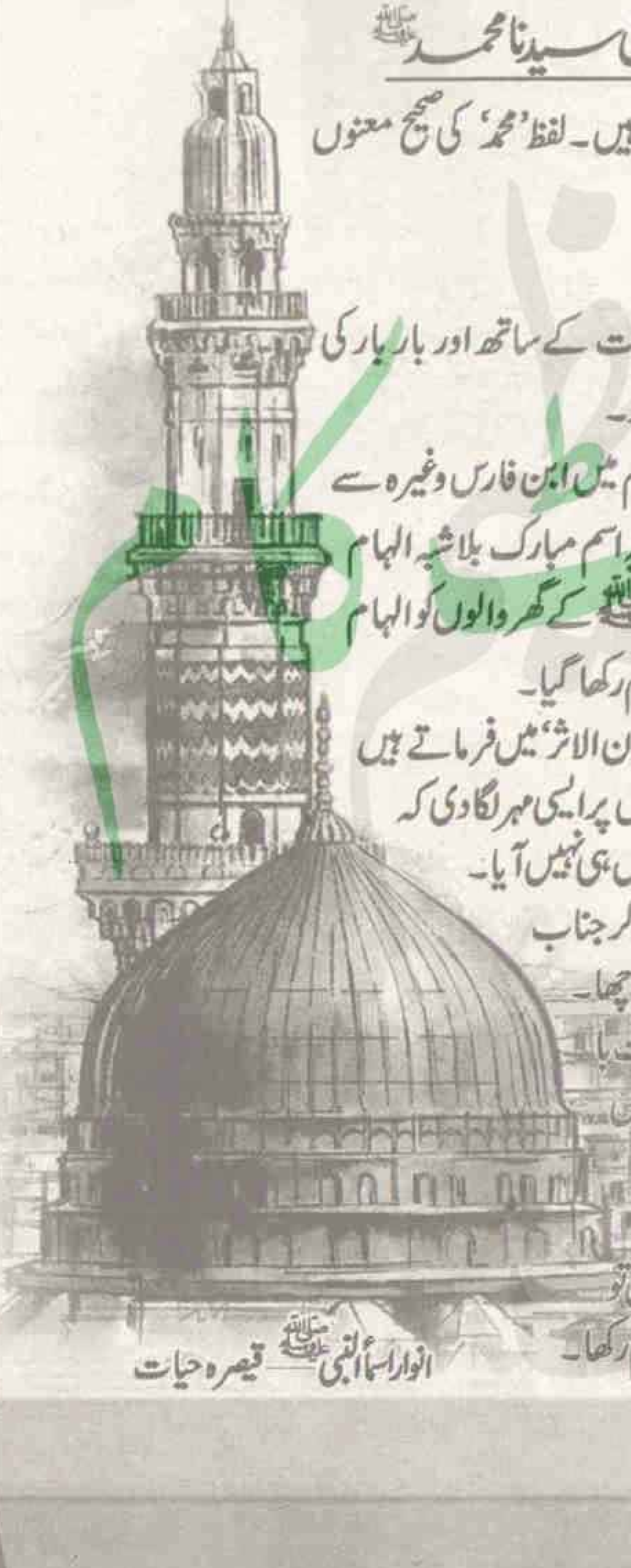
انجم انصار



(اے نبی ﷺ جب تم ان میں موجود ہو (اور لڑائی کی آگ بھڑک رہی ہو) اور تم ان کے لیے نماز قائم (کرنے کا ارادہ) کرو تو (یہ) چاہیے کہ ان (مسلمانوں) میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ رہے اور (انہیں) چاہیے کہ (حالت نماز میں) اپنے ہتھیار لیے رہیں پھر جب (یہ لوگ) سجدہ کر چکیں تو (انہیں) چاہیے کہ پیچھے (دشمن کے مقابلہ پر) ہو جائیں اور چاہیے کہ دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی پس وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھیں اور انہیں بھی چاہیے کہ اپنی حفاظت کی چیزیں اور اپنے ہتھیار لیے رہیں کافر یہ چاہتے ہیں کہ کاش (کسی طرح) تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے اسباب سے غافل ہو جاؤ تو یکبارگی تم پر جھک ماریں (لہٰذا تم ہوشیار رہو) اور اگر تمہیں بارش سے کچھ تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم پر (اس میں) کچھ گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار (اتار کر) رکھ دو اور اپنی حفاظت کی چیزیں لیے رہو بے شک اللہ نے کافروں کے لیے (سخت) ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (۱۰۲) پھر جب تم نماز ختم کر چکو تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرو پھر جب (جنگ موقوف ہو جائے اور) تم مطمئن ہو جاؤ تو (اپنے معمول کے مواقف) نماز پڑھو بے شک نماز ایمان والوں پر فرض ہے (اور اس کا) وقت (اللہ کی طرف سے) مقرر کیا ہوا ہے (۱۰۳)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۰۲ تا ۱۰۳)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ



۲۔ راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔ لفظ 'محمد' کی صحیح معنوں میں تعریف یوں کی جائے گی۔

الذی یحمد حمدا مرۃ بعد مرۃ

وہ ذات جس کی حمد وثناء کثرت کے ساتھ اور بار بار کی جائے اور جس کی تعریف کبھی ختم نہ ہو۔

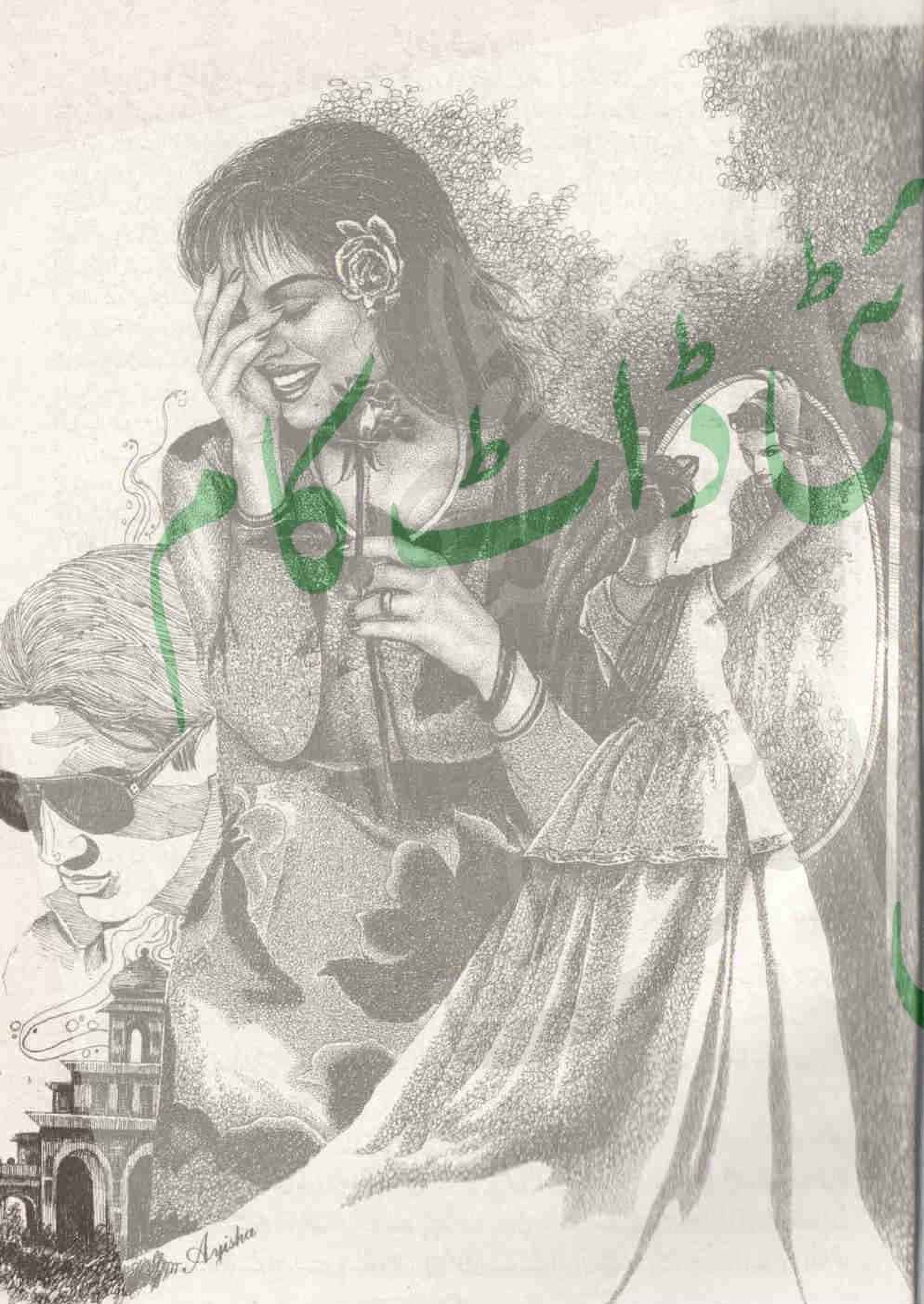
۳۔ علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں ابن فارس وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ ''آپ ﷺ کا یہ اسم مبارک بلاشبہ الہام رحمانی تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے گھر والوں کو الہام فرمایا تھا اس لیے آپ ﷺ کا یہ نام رکھا گیا۔

۴۔ حافظ ابن سید ''الناس' عیون الاثر' میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عرب و عجم کے دلوں پر ایسی مہر لگا دی کہ کسی کو بھی محمد اور احمد نام رکھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

اسی لیے قریش نے متعجب ہو کر جناب عبدالمطلب سے اس نام کی بابت پوچھا۔

اس سے قبل آپ ﷺ کی ولادت با سعادت سے کچھ عرصے پہلے لوگوں نے بنی اسرائیل کی زبانی یہ سنا کہ عنقریب ایک نبی محمد و احمد کے ناموں سے پیدا ہونے والے ہیں تو چند لوگوں نے اسی امید پر یہ نام رکھا۔

انوار اسمائے النبی ﷺ — قیصرہ حیات



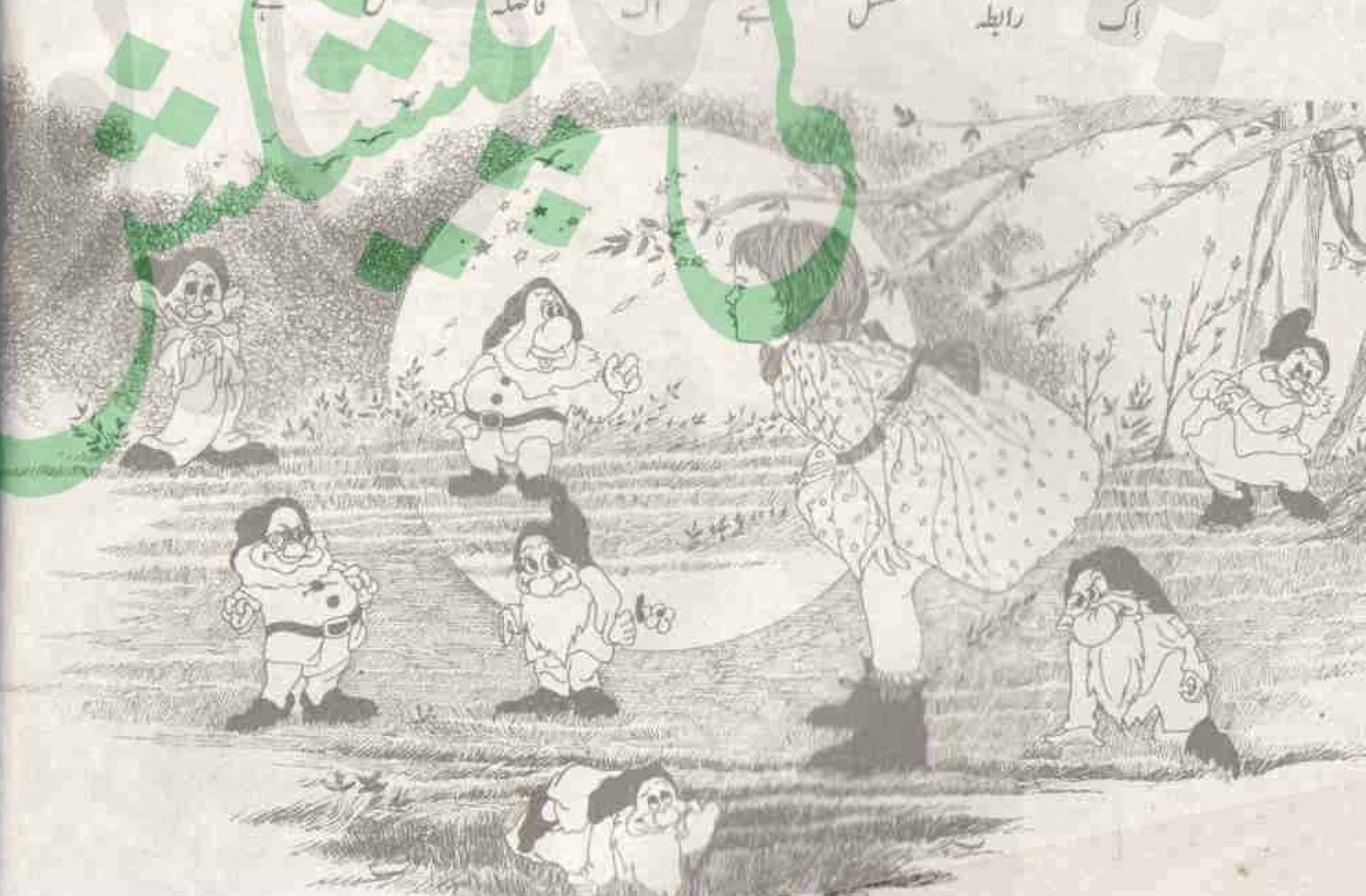
قسط 5

عکس

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکا دینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا۔اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کرلی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے۔جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیر دل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط وضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایبک نظر آتا ہے۔ ایبک شیر دل کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے شیر دل کے گھر آتے ہیں۔ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو شیر دل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیر دل کے کولیگ فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایبک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی مما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیر دل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے منگنی کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی غنی سے شادی متوقع ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میکنگ چیس دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی، وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

(اب آگے پڑھیں)

اس اسٹینڈنگ مرر میں اپنے عکس پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس نے اپنی یادداشت کے سارے خانوں کو جسم سے اترے ہوئے لباس کی جیبوں کی طرح کھنگالنا اور جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ کتنے سال بعد اس نے اس مرر کو دیکھا تھا اور اس مرر میں کیا کیا دیکھا تھا۔

آئینہ اتنے سالوں کے بعد آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ کم آب وتاب کے ساتھ لیکن اسی وقار کے ساتھ جس کے ساتھ اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ گھر کا ایکسٹیریئر مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ آئینہ جیسے کسی شہزادی کا رومال تھا جسے وہ پھاڑ کر پھٹنے اور غائب ہونے سے پہلے شہزادے کی رہنمائی کے لیے باہر چھوڑ گئی تھی۔ واحد سراغ...... ہر ہر بھید تک لے جانے اور اسے پانے والا۔ چند لمحوں کے لیے اس آئینے کو دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا تھا

وہ بھی تب ہی وہاں سے ہٹے گا، غائب ہوگا جب حضرت سلیمانؑ کے عصا کی طرح اسے بھی کھڑے کھڑے دیمک لگ جائے گی، پھر ایک دن وہ برادے کے ایک ڈھیر اور آئینے سے شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ پتا نہیں وہاں کھڑا وہ کس کس کا عکس دیکھتا اور دکھاتا رہا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں نظر آتی عمارت کے بیرونی حصے کے عکس کو دیکھنے لگی۔ انگلیوں کی پوروں پر اس نے جیسے وہ سال گنے تھے جب وہ آخری بار اس گھر سے گئی تھی۔ وہ گھر جو اس کی زندگی کا خوب صورت ترین اور سیاہ ترین باب تھا۔ وہ گھر جس سے زیادہ محبت اور نفرت اسے کبھی کسی جگہ سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ گھر جو وہاں آکر بسنے والے انسانوں کے تمام احساسات سے بے نیاز آج بھی اسی تمکنت سے وہاں کھڑا تھا۔

اور پھر آئینے میں اپنے اور اس گھر کے عکس کے درمیان اس نے یک دم کسی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار مسکرائی۔ اس نے زندگی میں اس مرد کے علاوہ صرف ایک مرد کو...... وہ آگے کچھ سوچ نہیں پائی، وہ اب اس کے عقب میں کھڑا اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”You look lovely“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”Thank you for flattering me“ اس نے جواباً کہا۔ وہ اس کے عکس پر نظر جمائے ہوئے بے اختیار مسکرایا۔ گہری، گرم جوش، بہت کچھ یاد دلا دینے والی آنکھیں...... بے حد باریک ہونٹوں پر آنے اور کھلنے والی بے ساختہ اور خمار مسکراہٹ...... اور یہ مسکراہٹ کیا کیا طوفان نہیں اٹھا دیتی تھی۔ کون کون سی قیامت تھی جو بپا نہیں کر دیتی تھی۔

”You are more than welcome“ اس نے ذرا سا ہنس کر اس کی بات پر جیسے کسی ندامت کا اظہار کیے بغیر دھڑلے سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے میں پہلی بار اس گھر میں کب آئی تھی؟“ اس نے آئینے میں اس کے عکس کے عقب میں موجود عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب بھی اس کے کندھے پر اسی طرح دونوں ہاتھ جمائے، ٹکائے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی، نرم، سہارا دیتا ہوا دباؤ۔ چند لمحوں کے لیے جیسے اس کا دل اس سے لپٹ جانے کو چاہا تھا۔

”جب......“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق سے نہیں نکل سکی۔ آنسوؤں کے ایک ریلے نے اس کی قوت گویائی اور بینائی دونوں کو بیک وقت مفلوج کیا تھا۔ یادیں تھیں...... درد کے آبلے تھے جو گرم پانی کے چشموں کی سطح پر ابھرنے والے بلبلوں کی طرح پھٹنے لگے تھے۔ کندھوں پر ٹکے وہ دونوں ہاتھ سرعت سے بازوؤں پر آئے پھر انہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ حصار جس نے زندگی میں کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا، وہ حصار جو اس کے لیے ایک عطا تھا کسی کا تحفہ۔ اس کے بازوؤں کے حصار میں روتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کون سے کانٹے پہلے نکال کر اس کو دکھائے...... وہ جو پاؤں میں تھے یا وہ جو دل میں تھے۔ سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ جو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کو دوبارہ بھلانے کے لیے وہ کیا کرے گی۔

اس گھر کے برآمدے میں لگا وہ آئینہ، شہزادی تک پہنچانے والا واحد سراغ، اب جیسے شہزادے کو اس کے

پاس لے آیا تھا، پہاڑ کی اس کھوہ میں جہاں ایک شہزادی کو کئی سال پہلے گہری نیند سلا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل نے اس کو کاریڈور میں داخل ہوتے ہی بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ کمشنر آفس کے میٹنگ روم کے داخلی دروازے پر کھڑی اپنے عملے کے کسی رکن کو ہدایت دینے میں مصروف تھی۔

چیف کمشنر کے ساتھ ڈویژن کے تمام ڈی سی اوز کی دس بجے ہونے والی میٹنگ کا انتظام اس کی ذمے داری تھی۔ شیر دل کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ رینگی تھی اور ایسا کیوں تھا وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

عکس مراد علی کو اپنے سامنے پا کر اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی یا پھر غصہ آتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بے تاثر رہ پایا ہو...... خوشی کا وہ حال ہوتا تھا کہ وہ بہت دن تک اس کے ٹرانس سے باہر نہیں نکل پاتا تھا...... اور غصہ سمندر کی ایک شوریدہ سر لہر کی طرح آ کر گزر جاتا تھا۔

ایمرلڈ گرین لانگ شرٹ میں سیاہ چوڑی دار پاجامے اور دوپٹے میں کندھوں سے کافی نیچے تک جاتے اسٹیپس میں کٹے ہوئے گھنے سیاہ بالوں کو وہ اب بھی بات کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جھٹک رہی تھی۔

وہ اس کو کئی سالوں بعد دیکھ رہا تھا لیکن شیر دل کو کم از کم دور سے اس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے شخص کے ساتھ بات کرتے کرتے اپنا رخ موڑا تھا اور تب اس نے بھی شیر دل کو دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل نے اس کو بھی بات کرتے کرتے ٹھٹکتے دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر بھی ایک مسکراہٹ آئی تھی۔ نظروں اور مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد اس نے عملے کے اس فرد کو کچھ آخری ہدایات دیں۔ شیر دل کے اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا عملہ وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس کے بالمقابل جا کر کھڑے ہوتے ہوئے شیر دل کا دل بے اختیار مچلا تھا کہ وہ اپنے عقب میں آنے والے اپنے اسٹاف کو وہاں سے رخصت کر دے...... کم سے کم چند لمحوں کے لیے۔ عکس کو دیکھ کر اس کے دل میں ہر قسم کی احمقانہ اور بچگانہ خواہشات پیدا ہوتی رہتی تھیں اور یہ ہمیشہ سے تھا۔ ہاں پہلے کبھی اس نے اپنی ان تمام خواہشات کو احمقانہ اور بچگانہ کا لیبل نہیں لگایا تھا، اب لگانے لگا تھا۔ یہ کام وہ نہ کرتا تو وہ کرتی جو اس سے تین فٹ کے فاصلے پر اس کے سامنے کھڑی اپنی سیاہ، چمکدار، شفاف، گہری آنکھوں اور بے حد جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو!'' اس کے خیر مقدمی کلمات کے آغاز سے پہلے ہی شیر دل نے کہا تھا۔

''سر آپ کیسے ہیں؟''

''I am good آپ کیسی ہیں میم؟''

''I am fine too، آپ کا سفر ٹھیک رہا؟''

''جی، چیف آ چکے ہیں؟''

''وہ بس راستے میں ہیں، دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔'' کمشنر آفس میں کھڑے اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے انتظامی عملے کے بیچ میں وہ ایک دوسرے سے یہی کہہ سکتے تھے جو کہہ رہے تھے...... فارمل انداز اور کلمات۔ صرف ان کی مسکراہٹ اور آنکھیں تھیں جو ایک دوسرے کو وہ پہنچا رہی تھیں جو اُن کے احساسات تھے۔ صرف چند منٹ وہ وہاں کھڑا رہا تھا پھر میٹنگ روم میں چلا گیا تھا، اس کے پاس سے نہ ہلنے کی خواہش کے باوجود۔

میٹنگ ٹھیک وقت پر شروع ہوئی تھی۔ شیر دل کمشنر کے بائیں جانب میز کی پہلی کرسی پر تھا اور وہ اس کے بالمقابل کمشنر کے داہنی جانب پہلی سیٹ پر براجمان تھی۔ اور اس سیٹنگ ارینجمنٹ سے شیر دل کو کم از کم یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے لیے ٹیبل کے سرے پر بیٹھے ہوئے کمشنر اور میٹنگ پر توجہ مرکوز رکھنا آج کافی مشکل ثابت ہونے والا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا...... وہ بار بار بھٹک رہا تھا، اسے دیکھتے اور سنتے ہوئے۔ وہ اب بھی اسی طرح بات کر رہی تھی جس طرح ہمیشہ کرتی تھی۔ نپا تلا انداز، تول کر بولنے کی عادت، بے حد ٹھہراؤ والا دھیما، ملائم لہجہ اور بے حد شستہ اور مدلل گفتگو۔

شیر دل نے اکیڈمی میں اس کے ساتھ ٹریننگ کے دوران اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ کام کے دوران کبھی اس کو اسٹریس میں آ کر ٹیمپر لوز کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بے حد ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا لیکن عکس مراد علی جیسا تحمل اور Composure اس نے بہت کم کسی میں دیکھا تھا۔ وہ کم گو نہیں تھی لیکن بات چیت میں بے حد محتاط تھی۔ شیر دل نے اکیڈمی میں بھی اسے دوسری لڑکیوں کے ساتھ کبھی بے مقصد گپیں ہانکتے نہیں دیکھا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ عکس کی بہت کم بات کبھی بھی Misquote ہوئی تھی۔

وہ کمشنر کو کسی پروجیکٹ کی بریفنگ دے رہی تھی اور وہ اسے دیکھتے ہوئے بیٹھا بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ میٹنگ میں بریفنگ دیتے ہوئے بھی عکس اپنے بالمقابل ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے اس شخص کی خود پر مرکوز نظروں سے آگاہ تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کبھی اس کے سامنے بیٹھی ہوتی اور شیر دل کسی اور چیز کو دیکھ پاتا۔ بریفنگ ختم کر کے اپنے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس نے سامنے بیٹھے شیر دل کو دیکھا۔ وہ بھی پانی پی رہا تھا۔

☆☆☆

شیر دل نے عکس مراد علی کو اکیڈمی میں ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے ایک ہفتے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ میڈیکل لیو پر تھی اور پہلی پوزیشن پر آنے والے امیدوار کے بارے میں سب کا تجسس اور اشتیاق آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ شیر دل ان میں شامل نہیں تھا اور وہ واقعی ہی ان میں شامل نہیں تھا۔ شروع شروع میں اسے عکس کے بارے میں جاننے میں تجسس اور دلچسپی ضرور تھی لیکن عکس کی ٹریننگ شروع ہونے پر بھی وہاں موجود نہ ہونے پر دوسروں کی طرح اس کا اشتیاق بڑھنے کے بجائے کم ہو گیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی نے جیسے شیر دل کو وہاں سب کی توجہ کا مرکز بننے کا موقع دے دیا تھا۔ پہلی پوزیشن والے امیدوار کی عدم موجودگی میں دوسری پوزیشن والا امیدوار قائم مقام کی حیثیت سے تمام مراعات اور اضافی سہولتیں پا رہا تھا۔ عکس مراد علی کے آنے تک شیر دل اکیڈمی کی تمام خواتین Commoners کا Heartthrob بن چکا تھا۔ وہ اپنے Common میں آنے والے چند بااثر ترین خاندانوں کے سپوتوں میں سے ایک تھا اور ضرورت سے زیادہ ہینڈسم تھا۔ یہ Expression اس کے لیے اکیڈمی کے ایک انسٹرکٹر نے از راہِ تفنن استعمال کیا تھا جو پھر اس کے لیے اکثر دوسرے بھی گاہے بگاہے میں استعمال کرنے لگے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد شیر دل کا تخت کسی بغاوت کے بغیر دن دہاڑے الٹایا گیا تھا جب عکس مراد علی اکیڈمی میں اپنی جگہ لینے آ گئی تھی۔ شیر دل نیوز پیپر میں اس کی تصویریں دیکھ لینے کے بعد کم از کم شکل کی حد تک اس سے واقف تھا

لیکن ایک ہفتے کی میڈیکل لیو کے بعد اکیڈمی میں آنے والی لڑکی شیر دل کو اس سے کہیں زیادہ ان انٹریکٹو لگی تھی جتنی اسے نیوز پیپر میں لگی تھی۔ وہ کسی اسکن انفیکشن کا شکار تھی اور قدرے صحت یاب ہونے کے باوجود اس کے چہرے، گردن، ہاتھوں اور بازوؤں پر سرخ رنگ کے چھوٹے بڑے ان گنت دھبے تھے اور اس الرجی نے عکس مراد علی کو کافی مضحکہ خیز سی حالت میں ہر ایک سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اپنی اس حالت کے باوجود اور بے حد یزرو طبیعت رکھنے کے بعد بھی اپنے کامن کے ساتھیوں سے علیک سلیک کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر وہاں کسی کو یہ غلط فہمی تھی کہ پہلی پوزیشن لینے والی امیدوار خراب اور الٹے دماغ کے ساتھ وہاں پہنچے گی تو وہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ عکس مراد علی بے حد نرم خو اور دوستانہ مزاج رکھنے والی لڑکی تھی۔ اگلے ایک ہفتے میں شیر دل نے اس کو ہر ایک کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا تھا سوائے اپنے...... اور یہ چیز جیسے اسے بری طرح کھلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے عکس نے اسے دانستا نظر انداز کیا تھا...... اپنے سب سے قریبی اور سب سے خطرناک حریف کو۔

چند بار اکیڈمی میں مختلف جگہوں پر ان کا آمنا سامنا بھی ہوا تھا مگر تب بھی دونوں کے درمیان سرد مہری اور خاموشی نہیں ٹوٹی تھی، اگر عکس نے شیر دل سے علیک سلیک میں پہل نہیں کی تھی تو شیر دل نے بھی اسے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ وہ بھی اسے ہر جگہ پر اسی طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تھا جس طرح وہ اسے۔ وہ اس کے وہاں ہوتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں پھیرے رہتی تھی اور اس سرد مہری میں کچھ اضافہ اس حقیقت نے بھی کر دیا تھا کہ اس کی آمد کے چند دنوں میں ہی عکس نے کلاسز میں شیر دل جیسے ماہتاب کو گرہن لگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کلاس میں ہمیشہ کم پوائنٹس پر بولتی تھی لیکن ان پوائنٹس اور ان مواقع پر بولتی تھی جن پر دوسروں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا یا جب دوسرے بحث کر کر کے کسی لوجیکل نتیجے پر پہنچنے میں ناکام ہو چکے ہوتے...... اور پھر جیسے ہر ایک کو لاشعوری طور پر کلاس کے کسی کونے سے سب سے آخر میں ابھرنے والی اس بے حد خوب صورت آواز کا انتظار ہوتا تھا جو مسئلے کے الجھے ہوئے دھاگے کا سرا الجھن میں سے بال کی طرح نکال کر یوں پلیٹ میں سب کے سامنے رکھتی کہ چند لمحوں کے لیے سب کو اپنا آپ بھدا اور احمق محسوس ہوتا......

اور بہت آہستہ آہستہ عکس مراد علی نے اپنے آپ کو کلاس کا فوکل پوائنٹ بنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ 188 لوگوں کے اس کامن میں سب سے برتر کیوں تھی یہ بہت جلد ہی سب کو پتا چلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں موجود تمام لڑکے لڑکیاں غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے اور تمام ہی اپنے اپنے علاقوں اور فیلڈز میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے آئے تھے تو اکیڈمک ریکارڈ کی بنیاد پر عکس اور دوسرے لوگوں میں بہت زیادہ فرق نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ کسی بھی ڈسکشن میں کسی بھی پوائنٹ کو سمجھنے میں ریزر شارپ تھی اور اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کرسٹل کلیئر اور ٹو دا پوائنٹ۔ کلاس میں یہ اس کی امتیازی حصوصیات تھیں جو بعض مواقع پر دوسروں کو مرعوب کرتی تھیں لیکن کئی مواقع پر دوسروں کو خائف اور Insecure کر دیتی تھیں۔ وہ دوسروں کی بات کاٹ کاٹ کر جذباتی انداز میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی عادی نہیں تھی، نہ ہی اسے کلاس میں ہر سوال کا جواب سب سے پہلے دینے کا خبط تھا۔ وہ ہر ایک کی بات بہت دیر تک اور بے حد سکون سے سن لینے کے بعد اپنا اختلافی نقطہ نظر دوسروں کے سامنے رکھتی تھی۔ کم سے کم اس معاملے میں وہ اپنے کامن کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔

میس میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے شیر دل نے ایک دن عکس عکس مراد علی شہد کی دلدل ہے۔

کے بارے میں کسی کا تبصرہ سنا تھا اور وہ جیسے اش اش کر اٹھا تھا۔ عکس مراد علی کے لیے اس سے زیادہ موزوں ٹائٹل کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

اور شہد کی وہ دلدل پاکستان واپسی کے بعد چیف کمشنر کو دی جانے والی اس پہلی بریفنگ میں بھی اسی طرح تباہ کن حد تک پُراعتماد اور مستعد تھی۔

میٹنگ کا اختتام لنچ کے بعد ہوا تھا اور اپنی گاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے پورے دن میں پہلی بار شیر دل اور عکس کو ایک دوسرے سے انفارمل گفتگو کا موقع ملا تھا۔ ان کا اسٹاف ان کی گاڑیوں کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ خود راستے میں رک کر ایک دوسرے سے گپ شپ کرنے لگے۔

''تم کیا کر رہی ہو اب؟'' شیر دل نے اس کی اگلی مصروفیات کا پوچھا۔ چار بجنے والے تھے اور آفس ٹائم تقریباً ختم ہونے والا تھا۔

''میں ابھی تو گھر جاؤں گی پھر شام کو دوبارہ آفس جانا ہے کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' عکس نے اس سے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا بیٹھتے ہیں کہیں...... چائے، کافی پیتے ہیں، گپ شپ لگاتے ہیں، کافی عرصہ ہو گیا بیٹھ کر بات کیے۔'' شیر دل نے اس سے کہا وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے چلتے ہیں کہیں...... گھر چلو گے یا گالف کلب چلیں؟'' عکس نے اس سے کہا۔

''I'm at your disposal'' شیر دل نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جواباً قدم بڑھاتے ہوئے مسکرائی۔

''Then you would be disposed off soon'' شیر دل اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔

''وہ تو تم نے سالوں پہلے کر دیا۔ dumped...discarded۔'' شیر دل نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اسے جتایا۔

''گالف کلب چلتے ہیں۔'' بات کو اس نے اسی مہارت سے بدلا تھا جس کی توقع شیر دل کو تھی۔

''شہر بانو کیسی ہے؟'' گالف کلب کے ریسٹورنٹ کی گلاس ونڈوز کے پاس پڑی ایک ٹیبل پر اپنی نشست سنبھالتے ہی عکس نے اس سے پوچھا۔

''بڑے خراب موڈ میں ہے آج کل۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟...... کیا ہوا......؟'' وہ بھی مسکرائی۔

''میرا خیال ہے میں وجہ ہوں۔'' شیر دل نے سگریٹ کا پیک کھولا اور بڑی سنجیدگی سے کہتے ہوئے ایک سگریٹ نکالا۔

''ہاں وہ تو میں جانتی ہوں تم ہی وجہ ہو گے...... مگر اس بار کیا کیا ہے تم نے۔'' عکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس بارے سے کیا مراد ہے تمہاری۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے ٹھٹکا۔ ''پہلے کیا کرتا رہا ہوں میں؟''
''میں تمہاری Biography (سوانح) نہیں لکھ رہی۔'' عکس نے اطمینان سے کہا۔ وہ ہنسا۔
''یار میرا خیال ہے اگر میری طلاق ہوئی تو اس میں ایک بنیادی رول چیف کا ہوگا۔'' وہ اب سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بے حد سنجیدگی اور جیسے کچھ تشویش سے کہہ رہا تھا۔ عکس کو ہنسی آگئی۔ اس کا اشارہ چیف کمشنر کی طرف تھا جو ڈویژن کے ڈی سی اوز کو پھرکی کی طرح گھمانے میں کمالِ شہرت رکھتا تھا...... وہ خود Workaholic تھا اور اس کو بعض دفعہ آدھی رات کو کوئی فائل چیک کرتے ہوئے کوئی بھی ڈی سی او یاد آجاتا تھا اور جو اسے آدھی رات کو یاد آجاتا وہ فجر تک اپنی جان اس سے چھڑا نہیں پاتا تھا۔ این ڈی لطیف اپنا کام آفس میں کر کے آتا تھا اور باقیوں کا کام اپنے گھر میں نبٹاتا تھا اور وہ بھی بے حد فرصت سے۔ ڈی ایم جی کے سینئر آفیسرز میں بہت کم این ڈی لطیف کی طرح 18 گھنٹے کام کرنے کا اسٹیمنا رکھتے تھے اور وہ جس ڈویژن میں بھی ہوتا اس کے ماتحتوں کی جان حلق میں اٹکی رہتی اور آج کل شاید شیر دل اس کی توجہ کا خاص مرکز تھا اور اس کی وجہ اس کے ڈسٹرکٹ میں شروع ہونے والے بڑے بڑے پروجیکٹس تھے۔
''تم ہنس سکتی ہو کیونکہ I think the chief has a crush on you'' شیر دل نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتانے کی دانستہ کوشش کی۔ عکس نے ایک دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے پڑے ہوئے گلاس میں پانی انڈیلنا شروع کر دیا۔ وہ شیر دل کی اس بکواس کی عادی تھی اور آج کی میٹنگ میں عکس کے علاوہ شیر دل سمیت تمام DCO's اپنے اپنے حصے کی کافی بے عزتی سمیٹے بیٹھے تھے...... اور اس ''جھاڑ پونچھ'' کے بعد شیر دل سے وہ اسی طرح کے ردِعمل کی توقع کر رہی تھی۔
''تم مجھے شہر بانو کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔'' عکس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس کی کوششوں پر جیسے پانی ڈالتے ہوئے کہا۔
''لیکن اس سے پہلے میں تمہیں چیف کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔'' شیر دل نے بات کو پھر وہیں لے جاتے ہوئے کہا۔ ''چیف تمہیں پسند کرنے لگا ہے شاید۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
''شاید نہیں یقیناً...... تمہیں اس سے کوئی پرابلم ہے کیا؟'' وہ بری طرح لاجواب ہوا تھا۔
''نہیں ہونی چاہیے کیا؟'' اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔
''بالکل نہیں ہونی چاہیے۔'' عکس نے ترکی بہ ترکی کہا اور ساتھ ہی اسے کھانسی آئی اور پھر وہ کھانستی ہی چلی گئی۔
''کیا ہوا یار؟'' شیر دل نے اس کا گلاس اٹھا کر اسے تھمانے کی کوشش کی۔
''یہ تمہارے سگریٹ کا کمال ہے۔'' عکس نے بہ مشکل اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ شیر دل نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرف دیکھا۔
''کیوں سگریٹ نے کیا کیا ہے؟'' وہ قدرے حیران ہوا اس سے پہلے اس کی اسموکنگ نے کبھی عکس کی یہ حالت نہیں کی تھی۔
''Asthma ہے مجھے۔'' عکس نے پانی کا ایک اور گھونٹ لیا۔
''ارے یہ کب سے؟'' شیر دل نے چونک کر بے اختیار سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھاتے ہوئے کہا۔

''امریکا کی سوغات ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور تم جو چیف کے بارے میں بکواس کرتے رہتے ہو نا یہ اگر ان تک پہنچ گئی تو دن میں تارے دکھا دیں گے وہ تمہیں۔'' عکس نے جیسے اسے تنبیہ کی۔
''یار آدھی رات کو کال کر دیتے ہیں...... میری ساری رات آج کل فون پر چیف کے ساتھ ہی گزر رہی ہے۔'' شیر دل واقعی تنگ آیا ہوا تھا۔
''میرا خیال ہے اصلی crush ان کا آج کل تم پر ہے۔'' عکس نے مسکراتے ہوئے اسے tease کیا۔
''شہر بانو کہتی ہے میں مستقبل کا این ڈی لطیف ہوں۔'' شیر دل نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
''یعنی تم چیف کا ماضی ہو؟'' عکس مسکرائی۔ ''اگر چیف تمہارے جیسے ہینڈسم ہوتے تو ان کا لائف اسٹائل تمہارے جیسا ہی ہوتا، پھر تو ان کے پاس رات چھوڑ دن کو بھی کام کرنے کا وقت نہ ہوتا۔'' شیر دل نے ایک بار پھر اس کے چوٹ کرتے جملے کو نظر انداز کیا۔
''اس دن فون پر کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں تم؟'' شیر دل نے اس کے تبصرے کے جواب میں وہ سوال کیا جو اتنے دنوں سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ عکس نے بے اختیار گہری سانس لی۔
''اس ایک سوال کے لیے کتنی لمبی تمہید باندھی تم نے، میرے ساتھ چائے پینے آئے، گھما پھرا کر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، سیدھا سیدھا اسی دن کیوں نہیں پوچھ لیا تم نے...... اتنا لمبا صبر اور انتظار...... That's so unlike you Sherdil...... کیسے گزار لیے تم نے اتنے دن اس بے چینی کے ساتھ کہ میں کس سے بات کر رہی تھی اس دن...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کس کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔'' اس نے مونو سیکنڈ میں شیر دل کا مدعا جانا تھا اور اسی رفتار سے شیر دل کی گفتگو کو مذاق اڑاتے ہوئے ادھیڑا تھا۔ شیر دل نے اس عورت کے ہاتھوں شرمندہ ہو کر برا منانا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا...... فائدہ نہیں تھا خواہ مخواہ اس کی باتوں کو دل سے لگانے کا۔
''اچھا تو پھر کون تھا وہ؟'' شیر دل نے اسی ڈھٹائی کے ساتھ پوچھا۔
''پیرنٹس آئے ہوئے ہیں آج کل میرے، ساری فیملی ہے یہاں۔ تمہارا کیا خیال تھا...... کون ہوگا؟'' شیر دل ہی کی طرح عکس نے بھی اس کے ان الٹے سیدھے سوالوں اور باتوں کا برا منانا اکیڈمی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اسے کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ شیر دل بے اختیار مسکرایا۔
''اوہ پیرنٹس آئے ہوئے ہیں...... گریٹ۔'' عکس کے سوال کو اس نے بھی اسی طرح گول کیا تھا مگر کیا اطمینان تھا جو اس نے محسوس کیا تھا۔
''لیکن تمہاری فیملی کیوں آئی ہوئی ہے یہاں......؟'' شیر دل کو مسکراتے ہوئے یک دم خیال آیا۔
''مجھ سے ملنے...... میں دو سال پاکستان سے باہر رہی ہوں وہ تو ہر سال آتے ہیں یہاں...... اس بار میری وجہ سے کچھ جلدی آگئے ورنہ دسمبر میں آتے۔'' عکس نے تفصیل سے بتایا۔ ویٹر اب انہیں کافی اور اسنیکس سرو کر رہا تھا۔
''تمہارے اسٹیٹس میں کوئی تبدیلی ہوئی؟'' ویٹر کے جانے کے بعد کیک کے ایک سلائس کو کاٹ کر اٹھاتے ہوئے شیر دل نے اس سے وہ سوال کیا جو وہ بہت عرصے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

''بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' کیک کا ٹکڑا شیر دل کو یک دم کڑوا لگا۔
''مطلب؟'' وہ کیک کا دوسرا ٹکڑا اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔
''تم یہ کیوں چاہتے ہو شیر دل کہ میں تمہیں اپنی ہر پرسنل بات بتایا کروں۔ یہ بھی بتاؤں کہ میری فلاں شخص سے منگنی یا شادی ہونے والی ہے یا ہو رہی ہے...... یا......'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔
''So you are seeing some one these days?''
''اگر تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد اس ایشو کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے تو میں تمہیں اس سوال کا جواب دوں گی۔'' عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔
''او کے...... اب بتاؤ۔'' شیر دل نے بے ساختہ کہا۔
''ہاں۔'' اس نے بھی فوراً ہی جواب دیا۔
''بیچ میٹ ہے ہمارا کوئی؟'' شیر دل بے اختیار ٹیبل پر کچھ آگے جھک آیا۔
''تم نے کیا وعدہ کیا ہے ابھی؟'' عکس نے کچھ خفگی سے کہا۔
''میں تمہارے بارے میں نہیں اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' وہ بھی اتنا ہی سنجیدہ تھا۔
''تمہیں کیا کرنا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی جان کر؟''
''اور تم کیوں اس کو مجھ سے چھپا رہی ہو؟'' اس نے ترکی بہ ترکی عکس سے کہا۔ وہ بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گئی۔
''جب تمہیں شادی کا کارڈ ملے گا تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کون ہے وہ......''
''میں شادی کے کارڈ پرنٹ ہونے سے بہت پہلے تمہیں بتا دوں گا کہ کون ہے وہ......'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔
''میں نے شہر بانو کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا تھا؟'' عکس نے بے حد خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔
''میں نے خود تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا...... چھپایا کیا تھا؟'' وہ لاجواب ہو گئی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا وہ واقعی اس سے کبھی کچھ نہیں چھپاتا تھا...... کم از کم عکس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے شیر دل سے کچھ بھی پوچھا ہو اور اس کو جواب دینے میں تامل رہا ہو۔ وہ چند لمحے یہی سوچتی رہی تھی۔
''بیچ میٹ ہے ہمارا کوئی؟'' شیر دل نے اسے خاموش دیکھ کر پھر کہا۔
''نہیں۔'' اس بار عکس نے کسی اعتراض کے بغیر کہا۔
''سول سرونٹ ہے؟''
''نہیں۔''
''اوہ......'' شیر دل نے بے اختیار کہا۔
''گورنمنٹ سروس میں نہیں ہے۔'' شیر دل کو اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ دلچسپی ہوئی۔
''نہیں۔''
''تو......؟'' وہ جواب دینے میں ایک بار پھر متامل نظر آئی شیر دل کو اس سوال کا جواب دینے کا مطلب

کیا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی زندگی کی بہت ساری fantasies کو ختم کرنے کا باعث بنتا رہا تھا...... اپنی نیک نیتی کے باوجود...... اور اس سے معلومات کے تبادلے کا مطلب عکس کو خائف کر رہا تھا۔ شیر دل بے حد تحمل سے اس کے سامنے بیٹھا کافی پیتا ہوا اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ سالوں بعد مل رہے ہیں...... درمیان میں بہت کچھ آیا تھا اور بہت کچھ ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ایک ملاقات میں ہی وہ ایک بار پھر یوں شیر و شکر ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور یہ ان کے تعلق کا حیران کن پہلو تھا۔ وقت، فاصلہ، اختلافات، کوئی چیز ان کے باہمی تعلق اور ذہنی ہم آہنگی کو ختم نہیں کر پائی تھی۔ وہ جب بھی ملتے تھے بے حد کوشش کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ بہت دیر تک ریزروڈ اور فارمل نہیں رہ پاتے تھے۔ بات شروع کرتے اور پھر بات سے بات نکلتی جاتی۔ کون سی چیز ذاتی ہونے کی وجہ سے دوسرے کے لیے قابلِ مداخلت نہیں تھی انہیں یہ بھی بھول جاتا...... ان کے لیے جیسے ایک دوسرے کی ذات اور زندگی میں کوئی نو گو ائیر یا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم شیر دل ایسا ہی سمجھتا اور محسوس کرتا تھا اور اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ کافی کے ایک کپ سے شروع ہونے والی گفتگو چند منٹوں میں کہاں پہنچ گئی تھی۔ دونوں کو وہاں آنے سے پہلے اندازہ بھی نہیں تھا۔ عکس اب پچھتا رہی تھی اسے شیر دل کی آفر قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ شیر دل نے کافی کا مگ خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور پھر بے حد سنجیدگی سے کہا۔
''وہ جو اس دن میں نے جس مرد کی آواز سنی تھی وہ یقیناً یہی صاحب ہوں گے اور اپنی فیملی کے ساتھ تمہارے گھر پر تھے وہ۔'' شیر دل کے ذہن کو صرف وہ Psychic کی طرح نہیں پڑھتی تھی، وہ بھی اس کی ہر بات اور ارادے کو ڈی کوڈ کرنے میں ماہر تھا۔ چھپاتے تو ایک دوسرے سے کیا چھپاتے وہ...... اور کس طرح......؟ صرف ایک صورت تھی اگر اندھے اور گونگے بن کر بیٹھ جاتے دونوں تو...... اور یہ ان دونوں کے لیے ہی ممکن نہیں تھا۔ عکس نے بھی بالآخر اپنی کافی ختم کر لی۔
''منگنی ہوئی ہے یا شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے؟'' شیر دل یوں اطمینان سے پوچھ رہا تھا جیسے اسے اپنے تکے کے تیر ہونے کا الہامی یقین ہو۔
''وہ صرف ہمارے گھر آئے تھے...... دونوں فیملیز ایک دوسرے سے ملیں اور بس...... اور کچھ فائنل نہیں ہوا ابھی۔'' عکس نے مزید کچھ چھپانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے بتایا۔
''اور کون ہیں یہ موصوف؟'' شیر دل نے کانٹے کے ساتھ کڑوے کیک کا ایک اور ٹکڑا اٹھایا۔
''میرے ساتھ امریکا میں ہی تھا، بوسٹن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے اس سال اس نے ماس کمیونیکیشنز میں...... پولیٹیکل فیملی سے تعلق ہے اس کا...... اور اس کے فادر پارلیمینٹیرین ہیں...... اور اب تم مجھے [illegible] کر اس کے بارے میں کچھ ایسی معلومات دینا کہ مجھے اس کی شکل دیکھنے میں بھی دلچسپی نہ رہے۔'' بے حد سنجیدگی سے کہے گئے آخری جملے پر شیر دل کو بے اختیار ہنسی آئی تھی لیکن عکس کو نہیں...... وہ جانتا تھا کہ عکس کا اشارہ کس طرف تھا...... غنی حمید کی طرف...... اور ان تمام مردوں کی طرف جنہیں ماضی میں وقتاً فوقتاً عکس شادی کی امید سے [illegible] کرتی رہی اور شیر دل ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی چیز ان لوگوں کے حوالے سے اس کے سامنے نوٹس کرتا رہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں آجاتی۔ شیر دل جیسے فیملی بیک گراؤنڈ اور پہنچ کے ساتھ کسی کا کچا چٹھا

نکال کر پیش کر دینا دومنٹ کا کام تھا لیکن ان دومنٹوں کی محنت کا نتیجہ عکس کے کئی ہفتوں کے خوابوں کا دھڑن تختہ کر دیتے تھے۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ شیر دل کی معلومات اسے بہت سارے غلط فیصلوں اور غلط انتخاب سے بچاتی رہی تھیں، وہ کم از کم اس ایشو پر شیر دل کی اس پرواکیٹو سروس سے خوش نہیں تھی۔

''وہ تو میں تب کروں گا نا جب تم مجھے اس لڑکے اور اس کے والد صاحب کے نام بتانے کی زحمت بھی کرو گی۔'' شیر دل نے بڑے اطمینان سے اس سے کہا۔ یوں جیسے عکس خود اسے اپنی مدد کے لیے کہہ رہی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر کے لیے دیکھتے رہے پھر عکس نے کہا۔

''احسان ملہی کا بیٹا ہے...... جواد ملہی۔'' شیر دل نے فوری طور پر ردعمل نہیں دیا۔ عکس کچھ دیر جیسے اس کے ردعمل کی منتظر رہی۔

''تم کچھ نہیں کہو گے اس کے بارے میں؟'' اس نے بالآخر شیر دل سے خود پوچھا۔

''تم اسے پسند کرتی ہو؟'' شیر دل نے غیر متوقع سوال کیا۔

''نہیں، میں نے اسے بھائی بنایا ہوا ہے۔''

''نہیں، بھائی تو تم نے مجھے بنایا ہوا ہے۔'' اس کی بے حد سنجیدگی سے کہی ہوئی بات پر عکس کو بری طرح ہنسی آئی۔ وہ اس کے اس طنز کا Context بھی سمجھ گئی تھی۔

''وہ اچھا ہے...... پولیٹیکل بیک گراؤنڈ کے باوجود بہت سوبر اور ڈیسنٹ ہے......'' عکس نے شیر دل کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پہلے سوال کا جواب دیا۔

''لاہور کے چھچھورے ترین خاندانوں میں سے ایک یہ خاندان بھی ہے...... If I remember correctly تو جواد ملہی احسان ملہی کی دوسری بیوی سے ہے...... ایک ہی بیٹا ہے اس کا دوسری بیوی سے...... پہلی بیوی سے شاید چار پانچ بیٹے ہیں۔'' شیر دل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اسے احسان ملہی کے خاندان کا تعارف دیا۔ عکس کو حیرت نہیں ہوئی۔ لاہور کی کوئی ایسی نامور فیملی نہیں تھی جس سے شیر دل واقف نہیں تھا اور یہ کوئی ایسی حیرانی والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اور اس کی فیملی جس سوشل سرکل میں موو کرتے ہیں وہاں ہر ایک کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی کے حوالے سے جانتا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے انکشافات سنتی رہی۔

''ڈاکٹریٹ تو کر لیا اس نے...... اب آگے کیا کر رہا ہے یہ؟ امریکا میں سیٹل ہو گا کیا......؟'' شیر دل نے بات کرتے کرتے اچانک اس سے پوچھا۔

''نہیں یہاں فیملی بزنس ہے، اسی کو سنبھالے گا۔'' عکس نے بتایا۔

''اور ملہی فیملی کے بزنس کے حوالے سے آپس میں ہی بہت سارے جھگڑے چل رہے ہیں...... میں اس حوالے سے زیادہ نہیں جانتا لیکن تم چاہو تو پتا کر کے بتا سکتا ہوں۔'' شیر دل نے کہا۔

تھینک یو ویری مچ...... میرا نہیں خیال اس کی ضرورت ہے۔'' عکس نے بے حد سنجیدگی سے اس کی آفر ٹھکرائی۔ شیر دل مسکرایا۔

''ویسے تمہارا خیال ہے کہ تم کسی پولیٹیکل فیملی میں ایڈجسٹ کر لو گی؟'' I don't think so'' شیر دل نے اپنے سوال کا جواب اس کے منہ کھولنے سے پہلے خود ہی دے دیا۔

''جواد بہت اچھا لڑکا ہے۔'' عکس نے بے اختیار اس کا دفاع کیا۔ میری اور اس کی بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے، مجھے نہیں لگتا زیادہ مسئلہ ہو گا۔''

''مجھے یقین ہے وہ بہت اچھا ہو گا لیکن تم پھر بھی بہت جلدی مت کرو...... تھوڑا سوچ لو۔'' شیر دل نے سنجیدگی سے کہا۔

''دو سال سے سوچ رہی ہوں۔'' عکس نے بے اختیار کہا۔

''اوہ تو دو سال سے اس لیے مجھ سے ہر طرح کا رابطہ ختم کر کے بیٹھی ہوئی تھیں۔'' شیر دل نے عجیب جتانے والے انداز میں کہا۔

''بزی تھی بہت۔'' عکس نے اسے دیکھے بغیر کہا۔

''Obviously...... وہ تو میں جان ہی گیا ہوں کہ اسٹڈیز کے علاوہ کس چیز نے تمہیں وہاں مصروف رکھا ہے۔'' شیر دل طنز کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ عکس نے ایک بار پھر بڑے تحمل سے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''واٹر سپلائی پروجیکٹ کی فزیبلٹی رپورٹ ذرا شیئر کر لینا مجھ سے۔'' اس نے بات کا موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی اور شیر دل نے اس کی اس کوشش کو کامیاب ہونے دیا۔ وہ دونوں اب اپنے پروفیشنل معاملات ڈسکس کرنے لگے۔

☆☆☆

باربی ڈول اپنے باپ کی گود میں چڑھی اسے مسلسل اس فنکشن کی تفصیلات سنانے میں لگی ہوئی تھی جو وہ فیملی کے ساتھ ویک اینڈ پر اٹینڈ کر کے آئی تھی۔ اس کا باپ مسلسل ہوں، ہاں کے ساتھ اس کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا لیکن وہ باربی ڈول سے ہمیشہ کی طرح وہ سب نہیں پوچھ رہا تھا جو وہ پوچھتا تھا۔ باربی ڈول نے اس کی الجھن بھری خاموشی نوٹس نہیں کی تھی، یہ اس کی بیوی نے کی تھی اور رات سونے سے پہلے اس نے اپنے شوہر سے اس کے رویے کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی۔ ''تم کچھ پریشان ہو؟'' وہ اس کے سوال پر ایک کتاب پڑھتے پڑھتے چونک گیا۔

''نہیں تو...... کیوں؟''

''بس ایسے ہی...... تم بہت پریشان اور الجھے ہوئے لگ رہے ہو جب سے میں واپس آئی ہوں۔''

''وہم ہے تمہارا۔'' اس کے شوہر نے بے ساختہ کہا اور دوبارہ کتاب پڑھنے لگا۔

''نہیں کچھ نہ کچھ تو ہے...... تم شیئر نہیں کرنا چاہتے تو اور بات ہے۔'' اس نے شوہر کے جواب کو قبول نہیں کیا تھا۔

''یار بس آفس کے کچھ پرابلمز کی وجہ سے ٹینس ہوں شاید اس لیے ایسا لگ رہا ہے تمہیں۔'' اس نے اس بار مسکرا کر اپنی بیوی کو وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''آفس تو ہمیشہ ٹینشن کا باعث ہے تمہارے لیے...... پھر اب کیا ہو گیا؟ اس کی بیوی نے اس کے پاس لیٹتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کام بہت ہے آج کل آفس میں۔'' اس نے بیوی کو ایک گہرا سانس لے کر دیکھا۔

"اتنا کام ہو گیا کہ تمہارے پاس میرے یا اپنی بیٹی سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں رہا۔" اس کی بیوی نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس ہی تو ہوتا ہوں ہر وقت...... جیسے ابھی۔" اس نے جیسے اپنی بیوی کی تشویش کم کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہو تو تم پاس ہی لیکن پتا نہیں کہاں پہنچے ہوئے ہو، پچھلے چند دنوں سے۔" اس بار اس کے شوہر نے کتاب کو دوبارہ کھول لیا۔ وہ جیسے اس سے اور اس ٹاپک سے مکمل طور پر بچنا چاہتا تھا۔

"اور یہ خیر دین کہاں چلا گیا ہے؟" شوہر سے بات کرتے کرتے اسے یک دم گھر کا سب سے اہم ایشو یاد آیا۔ کتاب پر اس کے شوہر کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔

"خیر دین کو نکال دیا ہے میں نے۔" ایک صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے بیوی کو دیکھے بغیر کہا۔ بعض باتوں پر کسی سے بھی نظریں ملانا مشکل ہو جاتا ہے خاص طور پر اس شخص سے جو آپ کی زندگی کا ساتھی ہو، آپ سے اندھی محبت کرتا ہو اور آپ کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہہ کر یقین کرنے کا عادی ہو۔

"نکال دیا؟" وہ بری طرح چونکی۔ "کیوں؟" خیر دین جیسے خانساماں کو ملازمت سے نکال دینا اور وہ بھی اس طرح اچانک کسی وارننگ کے یا اس کو بتائے بغیر...... وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔ وہ آج تک جہاں جہاں پوسٹڈ رہے تھے اور جن جن ملازمین سے ان کا واسطہ پڑتا رہا تھا ان میں خیر دین بلاشبہ سب سے بہترین تھا اور اس حقیقت کو انہوں نے پہلے چند دنوں میں ہی تسلیم کر لیا تھا۔

"چوری کی تھی اس نے۔" اس کے شوہر نے کتاب کا ایک اور صفحہ پلٹا۔ وہ اب بھی اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔

"خیر دین نے؟" اس کو جیسے شوہر کی بات پر کرنٹ لگ گیا۔

"ہاں......"

"کیا چرایا تھا اس نے؟" وہ اب بھی یقین نہیں کر پا رہی تھی۔

"چرا لیتا اگر میں اچانک بیڈ روم میں نہ آ جاتا...... تمہاری جیولری نکال کر بیٹھا ہوا تھا۔" کتاب کے صفحے اب بہت رفتار سے پڑھے جا رہے تھے۔

وہ بے یقینی سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بھی اس نے بہت بری طرح سے خیر دین کے لیے بیوی کی زبان سے لعنت و ملامت سننے کی خواہش کی تھی، یہ جیسے ایک تصدیق ہوتی کہ اس کی بیوی نے اس کی بات کا ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یقین کر لیا ہے مگر بیوی خاموش تھی اور جب وہ اگلے کئی منٹ تک خاموش ہی رہی تو اسے کتاب سے نظریں ہٹانی پڑیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"Impossible۔" وہ کم از کم یہ لفظ اپنی بیوی کے منہ سے سننے کا خواہش مند نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بے ساختہ گردن نفی میں ہلا رہی تھی۔

"Impossible والی کیا بات ہے اس میں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ تند و تیز ہو گیا۔ "نوکر تو نوکر ہوتے ہیں...... کبھی بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں...... ہم ان پر اعتماد تو نہیں کر سکتے...... چاہے وہ کتنے بھی اچھے کیوں نہ ہوں۔" وہ خیر دین کے لیے بیوی کی پسندیدگی سے واقف تھا۔ "مجھے بھی تمہاری ہی طرح شاک لگا تھا لیکن میں اگر اچانک بیڈ روم میں نہ آ جاتا تو تمہاری جیولری غائب ہو چکی ہوتی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میری تھوڑی بہت رقم اِدھر سے اُدھر ہوتی رہی...... میں نے تم سے ذکر نہیں کیا لیکن میں محتاط ہو گیا تھا بہت۔ خیر دین تو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ تم لوگ گھر میں نہیں ہو...... میں رات گئے اسٹڈی میں بیٹھا رہتا ہوں تو وہ بڑے اطمینان سے جیولری کا صفایا کر دے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" اس نے اتنی لمبی بات کیوں کی تھی اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید یہ اس کی بیوی کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے جن کو ختم کرنے کی ایک desperate کوشش تھی جو وہ کر رہا تھا یا پھر یہ اس کی اپنی آواز کا کھوکھلا پن تھا جس کی بازگشت سے بچنے کے لیے اسے مسلسل بولنا پڑ رہا تھا۔

وہ بات ختم کر کے چند لمحے بیوی کو دیکھتا رہا پھر جیسے اس نے کچھ بے بس ہو کر کہا۔ "تم اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟...... میں جانتا ہوں خیر دین بہت اچھا کک تھا But you just don't worry...... ایک آدھ ہفتے میں اس سے بھی اچھا کک مل جائے گا ہمیں...... میں نے ایک دو لوگوں کو بتایا ہے تب تک جمشید سے کام چلاؤ......" اس نے کچن میں خیر دین کے مددگار کا نام لیا اور دوبارہ کتاب کھول لی۔

"میری جیولری بیڈ روم میں نہیں تھی۔" وہ چند لمحوں کے لیے ہل نہیں سکا، آئینہ دیکھے بغیر بھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ اس وقت زرد ہو گا۔ سر اٹھا کر اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جس کے چہرے پر بے یقینی اور الجھن اب بھی ویسے کی ویسی تھی۔

"بیڈ روم میں نہیں تھی تو کہاں تھی؟" اس نے خود کو نارمل دکھانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تھی...... میں ساتھ لے کے گئی تھی۔"

اس کا رنگ اب زرد سے یقیناً سفید پڑا ہو گا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہا تھا...... کم از کم یہ جھوٹ بولنے سے پہلے اسے ایک بار الماری میں جیولری کی موجودگی کو ضرور کنفرم کر لینا چاہیے تھا۔

"میرا خیال ہے خیر دین کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تمہیں......" اس نے بالآخر اپنی بیوی کو کہتے سنا۔

"شاید جیولری اسے الماری میں نہیں ملی اسی لیے اتنی دیر لگ گئی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ورنہ وہ تو میرے آنے سے بہت پہلے تمہاری جیولری نکال کر غائب ہو جاتا۔" وہ اپنی بیوی کو یہ موقع نہیں دے سکتا تھا کہ وہ خیر دین کو بے گناہ سمجھے۔

"میں کمرے میں آیا تو وہ الماری اور دراز کھولے کھڑا تھا۔ میں تو یہی سمجھا کہ تمہاری جیولری نکال رہا ہے، یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ وہاں تھی ہی نہیں تم ساتھ لے گئیں......" بات کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ایک بار پھر اسے بے یقینی کے انہی تاثرات کے ساتھ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی، اب کیا تھا؟ اس نے جیسے کراہتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔ وہ اتنا برا جھوٹ بولنے والا تو نہیں تھا کہ وہ اس پر یقین ہی نہ کر پاتی۔

"الماری اور دراز کی چابیاں تو میرے پاس تھیں...... خیر دین نے انہیں کیسے کھول لیا؟" چند لمحوں کے لیے اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے چہرے کا رنگ اب کیسا ہو گیا ہو گا یا کوئی رنگ اب رہا ہی نہیں تھا۔

اس نے اپنے آپ کو پھر کوسا۔ وہ DMG کے قابل ترین آفیسرز میں سے تھا اور اس نے خیر دین کے

خلاف چارج شیٹ تیار کرتے ہوئے اپنی تقریباً ڈیڑھ سال کی ٹریننگ کے تقریباً ہر اصول کو نظر انداز کیا تھا۔ ”جھوٹ کو دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ پیش کریں۔“ اسے اکیڈمی میں وہ مزاحیہ ڈیبیٹ یاد آئی جو اس نے جیتی تھی...... سچا جھوٹ بولنے کے سو کارآمد طریقے...... ہر خیالی پلاؤ پر ڈالنے کے لیے اصلی قورمہ تیار کریں۔

اسے اکیڈمی کے ایک انسٹرکٹر کا Proverb یاد آیا۔

”یقیناً اس نے بنوالی ہوں گی چابیاں...... یہ کون سا مشکل کام ہے...... یا پھر کسی اور چابی سے کھول لی ہوگی...... کوئی پہلی بار تو چوری نہیں کر رہا ہوگا وہ کہ بغیر تیاری کے کرے گا۔“ کتاب کے صفحے ایک بار پھر برق رفتاری سے پلٹنے جانے لگے...... اس کی بیوی نے اس کی اس بات کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا اور اس کی اس خاموشی نے جیسے اس کی جان حلق میں اٹکا دی تھی۔ ان کی شادی کے تمام سالوں میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی نے کبھی اس کے ساتھ اس طرح کے معاملات پر سوال جواب کیے ہوں، وہ اپنے شوہر کی رائے اور ہر بات کو جوں کا توں قبول کرنے کی عادی تھی۔ یہ اپنے شوہر پر اندھا اعتماد کی سنہری مثال تھی اور ایسا اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی کسی بات پر یقین کرنے میں وہ جذبات اثر انداز نہ ہوتے۔

”میں سونے جا رہا ہوں...... بہت تھک گیا ہوں......“ اس نے اپنی بیوی کی خاموشی سے جیسے کچھ خائف ہوتے ہوئے وہاں سے اٹھنے میں عافیت سمجھی۔ پتا نہیں اس کی خاموشی میں اب مزید کون سا سوال یا اعتراض چھپا ہوتا جو اسے لاجواب اور جھوٹا ثابت کر دیتا۔

اور اس کا یہ اندازہ اور خدشہ ٹھیک تھا۔ شوہر کے بستر پر جا کر لیٹنے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کے جہیز کی لکڑی کی الماری تھی جس کی ایک دراز میں وہ جیولری رکھتی تھی۔ الماری کا ایک حصہ وارڈ روب پر مشتمل تھا مگر وہاں پر بہت قیمتی کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ایسے ملبوسات جو وہ عام طور پر بہت بڑے لیول کے فیملی یا دوسرے فنکشنز میں استعمال کرتی تھی۔ ان کے اپنے بیڈ روم میں پرانے زمانے کی طرز کی ایک وارڈ روب دیوار میں موجود تھی اور اس کے اور شوہر کے روزمرہ کے ملبوسات اسی میں ہوتے تھے اور وہ وارڈ روب کھلی رہتی تھی۔ خیر دین خود ہی اس وارڈ روب میں اس کے اور اس کے شوہر کے ملبوسات پریس کرنے کے بعد لٹکا دیتا تھا...... اور ایسا کئی بار اس کی عدم موجودگی میں بھی ہوتا تھا اور وہ وارڈ روب خیر دین کے لیے ممنوعہ چیز نہیں تھی...... لیکن اس کا شوہر یہ کہہ رہا تھا کہ خیر دین وہ الماری کھولے کھڑا تھا جس میں اس کی جیولری تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ویک اینڈ شہر سے باہر گزارنے کے بعد واپس آنے پر اس نے اپنی الماری اور دراز کو اسی طرح لاکڈ پایا تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اگر خیر دین نے انہیں توڑ پھوڑ کر کھولا تھا تو وہ اسے کھلے ہی ملنے چاہیے تھے اور اگر وہ کسی چابی سے کھولے گئے تھے تو خیر دین کے کھلی الماری اور دراز کے پاس پکڑے جانے کی صورت میں اسے انہیں دوبارہ لاک کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس صورت میں بھی اس کی الماری کو کھلا ہونا چاہیے تھا...... اور اگر انہیں بعد میں اس کے شوہر نے لاک کیا تھا تو پھر اس کے شوہر کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ شاید اس نے چابیاں بنوالی ہوں گی اور ان کے ساتھ کھولا ہوگا۔

اس کے شوہر کے بیان میں تضادات تھے لیکن اس کے لیے یہ بات پریشان کن نہیں تھی۔ پریشانی اسے

اپنے شوہر کے گھبرانے سے ہو رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر کو کنفیوژڈ دیکھا تھا۔ اس کا شوہر اگر اسے جھوٹ کے اس پلندے کے بغیر سیدھا سیدھا کوئی وجہ بتائے بغیر یہ کہہ دیتا کہ اس نے خیر دین کو نوکری سے نکال دیا ہے تو اسے شاید اس طرح کی عجیب فیلنگز کا احساس نہ ہوتا جو اَب ہو رہا تھا۔ کچھ غلط تھا...... مگر کہاں......؟ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ مسئلہ اس کے شوہر کی سائیڈ پر تھا خیر دین کی سائیڈ پر نہیں...... اور عقل یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جو کچھ اس کا شوہر کہہ رہا تھا وہ ٹھیک تھا۔ وہ رات گئے تک بے مقصد بیٹھی رہی تھی پھر سونے سے پہلے اس نے پتا نہیں کیا خیال آنے پر ایک بار اٹھ کر الماری اور دراز چیک کیے جن کے حوالے سے اس کے شوہر نے خیر دین پر اتنے سنگین الزامات لگائے تھے۔ وہاں کسی لاک کو زبردستی کھولنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دراز میں اس کی چیزیں جوں کی توں موجود تھیں جس طرح اور جس ترتیب سے وہ رکھا کرتی تھی۔

اس رات اسے نیند مشکل سے آئی تھی۔ اگلی صبح اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان خیر دین کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا لیکن شوہر کے گھر سے جانے کے بعد اس نے جمشید سے خیر دین کے بارے میں سوال کیا اور اس وقت اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ گھر کے تمام ملازم کچھ عجیب سے طریقے سے ری ایکٹ کر رہے تھے۔ خیر دین کے نام پر وہ سب جیسے گونگے ہو جاتے تھے یا ان کے چہروں پر عجیب سی ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ جمشید وہ پہلا ملازم تھا جس سے اس نے خیر دین کے بارے میں پوچھا تھا۔ جواَب عجیب رٹے رٹائے انداز میں ملا تھا۔

”وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔“ جواب اس سے مختلف تھا جو اس کے شوہر نے دیا تھا۔ وہ کھٹکی لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔

”کہاں چلا گیا؟“

”گاؤں۔“ جمشید اس سے نظریں ملائے بغیر میکانیکی انداز میں بول رہا تھا یوں جیسے وہ کوئی روبوٹ تھا اور پھر اگلے دو تین دن میں اس نے خیر دین کے نام پر گھر کے تمام ملازموں کو روبوٹ بنتے دیکھا تھا۔ وہ الجھنے اور چڑنے لگی تھی ان کے اس ایک جیسے ردِ عمل سے۔ وہ جیسے کسی تھیٹر کے ایکسٹراز تھے جو اپنی لائنز کو بے حد ناقص اور بھونڈے انداز میں ادا کر کے اپنے رول کو مضحکہ خیز بناتے ہوئے audience سے نوٹس ہو رہے تھے۔ داد تو قیر کیا لیتے...... وہ ہوٹنگ کے مستحق بھی نہیں ہو پا رہے تھے۔

وہ چند دن سے زیادہ خیر دین کا معما سمجھنے کی کوشش نہیں کر سکی۔ اس کی نند اپنے بچوں کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہی تھی اور اس کا بیٹا ایبک پچھلے کئی دن سے بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ اگلے چند دن ایبک کو ہاسپٹلائز کرنا پڑا اور خیر دین کی پُراسرار گمشدگی بڑے آرام سے پسِ پشت چلی گئی۔ ایبک اس کے شوہر کو بہت عزیز تھا یہ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایبک کی بیماری اس کے شوہر کو اس طرح اپ سیٹ کرے گی۔ اس نے اپنے شوہر کو اپنی بیٹی کی چھوٹی موٹی بیماریوں پر اس طرح پریشان دیکھا تھا یا وہ اب اسے ایبک کی بیماری پر پریشان دیکھ رہی تھی۔ ایبک بیماری کے دوران بے حد چڑچڑا ہو گیا تھا خاص طور پر اسے شیردل کے ساتھ ایبک کے رویے کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے انکل کو دیکھتے ہی بے وجہ ضد کرتا، بدتمیزی کرتا یا رونے لگتا اور اس کا شوہر جیسے اسے بہلانے کی ہر کوشش میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ وہ شاندار

چھٹیاں جو شروع میں اس کے لیے بے حد خوشگوار اور یادگار تھیں اب آخری دنوں میں ایبک کی بیماری اور اس کے روتیے کی وجہ سے جیسے مستقل ٹینشن کا ایک ذریعہ بن گئی تھیں۔ اس کی نند کے پاس اب اس کے ساتھ آؤٹنگ یا شاپنگ کا ٹائم نہیں تھا۔ اس کی مکمل توجہ اپنے بیٹے کی صحت یابی کی طرف تھی اور انہی حالات میں جب اسپتال میں ایبک کی حالت کچھ بہتر ہونے پر اس کی نند نے واپس لاہور جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے جیسے سکون کی سانس لی۔ نند اور اس کی فیملی کے ساتھ بے حد دوستی ہونے کے باوجود وہ اب گھر میں ہونے والی اس مستقل تیمارداری سے بیزار ہونے لگی تھی جو گھر آنے کے بعد اس کے شوہر کا بچا کھچا وقت بھی لے لیتی تھی۔

انہی دنوں میں باربی ڈول نے چند بار اس سے چڑیا کا پوچھا۔ وہ اتنے دن سے چڑیا کو کہیں نہ دیکھنے پر جیسے کچھ تجسس کا شکار تھی۔ اصل تشویش شاید اسے لالی پاپس اور کینڈیز کی اس سپلائی کے بند ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی جو پہلے چڑیا کی وجہ سے باقاعدگی سے جاری تھی۔

چڑیا یہاں سے چلی گئی ہے۔'' اس نے باربی ڈول کے استفسار پر اسے بتایا۔

''کہاں چلی گئی ہے؟'' باربی ڈول بری طرح حیران ہوئی تھی۔ اسے یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ چڑیا اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور کیسے چلی گئی تھی۔

''وہ اپنے نانا کے ساتھ اپنے گاؤں چلی گئی۔'' اس نے باربی ڈول کے سوالوں کے جواب میں مختصراً کہا۔

''کیوں؟'' باربی ڈول پریشان ہوئی۔

''وہاں ان کا گھر ہے...... وہ اب وہاں رہیں گے۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''ہمارے جتنا بڑا گھر ہے؟'' باربی ڈول نے کچھ دیر خاموش رہ کر جیسے کچھ بے قراری کے عالم میں ماں سے کہا۔

''شاید......'' ماں نے کچھ گول مول سا جواب دیا۔

''اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی؟'' باربی ڈول نے ایک بار پھر سے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اس بار اس نے دوٹوک جواب دیا۔

''اور اسکول بھی نہیں؟'' باربی ڈول کو مزید تشویش ہوئی۔

''اسکول تو آئے شاید۔'' اس نے چند لمحے سوچ کر باربی ڈول کو تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

''اوکے...... باربی ڈول بے ساختہ مطمئن ہوئی۔ یعنی چڑیا سے ملاقات کے امکانات ابھی باقی تھے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کے بعد باربی ڈول نے اسکول جانا دوبارہ شروع کیا۔ چڑیا سے دوبارہ ملاقات کی خواہش جیسے اسکول جانے میں اس کی بنیادی دلچسپی کی وجہ بن گئی تھی۔ پہلے دن اسکول میں وہ متلاشی نظروں سے بریک ٹائم میں چڑیا کو ڈھونڈتی رہی، اس سے پہلے پورا دن ہر بار کلاس روم کے دروازے کے سامنے سے کسی کے گزرنے پر وہ بے اختیار دروازے کو اس مسکراتے ہوئے چہرے کے نظر آنے کی امید میں دیکھتی رہی تھی۔ وہ بہت اداس پہلے دن اسکول سے واپس آئی تھی۔ اگلے دو دن چڑیا کا انتظار کرنے کے بعد وہ چوتھے دن خود چڑیا کی کلاس میں چلی گئی تھی۔

''وہ تو اسکول ہی نہیں آرہی۔'' اس کی ایک فرینڈ نے باربی ڈول کو دیکھنے پر اسے بتایا اور ساتھ ہی اس سے پوچھا۔ ''وہ بیمار ہے کیا؟''

باربی ڈول کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی فرینڈ کے سوالات کا کیا جواب دے۔ چڑیا تو واقعی اس کے گھر میں تھی، اسے پتا ہونا چاہیے تھا اس کے بارے میں۔

''وہ گاؤں چلی گئی ہے۔'' اس نے سوچ سوچ کر اس کی فرینڈ کو وہ وجہ بتائی جو اس کی ممی نے بتائی تھی اور وہاں سے آگئی۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد چڑیا کی کلاس ٹیچر اس کے پاس آئی تھیں اور انہوں نے ایک وارننگ لیٹر اس کی ڈائری میں چڑیا کو دینے کے لیے اسٹیپل کر دیا تھا۔ وہ ایک ہفتے سے اسکول سے بغیر اطلاع اور بغیر ایپلیکیشن کے غائب تھی۔ کچھ دن اور گزر جاتے تو اسکول سے اس کا نام کاٹ دیا جاتا۔ اسکول کے پاس چڑیا سے رابطے کا واحد ذریعہ باربی ڈول تھی کیونکہ چڑیا اور باربی ڈول کا ہوم ایڈرس ایک ہی تھا۔

چڑیا کی کلاس ٹیچر کو اپنی کلاس کی سب سے برائٹ بچّی کے یوں اچانک غائب ہونے پر بے حد تشویش تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اسکول سے چھٹی نہیں کی تھی...... بغیر اطلاع چھٹی کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ باربی ڈول سے چڑیا کے بارے میں سوالات کرتی رہیں اور اس کے یہ بتانے پر کہ چڑیا گاؤں چلی گئی وہ گاؤں میں اس کا ایڈریس پوچھنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس دن شام کو ہوم ورک کے لیے بیگ کھولتے ہوئے اس کی ممی نے اس کی ڈائری میں چڑیا کو اسکول کی طرف سے ملنے والا وہ وارننگ لیٹر دیکھا جو DC ہاؤس کے پوسٹل ایڈرس پر بھیجا جاتا اگر باربی ڈول خود اسکول نہ جا رہی ہوتی۔ خیر دین کے دیے ہوئے فون نمبر پر رابطہ کرنے پر یقیناً اسکول کلرک کو کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا اور خاطر خواہ جواب ملتا بھی کیسے۔ DC ہاؤس کا آپریٹر چڑیا کے اسکول سے آنے والی ایک کال پر خیر دین کے بارے میں انہیں کتنی تفصیلات دے سکتا تھا۔ خاص طور پر جب گھر کا ہر ملازم اندر کی کہانی سے واقف تھا لیکن خاموش تھا تو آپریٹر کے پاس بھی یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خیر دین جاب چھوڑ گیا تھا۔

وہ بہت دیر تک اس وارننگ لیٹر کے میٹر کو پڑھتی رہی۔ الجھنوں کی اس ڈوری میں ایک گرہ اور لگی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خیر دین کتنے شوق اور محنت سے چڑیا کو پڑھا رہا تھا اور وہ اس بات سے بھی واقف تھی کہ اس کی تعلیم کے اخراجات وہاں سے پوسٹ آؤٹ ہونے والے ایک پرانے آفیسر اور اس کی بیوی اٹھا رہے تھے...... اور وہ اس بات سے بھی آگاہ تھی کہ چڑیا ایک آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ جتنی بار بھی باربی ڈول کے لیے اسکول جا کر سسٹر ایگنس سے ملی تھی ہر بار اس نے ان سے چڑیا کے قصیدے سنے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس بچی کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھنے لگی تھیں۔ کئی بار اندر بیٹھے ہوئے اس نے چڑیا کو لان میں باربی ڈول کے ساتھ نرسری rhymes گاتے ہوئے سنا۔ اس کی آواز اور لب و لہجہ اتنا خوب صورت اور معصوم تھے کہ وہ بہت بار اس کی rhymes سننے بیٹھ جاتی تھی اور باقی رہی سہی کسر باربی ڈول کے سنائے ہوئے قصوں نے پوری کر دی تھی۔ ایبک کی ماں کے برعکس چڑیا کے بارے میں یہ سب کچھ جان لینے کے بعد اس نے باربی ڈول کو کبھی اس کے ساتھ کھیلنے سے روکا نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ

وہ بچی خود ہی ان لوگوں کے سامنے باربی ڈول یا دوسرے بچوں کے قریب آنے سے اجتناب کرتی تھی اور اب بیٹھے بٹھائے اس بچی کا اس طرح غائب ہو جانا اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔

''خیر دین کی نواسی نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے کیا؟'' آدھے گھنٹے بعد اپنے شوہر کے گھر آنے پر اس نے چڑیا کے وارننگ لیٹر کا تذکرہ اس کے سامنے چھیڑا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے ہی شام کی چائے پینے کے لیے بیٹھے تھے۔ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بری طرح بدکا۔

''خیر دین کی نواسی کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟'' وہ اپنے شوہر کے جواب پر جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ یقیناً وہ اپنے سوال کے جواب میں اپنے شوہر کے منہ سے یہ جواب سننے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ کا اس سے کوئی تعلق ہے...... میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ اسکول نہیں جا رہی۔'' اس نے دوبارہ اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا لیکن اس بار اس نے سوال کو اطلاع بنا کر پیش کیا تھا۔

''اس کا اسکول جانا نہ جانا ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس بار اس کے شوہر نے کچھ بہتر جواب دیا تھا۔

''چڑیا کی کلاس ٹیچر نے اس کا وارننگ لیٹر ہماری بیٹی کو دیا ہے۔'' سرسری انداز میں یہ اطلاع اپنے شوہر کو دیتے ہوئے اگر اسے اپنے شوہر کے ردِعمل کا اندازہ ہوتا تو وہ شاید ایسی اطلاع اسے دیتے ہوئے سو بار سوچتی۔

''کیا مطلب؟ انہوں نے اس کا وارننگ لیٹر میری بیٹی کے ذریعے بھجوایا ہے۔'' اس کے شوہر نے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔ ''how dare they...... انہیں ایک آفیسر اور نوکر کے بچے میں کوئی فرق نظر نہیں آیا...... ان کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ وہ میری بیٹی سے آکر ایک نوکر کی بچی کے حوالے سے بات بھی کرتے۔'' اس نے زندگی میں اپنے شوہر کو کبھی اس طرح اتنی معمولی سی بات پر اتنا غضبناک نہیں دیکھا تھا۔

''وہ ہمارے سرونٹ کوارٹرز میں رہ رہی ہے تو شاید اس لیے انہوں نے پوچھ لیا...... یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے......'' اس نے بے حد حیرانی کے عالم میں اپنے شوہر کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ شیر دل نے چند منٹوں کے اندر آپریٹر سے باربی ڈول کے اسکول کی پرنسپل سے بات کروانے کا کہا تھا۔

''تم اوور ری ایکٹ کر رہے ہو۔'' اس نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''میں اوور ری ایکٹ کر رہا ہوں......؟'' وہ اس پر الٹ پڑا تھا۔

''میں اسے اس لیے شہر کے مہنگے ترین اسکول میں پڑھا رہا ہوں کہ وہ نوکروں کے بچوں کے لیے میسنجر کا کام کرے...... وہ اتنی فیس لیتے ہیں انہوں نے ڈائریکٹ خیر دین کو اپروچ کیوں نہیں کیا...... اس کے پوسٹل ایڈریس پر ڈائریکٹ کانٹیکٹ کرتے، میری بیٹی سے انہوں نے اس طرح کا کام کیوں کروایا۔'' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ غصے میں اس طرح آؤٹ آف کنٹرول کیوں ہو رہا تھا...... کیا یہ کسی اور مسئلے کی وجہ سے تھا......؟ کسی آفس کی ٹینشن کی وجہ سے......؟ یا پھر وہ مسئلہ واقعی اتنا بڑا تھا کہ اس پر اس طرح ہنگامہ کیا جاتا۔ وہ جس وقت فون پر سسٹر ایگنس کے ساتھ بدزبانی کر رہا تھا وہ اس وقت بھی اسے اسی طرح بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اگر اسے یہ پتا ہوتا کہ وہ اسکول کی پرنسپل سے اس طرح بات کرنے والا تھا تو وہ اسے کبھی ان سے بات کرنے نہ دیتی۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ سسٹر ایگنس نے اسے جواباً کیا کہا تھا لیکن اسے اس کی گفتگو سے یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کے انداز گفتگو کو بے حد ناپسند کر رہی تھیں اور انہوں نے ایک پوائنٹ پر آکر کال بند کر دی تھی۔ اس کے شوہر کی انا پر یہ جیسے ایک اور کاری ضرب تھی وہ اس شہر کا ڈپٹی کمشنر تھا...... جس کا مطلب اس معاشرے میں بادشاہ کا ہوتا تھا اور ایک معمولی نن نے DC کی کال ڈسکنیکٹ کرنے کی جرات دکھائی تھی...... یہ بے عزتی سی بے عزتی تھی۔ وہ بار بار آپریٹر کو دوبارہ کال ملانے کے لیے کہتا رہا اور آپریٹر اسے بار بار یہ اطلاع دیتا رہا کہ کانوینٹ کے رہائشی حصے سے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی جا رہی اور اس تمام عرصے کے درمیان وہ بار بار اپنے شوہر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اسی طرح غضبناک رہا تھا اور اس کا یہ رویہ اس کے لیے شرمندگی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ جس بیک گراؤنڈ سے تھی وہاں استاد اور تعلیم و تدریس سے متعلقہ لوگوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی خود اس نے اپنے شوہر اور اس کی فیملی کو اس حوالے سے بے حد تمیز و تہذیب والا پایا تھا اور اب ایک چھوٹی سی بات پر وہ جیسے ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ اس سارے argument کے بعد چائے اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس کی بیوی ایک عجیب مخمصے کا شکار وہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔

رات تک وہ نارمل ہو چکا تھا اور اس نے دوبارہ فی الحال اپنے شوہر کے ساتھ یہ معاملہ ڈسکس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ خیر دین اور اس سے متعلقہ ہر چیز سے فی الحال بری طرح چڑا ہوا تھا اور اس کے بات کرنے پر پھر اوور ری ایکٹ کر سکتا تھا۔

''پاپا اسکول آئے تھے......'' باربی ڈول نے اگلی شام ہوم ورک کرتے ہوئے ماں کو اطلاع دی...... وہ بری طرح چونک گئی۔

''اسکول آئے تھے...... پاپا؟'' وہ بری طرح حیران ہوئی تھی۔ اس کا شوہر کم از کم صبح ناشتے کی ٹیبل پر ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کر کے گیا تھا۔

''Yes'' باربی ڈول کلرنگ بک میں کلر کرنے میں مصروف رہی۔

''تم اسکول گئے تھے؟'' وہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے شوہر کے گھر آتے ہی اس سے کسی مسئلے پر

باز پرس شروع کر دی تھی۔

"ہاں......" وہ ٹھٹکا اور پھر اس نے بغیر کسی تامل کے کہا۔

"کس لیے؟" وہ بے حد سنجیدگی سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی جو اپنی ٹائی اتارنے کے بعد اب کوٹ اتار رہا تھا۔

"مسٹر سے بات کرنی تھی مجھے۔" اس نے مختصراً کہا۔

"چڑیا کے بارے میں؟ اس نے بے اختیار کہا۔ وہ بری طرح جھنجلایا۔

"تمہارے لیے کیوں ضروری ہے کہ تم ہر بات پر مجھ سے انٹیروگیٹ کرو؟" وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اس طرح بات کر رہا تھا۔ ان دونوں کی لو میرج ایک مثالی شادی سمجھی جاتی تھی اور ان کا کپل ایک آئیڈیل کپل...... وہ دیوانہ وار ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے تھے...... اور اس رشتے میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے ایک سوال پر وہ اسے اس طرح کی بات کہتا جس طرح کی بات اس نے ابھی کہی تھی۔

"میں ایک سوال کر رہی ہوں...... انٹیروگیٹ کیوں کروں گی؟" اس نے جواباً جز بز ہوتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔

"تم سوال بھی مت کرو۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم مسٹر ایکنس سے کوئی جھگڑا تو نہیں کر کے آئے؟" اس نے اس کی بات پر Argue کرنے کے بجائے اس سے اس بات کے بارے میں پوچھا جس کے حوالے سے اسے تشویش تھی۔

"نہیں۔" اس نے آنکھیں ملائے بغیر اپنی بیوی سے جھوٹ بولا۔ اس سے سچ بولنے کا مطلب گھر میں ایک نئے جھگڑے کا آغاز تھا۔

"Thank God میں سوچ رہی تھی تم مسٹر ایکنس کے ساتھ جھگڑا کرنے گئے تھے۔"

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"ہاں لیکن تم بعض دفعہ بہت عجیب سی ایکٹ کرتے ہو۔" وہ چند لمحے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا پھر وہ بے حد خاموشی سے واش روم چلا گیا۔

باربی ڈول آہستہ آہستہ چڑیا کو بھولتی گئی تھی۔ اس کے باپ کے اسکول کے چکر کے بعد دوبارہ کبھی کسی نے باربی ڈول سے چڑیا کا ذکر نہیں کیا تھا...... صرف چڑیا کی کچھ فرینڈز تھیں جو باربی ڈول سے وقتاً فوقتاً چڑیا کے بارے میں پوچھتی رہتیں...... لیکن آہستہ آہستہ ان کے سوال بھی ختم ہوتے گئے تھے۔ چڑیا بہت خاموشی سے ان سب کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

عکس اور شیر دل کا اکیڈمی میں پہلا آمنا سامنا ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ عکس لائبریری میں کوئی کتاب ایشو کروانے کے لیے کھڑی تھی اور شیر دل کوئی کتاب واپس کروانے کے لیے کچھ دیر پہلے ہی لائبریری آیا تھا۔ لائبریرین کا ڈیسک خالی تھا۔

"ہیلو۔" شیر دل نے عکس کے ساتھ رسمی ہیلو ہائے کا تبادلہ کیا جو اُن کے درمیان اب تک ہونے والی واحد گفتگو رہی تھی۔ اور پھر وہ خاموشی سے خود بھی لائبریرین کے انتظار میں ڈیسک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ پہلا موقع تھا جب وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے اور دونوں کو ہی بہت جلدی تھی ورنہ شاید وہ دونوں وہاں کھڑے لائبریرین کا انتظار کرنے کے بجائے لائبریری میں گھوم پھر کر کوئی اور کتاب دیکھ لیتے۔

تقریباً پانچ منٹ ایک دوسرے کے برابر بے وقوفوں کی طرح کھڑے رہنے کے بعد شیر دل نے بالآخر عکس کی طرف مڑ کر کہا۔

"یہ ڈیسک کب سے خالی ہے؟" عکس اس کے سوال پر چونکی۔

"آ...... جب سے میں یہاں کھڑی ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے ہڑبڑائی اور پھر شیر دل نے کہا۔

"اور آپ یہاں کب سے کھڑی ہیں؟" وہ پہلا موقع تھا جب شیر دل کو اتنے قریب سے عکس مراد علی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی اسکن انفیکشن ختم ہو چکی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شیر دل کو اندازہ ہوا کہ وہ اتنی ان اٹریکٹو نہیں تھی جتنا وہ اسے سمجھ رہا تھا۔

"آپ کے آنے سے چند منٹ پہلے ہی آ کر کھڑی ہوئی ہوں میں۔" عکس نے کہا۔

"بہت زیادتی ہے یہ تو پندرہ منٹ ہو گئے ہیں۔" شیر دل نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں؟ لائبریری کا سارا اسٹاف ہی غائب ہو گیا ہے۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آپ نے کتاب ریٹرن کروانی ہے؟" عکس نے اس سے کہا۔

"ہاں...... اور صرف اتنے سے کام کے لیے بھی آدھا گھنٹا ہو گیا ہے مجھے۔" شیر دل نے اسے جواب دیا۔ عکس نے مسکراتے ہوئے ان ساتھ منٹوں کو پہلے پندرہ اور اب آدھے گھنٹے میں تبدیل ہوتے سنا۔

"آپ مجھے دے دیں کتاب...... میں ریٹرن کروا دوں گی جب اسٹاف میں سے کوئی آئے گا۔" شیر دل نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بڑے شستہ انداز میں اسے آفر کر رہی تھی، ایک غیر متوقع آفر۔ وہ چند لمحوں کے لیے حیران ہوا پھر اس نے کہا۔

"تھینک یو...... آپ کو جلدی نہیں ہے کیا؟"

"بہت زیادہ جلدی نہیں ہے۔" وہ مسکرائی تھی، وہ بھی مسکرا دیا۔ برف پگھلنے لگی تھی۔ شیر دل نے اپنی کتاب اس کے پاس کاؤنٹر پر چھوڑ دی اور خود وہاں سے چلا گیا۔

عکس سے اس کی دوسری ملاقات ایک ویک اینڈ اکیڈمی کے گراؤنڈ میں صبح سویرے جوگنگ کے دوران ہوئی تھی۔ ان کے بہت کم بیچ میٹ چھٹی کے دن سورج کے نکلنے سے بھی پہلے اس طرح کی کسی جسمانی سرگرمی میں مصروف پائے جاتے تھے۔ شیر دل نشے کی حد تک رننگ اور جوگنگ کا عادی تھا اور عکس صبح سویرے طلوع آفتاب کو دیکھنے اور اس وقت چہل قدمی کی۔ شیر دل اس کو اکثر رننگ کے دوران وہاں دیکھا کرتا تھا لیکن عام دنوں میں اس وقت کچھ دوسرے کامنرز بھی وہاں پائے جاتے تھے اور شیر دل کو پہلے کبھی موقع ملا بھی تو اسے عکس کو مخاطب کرنے میں دلچسپی نہیں تھی...... لیکن لائبریری والے واقعے کے بعد اس نے پہلی بار رننگ کے دوران عکس کو اکیلے دیکھا تھا اور وہ اس کو دیکھتے ہوئے رک گیا تھا۔

"بہت ہمت ہے آپ کی سنڈے کو بھی نکلی ہوئی ہیں۔" شیر دل نے اس کے قریب رکتے ہوئے علیک سلیک کے بعد کہا۔

"آپ سے کم ہی ہے ہمت...... میں تو صرف ہلکی پھلکی چہل قدمی کے لیے نکلی ہوں...... آپ کی طرح ڈھائی تین میل کی رننگ تو نہیں کرتی سنڈے کو۔" شیر دل نے بے حد حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ واقعی ڈھائی تین میل رننگ کیا کرتا تھا اور عکس کے منہ سے یہ بات اسے بے حد حیران کن لگی تھی۔ یہ تبھی ہوسکتا تھا جب وہ اسے ٹریک کے چکر لگاتے باقاعدگی سے دیکھتی رہی ہو۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں یک دم شاید اتنی حیرانی آئی تھی کہ عکس بھی پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں......" شیر دل نے مسکراتے ہوئے ٹالا۔

"چلیں پھر آپ چہل قدمی کریں اور میں اپنے تین میل پورے کرتا ہوں۔" اس نے رننگ دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے عکس سے کہا۔ چند منٹوں کے بعد ٹریک کے بینڈ پر اس نے اپنے عقب میں عکس کو دیکھنے کی کوشش کی وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ حیران رہ گیا تھا، وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہوسکتی تھی۔ اس کے چلنے کی رفتار اتنی زیادہ تو نہیں تھی کہ وہ منٹوں میں وہاں سے اپنے ہاسٹل پہنچ جاتی...... باقی رننگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اس جگہ پر عکس کو کھوجتا رہا جہاں وہ اس سے ملا تھا لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی اور پھر اچانک اس نے اسے ایک درخت کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑے دیکھا تھا وہ اب ٹریک پر اسی طرف تھا جس طرف وہ پہلے عکس سے مل چکا تھا۔ ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا اسے جیسے عکس کو ڈھونڈ لینے پر۔ رننگ کرتے ہوئے وہ وقتاً فوقتاً نظریں اٹھا کر اس کو دیکھتا رہا وہ اسی طرح درخت کے ساتھ ٹکی کھڑی تھی۔ ٹریک پر اس کی طرف بڑھتے ہوئے شیر دل کو احساس ہوا کہ وہ کچھ دور کسی چیز کو دیکھنے میں مگن تھی۔ اس نے بھاگتے بھاگتے عکس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ ٹریک کے بالمقابل روش کے دوسری طرف نظر آنے والے لان کی ایک باڑ کے پاس بلی اپنے کچھ بچے لیے پھر رہی تھی۔ شیر دل نے ٹریک پر بھاگتے ہوئے اس سے بات کرنے کی شدید خواہش کے باوجود بھی اس درخت کو کراس کیا جس کی دوسری طرف وہ کھڑی تھی۔

''میں ڈراپ کردوں آپ کو؟'' ایک ہفتے کے بعد ان کی تیسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک ویک اینڈ تھا۔ سہ پہر کے قریب شیر دل اپنے گھر کا ایک چکر لگانے کے لیے نکلا تھا جب اس نے اکیڈمی کے داخلی دروازے کی طرف جاتی ہوئی عکس کو دیکھا۔ اس نے گاڑی روک کر اسے آفر کی۔

''نہیں تھینک یو......'' اس نے انکار کیا۔

''اوکے......'' شیر دل نے اصرار نہیں کیا۔ وہ شاید اس انکار کے بارے میں سوچتا تک نہیں اگر اکیڈمی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بیک ویو مرر میں وہ مجتبیٰ فرقان کی گاڑی کو اس کے قریب آکر رکتے اور اسے اس کی گاڑی میں بیٹھتے نہ دیکھ لیتا۔ خفگی کا ایک شدید احساس تھا جو اسے ہوا تھا۔ اس کے لیے شیر دل کے ساتھ جانا قابلِ قبول نہیں تھا مجتبیٰ کی گاڑی میں جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ عکس سے ایک بار پھر بری طرح چڑ اٹھا وہ۔

اکیڈمی کی سب سے خوب صورت لڑکی عالیہ نعیم اور سب سے hot لڑکی عکس ہے۔'' وہ اس رات میس میں بیٹھا چند دوسرے کامنرز کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا جب ان کی ساتھی لڑکیوں کا ذکر شروع ہوا اور نافع نے تبصرہ کیا۔ شیر دل کو جیسے کرنٹ لگا تھا...... اور اس کرنٹ کی وولٹیج میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہوا جب اس نے وہاں بیٹھے باقی تینوں کامنرز کو بھی نافع سے متفق پایا۔ عالیہ نعیم کو بیوٹی کوئین ماننے میں اسے بھی تامل نہیں تھا لیکن عکس کو ہاٹیسٹ وویمن ماننے میں اسے تذبذب تھا۔

''عکس سب سے ہاٹ ہے؟ کم آن۔'' اس نے جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''تو تمہیں کون ہاٹ لگتی ہے؟'' نافع نے جواباً اس سے کہا۔ شیر دل نے دو منٹ میں اپنے کامنرز کی تمام لڑکیوں کی اسکریننگ کی اور پھر غیر محسوس طور پر وہ عکس کے نام پر آکر رکا۔

''ہاٹ'' وہ اب بھی جیسے کچھ نہ ماننے والے انداز میں اس کو the most wanted وویمن کے معیار پر پرکھ رہا تھا۔ اور بالکل اس لمحے عکس مراد علی نے میس میں قدم رکھا تھا اور اکیڈمی میں کئی ہفتے گزارنے کے بعد اس دن پہلی بار شیر دل کو پتا چلا کہ عکس اپنے کامن میں پاپولر نہیں تھی، وہ اس کامن کے تمام لڑکوں میں پاپولر تھی اور اس کی وجہ اس کی پہلی پوزیشن سے بڑھ کر بھی کچھ تھی۔ نافع اگر کہہ رہا تھا کہ اس کی فگر وہاں موجود لڑکیوں میں سب سے اچھی تھی تو وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شیر دل نے اتنے ہفتوں میں پہلی بار اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کچھ بھی پہن لیتیں ان پر اچھا لگتا تھا...... کامن کی کچھ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ میک اپ زدہ نہیں تھی۔ ہلکے شیڈز کی ایک لپ اسٹک اور بڑے نفاست سے پن اَپ کیے ہوئے شانوں سے کچھ نیچے تک جاتے گھنے بال جو اسٹیپس میں کٹے ہوئے تھے اور جنہیں وہ صرف وہاں سوشل ایونگز میں کھلے رکھتی تھی...... اس کا سنگھار تھی اور یہ اس کی شاندار فگر تھی جو اسے باقی تمام لڑکیوں میں غیر محسوس طور پر ممتاز کیے ہوئے تھی...... اس دن وہاں بیٹھے ہوئے شیر دل کو پہلی بار اسے دیکھتے دوسرے لڑکے عجیب انداز میں چبھے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ عکس مراد علی کے حوالے سے اس طرح کی فیلنگز وہاں موجود تقریباً ہر اس لڑکے کی تھیں جو پہلے سے کہیں انٹرسٹڈ نہیں تھا۔

باقی آئندہ

راستے زندگی کے

ناہید فاطمہ حسنین

نومولود ان کے ہاتھوں میں تھا۔ انتہائی گورا چٹا، حیرت انگیز طور پر ستواں ناک، پلکوں کی دبیز جھالر، گلابی ہونٹ اور گلابی گال...... کسمساتے، مسکراتے یا روتے ہوئے بائیں گال پر پڑنے والا بھنور...... اگر وہ لڑکی ہوتا تو شاید مقابلۂ حسن جیت کر آتا۔

ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ان کی پانچ سال سے رکی ترقی کی خبر نومولود کے پیدا ہوتے ہی انہیں ملی تھی۔ بیوی کے اسپتال میں اچانک داخل ہو جانے سے قبل وہ آفس جا چکے تھے پھر جب بیوی کی حالت بگڑنے کی خبر پر وہ اسپتال پہنچے تو بیوی ان سے کچھ بھی کہے سنے بغیر خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ اب وہ لرزتے ہاتھوں میں لیے نومولود کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے بھاگوان قرار دیں یا اس کے پیدا ہوتے ہی بیوی کے مر جانے کے سبب منحوس...... لیکن نہیں...... وہ کوئی وہمی قسم کے دقیانوسی یا بدعات پالنے والے مرد نہیں تھے۔

''نومولود...... تم تو آنکھیں بھی پوری طرح نہ کھول پائے کہ تمہاری امی آنکھیں موند کر رب سے جا ملیں۔'' انہوں نے لرزتے ہاتھوں میں لیے نومولود کو چوم لیا۔

☆☆☆

وہ سر پکڑے بیٹھے تھے ان کے سامنے پانچ سال، تین سال، ایک ماہ کا بیٹا اور عورت کے وجود سے خالی مکان، سوالیہ نشان تھا۔ کچھ دن بچوں کی نانی، خالہ اور پھپھو نے ان کے گھر رہ کر ان کی دل جوئی کی پھر وہی ہوا جو مر جانے والی ماں کے لیسر ہو جانے والے زندہ بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ نانی، خالہ، پھپھو تینوں نے ان سے بچے مانگ لیے کہ وہ آپس میں بچے بانٹ لیں گی، وہ کیسے پال پائیں گے...... انہوں نے تینوں کو خود سے لپٹا لیا۔

''آپا...... یہ کسی کتے، بلی کے بچے تھوڑی ہیں جو بانٹ دیے جائیں یہ میرے بچے ہیں...... ایک انسان کے بچے۔'' کہا تو انہوں نے بظاہر اپنی آپا سے تھا لیکن سنانا سب کو مقصود تھا۔

''خدا نہ کرے کہ ہم انہیں کسی جانور کے بچے سمجھیں۔'' بچوں کی نانی نے تڑپ کر کہا۔

''آخر کو تم انہیں کیسے پالو گے، کیسے سنبھالو گے...... راتوں کو جاگنا، لنگوٹ بدلنا، بار بار پیشاب کرانا، کھانا کھلانا، فیڈر بنانا...... تم کمانے نکلو گے کہ انہیں پالو گے۔'' نانی نے نومولود کو ان کی گود سے لے لیا۔

''پھر اس نومولود کی ذمّے داری تو سب سے بڑی ہے اوپر سے یہ دو شریر بچے پھر ان شریروں کی دسترس سے اس کو بچانا۔'' نانی نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی لیکن کہیں بھی وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔

مستقیم نے بابر اور ہمایوں کو سینے سے چمٹا کر نومولود کو نظر بھر کر دیکھا۔ نومولود نے شاید نانی کی بات پر ناگواری سے منہ بسورا تو اس کا ڈمپل اور گہرا ہو گیا...... کچھ دیر بعد اس نے نانی کی گود میں منہ سے دودھ اگل دیا۔

''ارے، مر گیا، مر گیا، میرا بیٹا مر گیا۔'' مستقیم چلائے نانی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے بدحواس ہو کر وہ بچے پر جھک گئیں تولیا سے اس کو صاف کیا۔

''اے ہے...... رہنے دو مستقیم تم نے تو مجھے بھی بوکھلا کے رکھ دیا، پال لیے تم نے بچے...... بچے دودھ بھی الٹتے ہیں، دست بھی لگ جاتے ہیں، الٹیاں بھی کرتے ہیں تم تو ہر، ہر بات پر مر گیا کا نعرہ لگاتے رہنا۔'' نانی غصہ ہوئیں۔

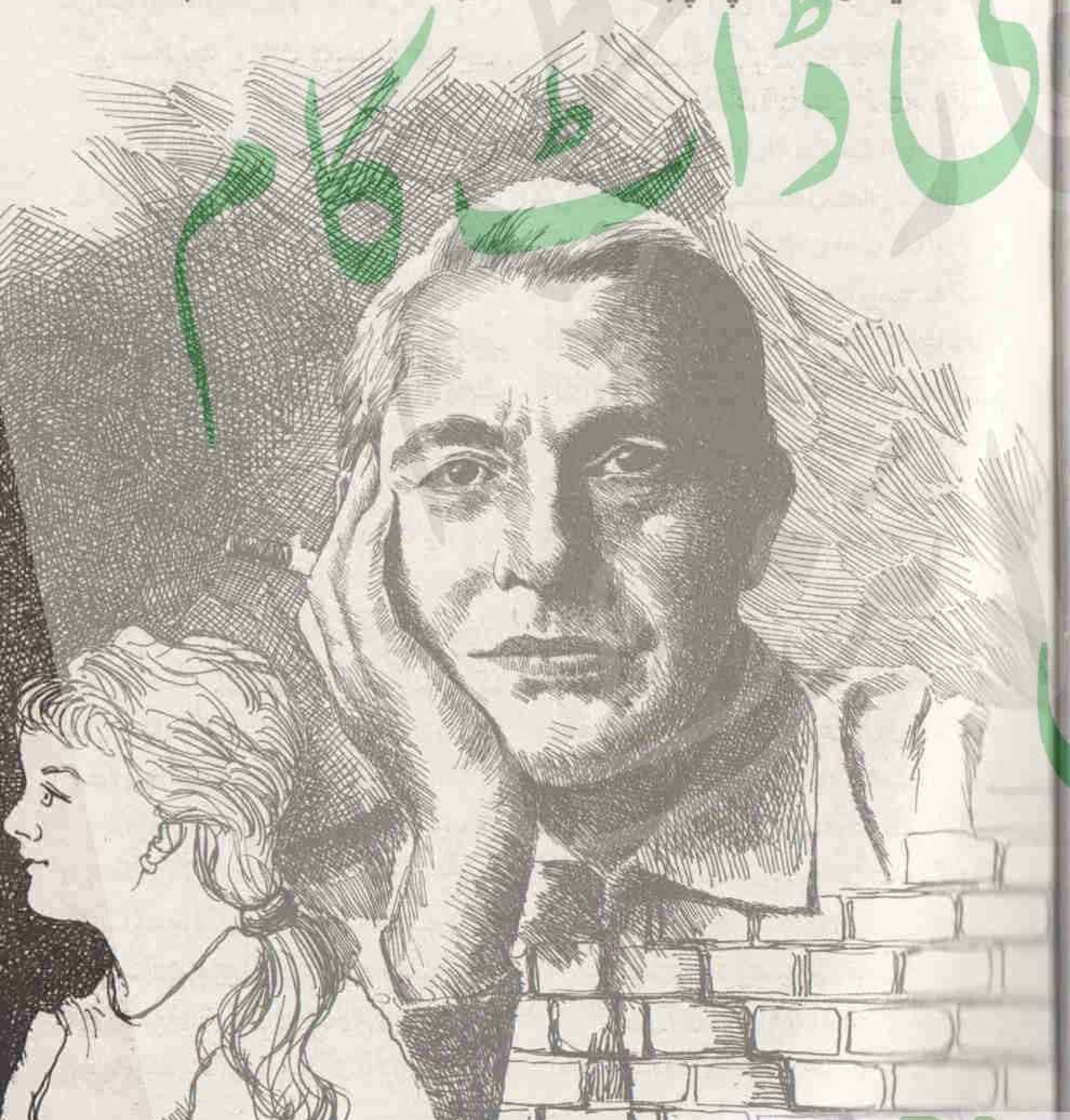
''بچے یوں آسانی سے تھوڑی پلتے ہیں مستقیم تم، سوچ لو...... چاہو تو سب بچے کسی ایک کو دے دو، چاہو تو بانٹ دو......'' یہ ان کی بہن تھیں۔

''آپا کچھ بھی سوچیے، کوئی تدبیر کیجیے، میں سب کرنے کو تیار ہوں ماسوائے اپنے بچے بانٹنے کے......''

انہوں نے تین سالہ ہمایوں کو دیکھا جو ایک انگلی منہ میں لیے تھا تو منہ سے اس کی رال بہہ رہی تھی۔ مستقیم نے جھٹ نومولود کی تولیا سے ہمایوں کی رال صاف کی۔

''اے ہے کیا کرتے ہو مستقیم...... نئے بچے کی ہر چیز الگ ہوتی ہے، اب تم سب کو ایک ہی تولیا سے صاف کرتے پھرنا......'' نانی بولیں۔

''آہستہ آہستہ سب سمجھ آ جائے گا آپ فکر نہ کریں......'' انہوں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور



تو لیا ایک سائڈ پر رکھ دی۔

☆☆☆

بالآخر طے یہ پایا کہ آفس جاتے ہوئے مستقیم نومولود اور ہمایوں کو نانی کے گھر چھوڑ دیں گے۔ بابر کو چھٹی کے بعد اسکول وین نانی کے گھر چھوڑ دے گی۔

آفس سے واپسی پر وہ تینوں کو رکشے میں لے کر گھر آجائیں گے پھر جلد ہی ہمایوں کا بھی اسکول میں ایڈمیشن کروا دیا جائے گا۔ کبھی کبھار حسنہ آپا بھی مستقیم کے گھر آجایا کریں گی، وہ بے اولاد تھیں۔

☆☆☆

وہ پہلی رات جو انہوں نے نومولود اور بچوں کے ساتھ گزاری وہ جاگتے گزری۔ ہر دو منٹ میں نومولود رونے لگتا۔ اس کے پیٹ میں درد تھا جس کا مستقیم کو مطلق علم نہ تھا کہ بابر بھی روتا ہوا اٹھ گیا۔

"کیا ہوا بچے؟" انہوں نے یوگا آسن کے طرز پر بیٹھ کر عالمگیر کو گود میں لٹایا تو دوسرے ہاتھ سے بابر کو چمکارا۔

"بابا...... ڈر لگ رہا ہے۔"

"نہ بچے...... ڈر کیسا؟ تم ڈرو کو لگ جاؤ۔"

انہوں نے بابر کو قریب کھینچ کر اپنے پاس لٹا لیا۔

☆☆☆

زرین بانو بہت عمدہ الفاظ میں ان سے ان کی بیوی کی تعزیت کر کے گئیں زرین آفس کولیگ تھیں، وہ چھٹی پر تھیں جب وہ آفس آئیں اور انہیں مستقیم کی بیوی کی موت کا پتا چلا تب وہ ان کے روم میں چلی آئیں۔

زرین بانو ایک درمیانی عمر کی بہت سنجیدہ اور بردبار خاتون تھیں وہ اپنے کام میں بہت پرفیکٹ تھیں۔ ایک حدِ فاصل رکھتے ہوئے آفس کے ہر شخص یہاں تک کہ چوکیدار و چپراسی تک سے ان کے مشفقانہ روابط تھے۔ وہ بلاشبہ آفس کی ایک پسندیدہ خاتون تھیں چہرے مہرے سے بھی وہ ایک دلکش خاتون کہی جاسکتی تھیں اتنی عمر ہو جانے کے باوجود کنواری تھیں۔

"مسٹر مستقیم عثمانی، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ دوبارہ اپنا گھر بسا لیں۔" ان کے باس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے ان سے کہا۔

آفس میں آج کام کا لوڈ بہت زیادہ تھا۔ مستقیم پہلے ہی اپنی مجبوری باس کو بتا چکے تھے کہ وہ آفس ٹائم ختم ہوتے ہی آفس چھوڑ دیں گے کہ انہیں گھر اور بچے دیکھنے ہوتے ہیں جس کی باس نے انہیں اجازت بھی دے دی تھی یوں بھی مستقیم کام بہت ایمانداری و محنت سے کرتے تھے۔ ان کا باس ان سے ہر طرح خوش تھا۔

آج جب وہ اپنے جانے کی اطلاع دینے باس کے روم میں آئے تو باس نے نہایت ہمدردی سے ان سے کہا۔

انہوں نے جز بز ہو کر باس کا منہ دیکھا اور سر جھکا لیا بولے کچھ نہیں...... کچھ لمحے بنا چاپ کیے گزر گئے/ان کا کردار...... ان کا کام...... کچھ بھی تو ایسا نہ تھا کہ جس پر باس تو کیا آفس کے کسی بندے کو بھی اعتراض ہو، سو باس نے خوش دلی سے انہیں جانے دیا، وہ تشکر کے کلمات ادا کر کے روم سے نکل گئے باس کی نگاہ نے دروازے تک ان کا پیچھا کیا۔

☆☆☆

عالمگیر سو رہا تھا وہ جلدی جلدی اس کی فیڈر تیار کر رہے تھے کہ مبادا وہ اٹھ کر بھوک سے روئے تبھی بابر روتا ہوا آیا اس نے ایک ہاتھ سے کوئی چیز پشت پر چھپائی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا ہمارے بابر بادشاہ سلامت کو؟" وہ اپنے بچوں سے اسی طرح مخاطب ہوتے تھے۔

"کیوں رو رہے ہیں بادشاہ سلامت......؟" وہ اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"بچے آپ نے پیچھے کیا چھپا رکھا ہے؟"

"نئیں (نہیں) دوں گا۔" وہ اور زور سے چلایا اور گھوم گیا۔ وہ اچھل کر جیسے بت بن گئے پشت پر

اس نے ماں کی تصویر چھپائی ہوئی تھی۔

"امی بلاؤ، امی پاس جانا ہے۔" وہ کسی طرح نہیں بہلا۔

"امی کو کیسے بلاؤں، وہ تو جنت میں ہیں۔"

"میں بھی جنت میں جاؤں گا۔" وہ زور، زور سے چیخا۔ انہوں نے فیڈر رکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ...... ہمایوں شہزادہ کہاں ہے؟"

انہوں نے فریج میں رکھی قلفی اسے دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیوی کی تصویر لینا چاہی تو وہ اور زور زور سے چیخنے لگا۔

"اچھا...... اچھا...... لو بھئی۔" انہوں نے تصویر اسے دے کر قلفی چھین لی...... وہ پھر چلانے لگا۔

"یار چیٹنگ تو مت کرو نا، قلفی لو...... تصویر دو...... یا پھر تصویر لے لو قلفی لوٹا دو......" بچہ تو تھا ہی قلفی لے لی، تصویر دے دی، انہوں نے بھینچ کر اسے پیار کیا۔ پھر ہمایوں کو قریب آتا دیکھ کر ایک قلفی اسے دی پھر دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر شفقت سے انہیں قلفی کھاتا دیکھتے رہے۔

"بہت لمبا سفر ہے جو ابھی طے کرنا ہے۔" دھیرے سے خود کلامی کی۔

☆☆☆

زرین بانو گاہے بہ گاہے ان کی اور بچوں کی خیریت پوچھا کرتیں۔ آج جب ان کے کمرے میں آئیں تو حیرت سے بولیں۔

"مستقیم صاحب کیا استری خراب ہو گئی تھی یا لائٹ نہیں تھی۔" زرین کی نگاہ ان کی ملگجی سی قمیص پر تھی۔

"کیا بتائیں مس زرین، رات بھر نومولود روتے رہے اور ہم جاگ جاگ کر ان کی سیوا کرتے رہے، صبح دیر سے آنکھ کھلی، بابر صاحب کی بھی وین نکل گئی تھی۔ تینوں کو بھاگم بھاگ نانی کے گھر چھوڑا...... اب استری میں لگ جاتے تو آفس کو اور دیر ہو جاتی۔" زرین نے دل ہی دل میں ان کے اسٹیمنا کی داد دی کس طرح مشکل کو ہنس کر بیان کر دیا۔

"یہ بتائیں گھر کا نظام کیسے چلتا ہے کھانا وغیرہ؟"

"لگتا ہے مس زرین آج آپ بھی کچھ پوچھ لیں گی۔" وہ ہنسے، ان کی ہنسی میں زرین بھی شامل ہو گئیں۔

"کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی ہے جو کپڑے برتن اور صفائی کر جاتی ہے۔ کھانا کبھی ہم خود بناتے ہیں کبھی بہن اور بچوں کی نانی کے گھر سے آجاتا ہے اور کبھی بازار سے۔"

"اس طرح کب تک چلے گا؟" وہ دلچسپی سے بولیں۔

"جب تک مالک آقا کو منظور ہے، بندے پر بوجھ ڈالنے سے قبل میرا مالک اس کی استطاعت دیکھ لیتا ہے۔" وہ ذرا رک کر پھر گویا ہوئے۔

"دیکھیں مس زرین جب عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں تب وہ بھی تو بچے بھی پالتی ہیں اور معاش کی ذمے داری بھی اٹھا لیتی ہیں۔"

"وہ عورتیں ہوتی ہیں جناب...... مرد چاروں محاذ پر کبھی نہیں لڑ سکتے۔" زرین شگفتہ بیانی سے بولیں۔

"بات تو آپ کی صحیح ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں......" انہوں نے قلم کو قلمدان میں رکھا۔ "کچھ مرد ایسے بھی ہیں جو چاروں میدان مارنے کی سعی میں مصروفِ عمل رہتے ہیں اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں بھی انہی میں سے ایک بننا چاہتا ہوں۔"

زرین ہنستے ہوئے اٹھ گئیں۔

"جس کا یقین اپنے رب پر اتنا پختہ ہو اس کا رب بھی اسے نہیں چھوڑتا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

☆☆☆

انہوں نے بہت اشتیاق سے مستقیم کی فوٹو البم لی، ان کے کانوں میں گزشتہ روز مستقیم کا کہا جملہ بازگشت کر رہا تھا۔

”مس زرین میں آپ کو اپنی بیوی کی فوٹو البم دکھاؤں گا...... آپ دیکھیے گا اس کرۂ ارض پر اس سے زیادہ حسین عورت نہ ہوگی۔“

وہ جوں جوں بلیک اینڈ وائٹ فوٹو البم پلٹتی جاتیں حیرتوں کے پہاڑ ان پر ٹوٹتے جاتے۔

ان کی بیوی اوسط درجے کے نقش و نگار کی حامل ایک بہت عام اور معمولی سی خاتون تھی نہ جس کا ناک نقشہ خوب صورت تھا اور نہ جسمانی ساخت ایسی تھی کہ نظر ٹھہر جائے۔ انہوں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ان کی بیوی کی تصویر پر انگلی رکھ کر ان سے پوچھا۔

”مستقیم صاحب...... یہی ہیں ناں آپ کی بیگم صاحبہ......؟“

”جی، جی بالکل ٹھیک آپ نے پہچانا......“ اشتیاق و تجسس، محبت و وارفتگی ان کے لہجے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ دنیا کی سب سے حسین عورت......“ زرین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”اب دیکھیے لوگ مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیتے ہیں، بھلا مل جائے گی مجھے اس جیسی حور......“ زرین نے ہونق پن سے بہت غور کر کے انہیں تکا...... ”وہ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے تھے...... نہیں...... پھر کیا طنز...... نہیں وہ بھی نہیں...... کیا ان کی نگاہ کمزور ہے...... نہیں ایسا بھی نہیں تھا...... پھر کیا وہ کلر بلائنڈ تھے...... شاید نہیں تصویریں تو بلیک اینڈ وائٹ ہیں پھر......؟ پھر کیا وجہ ہے؟“ وہ سوچ گئیں، لمحوں میں سرا ان کے ہاتھ آگیا، وہ سمجھ گئیں وہ جان گئی تھیں کہ ان کی نگاہ میں بصارت بھرنے والی روشنی کا تعلق ان کے دل سے جا ملتا تھا، اسی دل سے جس دل کی نگاہ سے قیس نے کالی کلوٹی لیلیٰ پر اپنی عقل وار کر خود کو مجنوں کہلوایا تھا۔ وہ بڑی متانت سے مسکرائیں۔

”بڑی خوش نصیب تھیں آپ کی بیگم صاحبہ۔“

”ہاں......“ ہاں کو بہت کھینچ کر مستقیم نے کہا۔

”آپ نے واقعی صحیح کہا بڑی بھاگوان تھیں۔“

☆☆☆

”مستقیم یوں ایسے کب تک چلے گا...... اب تو میں بھی امریکا جا رہی ہوں۔ تم بالکل تنہا رہ جاؤ گے...... ویزا نہ آتا تو میں کبھی نہ جاتی۔“ حسنہ نے انہیں سمجھایا۔

”ارے آپا...... آپ آرام سے امریکا جائیں، بس آپ دعا کرتی رہیں، دعا دور ہو کے بھی قربت کا احساس دلاتی ہے۔ دعا کیجیے میں اس آگ کے دریا کو عمدگی سے عبور کر لوں، دیکھ لیجیے پانچ سال گزر گئے باقی بھی گزر ہی جائیں گے۔“ امید کی ڈھیروں قندیلیں ان کی آنکھوں میں روشن تھیں۔

”بھئی تم سیدھے سیدھے شادی کر لو، کہو تو میں کوئی سمجھدار خاتون دیکھ کر نکاح کے دو بول پڑھوا جاؤں۔“ حسنہ نے ان کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

”پھر میرے بچے کون دیکھے گا؟“

”ارے...... وہی تمہاری بیوی......“

”وہ میری بیوی تو بننے کو تیار ہو جائے گی ان بچوں کی ماں نہیں۔“ مستقیم ہنس دیے۔

”کیا دنیا میں سب برے ہیں کوئی اچھا نہیں۔“

”تو کیا ضروری ہے کہ وہ اچھی ہی ہو جو مجھ سے شادی کرے۔“ ترکی بہ ترکی انہوں نے جواب دیا۔

”بھئی تم بہت بحث کرتے ہو۔“ حسنہ الجھ گئیں۔

”چلیں بحث کو سمیٹتے ہیں، مجھے بچوں کا مستقبل عزیز ہے، میں شادی نہیں کر سکتا آخر میں نے بغیر شادی کے پانچ سال گزار دیے ناں۔“ مستقیم نے دوٹوک کہا۔

”تم کون سے بڈھے ہو گئے ہو جسے شادی کی خواہش نہیں۔“

”لو آپا......“ مستقیم ہنس دیے۔ ”ابھی تو تم کو بچوں کا خیال تھا اب میری جوانی بڑھاپا یاد آ رہا ہے۔“ انہوں نے چائے بنا کر آپا کو دی تو آپا نے عالمگیر کو بلا کر اپنی گود میں بھر لیا۔ عالمگیر فوراً ان کی گود سے اتر کر مستقیم کے پاس چلا گیا۔ مستقیم نے جونہی اپنی چائے کا گھونٹ بھرا عالمگیر نے دھپ سے اپنا سر ان کی کہنی پر دے مارا۔ ساری چائے ان پر آ گری۔

”اوہو ہوہو...... نومولود کیا کیا تم نے بابا کو جلا ہی دیا......“ وہ جلدی سے سیدھے ہو رہے۔

”ارے کیا بدتمیزی کرتا ہے بچہ...... سب سے زیادہ شریر ہے یہ جسے پانچ سال گزرنے کے باوجود تم نومولود ہی سمجھتے ہو۔“ آپا تو غصہ ہی ہو گئیں۔

”چلو بھاگو نومولود میاں...... پھپھو کو غصہ آ رہا ہے۔“ وہ ٹھنڈے ہی تھے...... اٹھ کر بیسن تک آئے۔

”جل تو نہیں گئے؟“ حسنہ ابھی تک غصے میں تھیں۔

”آپا چائے تھی یہ...... برف کا پانی تو نہیں......“ مستقیم مسکرا دیے۔

”ہٹو یہاں سے، تم بہت بدتمیز، شریر قسم کے بچے ہو۔“ حسنہ نے عالمگیر کو جھڑکا۔

”بابا......“ عالمگیر نے ان کا پچھلا دامن کھینچا۔

”جی بیٹا۔“ وہ مسلسل بیسن سے پانی لے کر پانی شرٹ پر ڈال رہے تھے مبادا چائے کا داغ نہ لگ جائے ہولے سے مڑے۔

”پھپھو کو ان کے گھر بھیجیں۔“ عالمگیر نے کن انکھیوں سے پھپھو کو دیکھتے ہوئے مستقیم سے کہا تو مستقیم کے ساتھ حسنہ بھی ہنس دیں۔

”اِدھر آ...... ابھی بتاتی ہوں، مجھے گھر بھیجے گا ناں......“ حسنہ نے پیار سے اسے ڈانٹا۔

☆☆☆

”مستقیم ٹیوٹر عالمگیر کی بہت شکایت کر رہا ہے۔“ آفس سے جب وہ بچوں کو نانی کے گھر لینے پہنچے تو نانی نے دبے دبے لفظوں میں ان سے شکایت کی۔

”ٹیوٹر کہتا ہے کہ بابر اور ہمایوں تو سبق یاد کر لیتے ہیں مگر عالمگیر یاد نہیں کرتا۔ ہر وقت اس کا دل شرارتوں میں لگا رہتا ہے اور تو اور روزانہ ایک سادہ کاغذ لے کر ٹیوٹر سے کہتا ہے بابا نے ایپلیکیشن دی ہے کہ آج مجھے چھٹی دے دیں، میں بیمار ہوں۔“ مستقیم نے عالمگیر کو لپٹا لیا...... عالمگیر نے باپ کو اور زور سے بھینچا اس کے چہرے پر خوف کی ذرا جو پرچھائی تک ہو...... وہ کسی سے ڈرتا ہی کب تھا۔

”کیوں نومولود...... پڑھنے میں دل نہیں لگتا؟“

”نہیں۔“ نہایت دلیری سے عالمگیر نے کہا۔

”پھر تم بڑے افسر کیسے بنو گے، بابا کو گاڑی کیسے دلاؤ گے؟“

”اب گاڑی نہیں دلاؤں گا......“ وہ کھلونوں سے کھیلنے لگا سر جھکا ہوا تھا۔

”پھر......؟“

”اب جہاز دلاؤں گا۔“ اس کے جواب پر نہ چاہتے ہوئے نانی بھی مستقیم کے ساتھ ہنس دیں۔

”کل تو ہمایوں اور عالمگیر نے اپنی نانی کا ناک میں دم کر دیا تھا۔“ مستقیم پیار بھرے لہجے میں مس زرین کو بچوں کی شرارتیں بتا رہے تھے۔

”مستقیم صاحب! آپ بچوں کو سرزنش بھی کیا کیجیے ورنہ وہ بگڑ جائیں گے یوں بھی بن ماں کے ہیں۔“

”ایک بات بتاؤں؟“ مستقیم بہت موج میں تھے۔

”جی ضرور......“

”یہ ماؤں کی عادت ہوتی ہے بات بے بات بچوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا جبھی تو ان کا رعب کم ہوتا ہے بچوں پر جبکہ باپ بہت کم ڈانٹتا ہے اور جس بات پر ڈانٹے بچے پھر وہ نہیں کرتے۔“

زرین نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا دیں،

بات تو سچ تھی۔

"مسٹر مستقیم میں نے اپنی زندگی کا طویل صحرا تنہا ہی عبور کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن آپ کی بیگم صاحبہ کی بے وقت موت اور بن ماں کے رہ جانے والے ننھے بچوں، آپ جیسے باوفا باکردار اور بچوں سے از حد محبت کرنے کے رویے نے مجھے اس حد تک متاثر کیا ہے کہ میں خود کو اس فیصلے سے روک نہ سکی کہ میں آپ کو خود شادی کا پیغام دوں۔" مس زرین بہت مدھم لہجے میں نظریں جھکائے دھیمے دھیمے ان سے مخاطب تھیں جبکہ مستقیم ہکا بکا انہیں تکتے رہے، وہ ہمدردی میں اس مقام تک جا پہنچیں گی ان کے وہم و گمان میں نہ تھا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے تینوں بچوں کو ماں کی بھرپور ممتا دینے کی کوشش کرتے ہوئے آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی...... میرے پروپوزل پر آپ بہت توجہ سے غور کیجیے اور مجھے سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا......" وہ بہت باوقار انداز سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ آج انہوں نے بالوں میں پھول لگایا ہوا تھا اور ان کی میز سے اٹھتے سمے وہ اپنی مٹھی میں بند چند ادھ کھلی کلیاں ان کی میز پر ہی چھوڑ گئی تھیں، دانستہ یا نادانستہ...... وہ تو کمرے سے نکل گئیں ان کے جملوں کی بازگشت مستقیم کے کانوں میں سرسراتی رہی۔

یہ جو 'ہاں' اور 'نہ' کا درمیانی فاصلہ ہوتا ہے ناں...... یعنی فیصلے کی گھڑی...... یہ زندگی کا بڑا کٹھن مرحلہ ہوا کرتا ہے وہ... بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے وہ کسی بھی فیصلے کے نتیجے میں پہنچنے تک خلا میں معلق رہنا پسند نہیں کرتے تھے مس زرین کو اپنے روم میں بلا کر بہت شائستگی سے گویا ہوئے۔

"مس زرین آپ کا فیصلہ قابلِ ستائش ہے جس کی میں دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ زندگی میں بنائے گئے اپنے اصولوں اور فیصلوں سے نہ تو منحرف ہوتا ہوں نہ سودے بازی کرتا ہوں...... میں نے نومولود کو......" پھر وہ ہولے سے ہنسے "میں آج تک کمبخت کو نومولود ہی کہتا ہوں......" کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے "میں نے عالمگیر کے پیدا ہوتے ہی گود میں لینے کے فوری بعد خود سے عہد کیا تھا کہ میں اپنے بچوں کی زندگی میں سوتیلا وجود ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

"آپ مجھے ہرگز سوتیلا نہیں پائیں گے۔"

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ مستقیم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک کر اپنی بات جاری رکھی۔

"جب کوئی ماں دوسری شادی کرتی ہے تو وہ اپنے بچوں کے لیے سگی ہی رہتی ہے مگر جب کوئی باپ دوسری شادی کرلیتا ہے تب وہ اپنے بچوں کے لیے سوتیلا ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک......" ان کی لمبی تمہید مزید طویل پکڑتی زرین نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے بات کو وہیں ختم کر دینا مناسب خیال کیا۔ آواز میں بشاشت ہرگز نہیں تھی۔ "میں آپ کی بات سے آپ کے نتیجے تک جا پہنچی ہوں۔ میں آپ جیسے فادرز کو سلیوٹ کرتی ہوں۔" اور واقعی انہوں نے کھڑے ہو کر انہیں سلیوٹ کیا۔ ہردم لبوں کا حصار کیے رہنے والی نرم مسکراہٹ اب بھی ان کے لبوں پر رقصاں تھی فرق صرف اتنا تھا کہ اب کی مسکراہٹ گھائل تھی زخمی تھی...... جسے مستقیم اپنے بچوں کی حاوی محبت کے سبب جان نہ پائے۔

"میں آپ کی ہونے والی دل آزاری پر از حد شرمندہ ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ آپ ایک ایسی باوقار خاتون ہیں جس کا ساتھ کسی بھی مرد کے لیے خوشی و طمانیت کا باعث بن سکتا ہے۔ میری مجبوریاں نہ ہوتیں تو اس منصب پر فائز ہونا میرے لیے اعزاز ہوتا۔" زرین نے دھیرے سے اپنی پلکوں کی جھالر گرادی ان کی نگاہیں اپنے پیر کے انگوٹھے پر تھیں جو تذبذب کے عالم میں قالین کو کھرچ رہا تھا۔ آنکھوں میں آئی نمی کو زرین نے بہت خوب صورتی سے خشک کیا۔

"میں چلتی ہوں ابھی کام بھی بہت باقی ہے۔"

انہوں نے گورے چٹے ہاتھوں پر بندھی سیاہ پٹے کی گھڑی پر نگاہیں جمائیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مستقیم نے کھڑے ہو کر انہیں وش کیا۔

☆☆☆

حسنہ آپا امریکا سدھاریں...... جاتے لمحے ائر پورٹ پر بچوں اور مستقیم سے لپٹ کر رو پڑیں۔ "تم اب بھی جو بچہ چاہو مجھے دے سکتے ہو۔" مستقیم مسکرادیے بولے کچھ نہیں۔

آپا سے رخصت ہو کر انہوں نے بچوں کی جانب رخ کیا۔ یہ کیا......؟ وہاں تو کوئی ایک بچہ بھی نہیں تھا۔ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی بہت تیزی سے نظروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے پورے وجود کو بھی چاروں سمت موڑا...... دور اچانک انہیں بابر کی پیٹھ نظر آئی۔

"بابر...... بابر بیٹا۔" وہ چلائے...... بابر نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"بھائی کہاں ہیں؟" انہوں نے لمبے لمبے ڈگ بھرے۔

"بابا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر اس سمت بھاگے ہیں۔" بابر پھر آگے کو بھاگا انہوں نے بھی اس کے تعاقب میں جست لگائی اور کچھ ہی دیر میں بابر کو جالیا...... اب وہ بابر کے ساتھ ساتھ ہمایوں اور عالمگیر کو ڈھونڈ رہے تھے۔

"وہ تمہارے پاس تھے، تم نے کیسے انہیں جانے دیا۔"

"بابا، دونوں نے میرا ناک میں دم کر کے رکھا ہوا تھا پورے وقت دونوں ائر پورٹ پر بھاگ دوڑ کر رہے تھے...... میں کبھی ادھر ان کے پیچھے بھاگتا کبھی اُدھر...... خاص طور پر عالمگیر...... وہ تو ایک منٹ کو نچلا نہیں بیٹھا تھا...... میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تو وہ میرے ہاتھ پر کاٹ کر بھاگ جاتا...... یہ دیکھیں کتنے نشانات ہیں۔" وہ ہاتھ دکھا رہا تھا مگر مستقیم کی نگاہیں ائر پورٹ کے اطراف میں بچوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"ائر پورٹ پر موجود بچوں کو بھی عالمگیر ہی تنگ کر رہا تھا......" بابر بولے چلا جا رہا تھا۔

"ہوں ہوں......" بس وہ اتنا ہی کہہ پائے۔

اچانک عالمگیر کے چلانے کی آواز پر دونوں نے ایک سمت دیکھا۔ ہمایوں نے عالمگیر کو دبوچا ہوا تھا اور عالمگیر خود کو چھڑانے کے چکر میں ہمایوں کے ہاتھ پر کاٹنے کے ساتھ چیخیں بھی مار رہا تھا۔ دونوں رش کو چیرتے ہوئے اس تک پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمایوں کو اچھا خاصا جھنجوڑ ڈالا...... پھر عالمگیر کے کان اینٹھے...... اس نے اسی لمحے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"چلو......!" وہ خاصے درشت لہجے میں دونوں سے مخاطب تھے۔ ہمایوں نے سہم کر بابر کا ہاتھ پکڑ لیا جبکہ عالمگیر کو مستقیم نے قابو کیا اب وہ تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کی جانب رواں دواں تھے، عالمگیر کا رونا بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم دونوں گھر چلو پھر مزہ چکھاتا ہوں۔" انہوں نے نہایت سختی سے کہا۔

"مجھے کیوں......؟ میں تو عالمگیر کو پکڑ رہا تھا۔" ہمایوں...... ٹھنٹھنایا۔

"اگر کوئی پکڑ کر لے جاتا تو......؟" وہ اب تک غصے میں تھے۔

"یہ عالمگیر کا بچہ تنگ کر رہا تھا کہہ رہا تھا چھپن چھپائی کھیلیں۔"

"چھپن چھپائی کے بچے...... یہ جگہ کھیلنے کی ہے۔" انہوں نے عالمگیر کے کان دوبارہ

مروڑے...... اس کی چیخیں دوبارہ آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کچھ عرصے قبل خریدی سیکنڈ ہینڈ کار کے پاس پہنچ کر انہوں نے لاک کھولا تو عالمگیر ان سے ہاتھ چھڑا کر دور جا کھڑا ہوا جبکہ بابر، ہمایوں دونوں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''اِدھر آؤ......'' مستقیم کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا انہیں اس کی ادا پر پیار آنے لگا۔

''نہیں...... آپ ماریں گے۔''

''اچھا جلدی آؤ...... نہیں ماروں گا......'' انہوں نے اپنی ہنسی روکنی چاہی۔

☆☆☆

قدموں کی مدھم چاپ، آنچل کی سرسراہٹ، پرفیوم کی ماحول پر بھینی بھینی پھیلتی مہک...... انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مس زرین نرم مسکراہٹ سے اپنے روم کی طرف جاتی نظر آئیں جاتے جاتے بہت وقار سے سلام کیا تھا انہوں نے۔

آج انہوں نے مس زرین کو بہت غور سے دیکھا تھا، دراز قامت گھنے بالوں کی لمبی چوٹی جس میں کہیں کہیں چمکتے سفید بال، پُروقار لیکن جاذب نظر شخصیت، نرم خو، خاموش طبع، خوش لباس ہر دم لبوں پر رہنے والی دھیمی مسکان...... بجا طور پر وہ شریکِ سفر بنائے جانے کے قابل تھیں لیکن مستقیم تو......

☆☆☆

''اللہ اللہ اللہ......'' نانی کی شکایت پر انہوں عالمگیر کے کان مروڑے ہوئے تھے اور وہ اپنے کان چھڑاتے ہوئے شدتِ تکلیف سے بلبلا رہا تھا۔

''کیوں، اب کرو گے؟ نانی کیا شکایت کر رہی ہیں تم گھر سر پر اٹھا کر رکھتے ہو......؟''

''گھر...... سر پر اٹھ سکتا ہے؟'' وہ آٹھ سال کا تھا کوئی ناسمجھ بچہ...... تو نہیں تھا ترکی بہ ترکی بولا۔

''ٹیوشن پڑھتے تمہارے پیٹ میں کیوں درد اٹھتا ہے؟''

''درد سے پوچھیں...... کان تو چھوڑیں۔'' وہ بلبلایا۔

''عالمگیر میں بہت ماروں گا۔'' انہوں نے اچھا خاصا کان مروڑ کے چھوڑ دیا۔ وہ غصے میں دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ وہ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھے رہے، سب سے زیادہ عالمگیر کی شرارتوں سے وہ عاجز تھے۔

''بابا بھوک لگی ہے کھانا نکالیں۔'' یہ ہمایوں تھا۔

''ہاں بیٹا۔'' انہوں نے ہمایوں کو پیار سے قریب کیا۔ انہوں نے چاول پکائے تھے اب وہ کھانا بنانے میں خاصے پرفیکٹ ہو گئے تھے لیکن آج عالمگیر کی گوشمالی کے سبب چاول پتیلی میں لگ گئے تھے۔ عالمگیر کو کھانے پر بلانے کے لیے وہ اٹھے...... وہ ناراض ہو گیا تھا لہٰذا آج وہ کھانا نہیں کھاتا اسے منانا بھی ایک معرکہ سر کرنے کے مترادف تھا۔

''نومولود......'' انہوں نے بہت شفقت سے اسے پکارا یوں جیسے ابھی کچھ دیر قبل کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ بیڈ کے نیچے چھپنے کے لیے اٹھا کہ وہ اکثر وہیں جا چھپتا تھا پھر اسے نکالنا ایک الگ مسئلہ ہوتا تھا...... لہٰذا اس کے اٹھتے ہی مستقیم نے اس کی نیت بھانپتے ہوئے اسے دبوچ لیا اور زبردستی گود میں اٹھا کر ٹیبل تک آئے۔

☆☆☆

وقت تو اپنی صحیح رفتار ہی سے گزر رہا تھا لیکن مستقیم کو لگتا تھا وقت چیونٹی پر سوار ہے، جو آگے بڑھ کے نہیں دے رہا۔

نانی کا انتقال ہو چکا تھا، حسنہ امریکا میں مزے کر رہی تھیں اکثر فون کرتی رہتی تھیں...... خالہ لاہور شفٹ ہو چکی تھیں اکثر فون پر بچوں سے ان کا رابطہ رہتا تھا...... بابر بی ای کر رہا تھا، ہمایوں بھی سیکنڈ ائیر جبکہ عالمگیر میٹرک میں تھا پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا وہ ایک ایوریج اسٹوڈنٹ تھا۔ ہاں اسے

کمپیوٹر پر بہت مہارت حاصل تھی۔ مستقیم اکثر اس کے لیے پریشان رہتے تھے اب وہ اس کی عجیب و غریب ضد پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔

''بیٹا تم ابھی بہت چھوٹے ہو، میں تمہیں تنہا کیسے باہر بھیج دوں؟'' انہوں نے اسے بہت سمجھانا چاہا...... مگر وہ کسی طور بات سننے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

''بیٹا ابھی تمہیں بہت پڑھنا لکھنا ہے جب تم میرے سامنے اپنی اسٹڈیز پر توجہ نہیں دیتے تو وہاں کیسے پڑھو گے جہاں تمہارے سر پر کوئی بھی نہیں...... وہاں کی لائف تو یوں بھی بہت ٹف ہے۔''

''بابا مجھے کچھ نہیں پتا...... بس آپ مجھے جانے دیں۔'' اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

''اچھا...... مجھے سوچنے کی مہلت دو۔'' مردہ دل سے انہوں نے کہا۔

''بابا سوچنے کے بعد بھی فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔'' انہوں نے سر اٹھا کر قطعیت سے جواب دینے پر اپنے ہر دلعزیز بیٹے کو دیکھا جس نے انہیں کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

عالمگیر نے باہر جانے کی ٹھان ہی لی تھی بہت انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود...... وہ بھی اپنے باپ کا بیٹا تھا، ضدی اپنی بات پر اڑ جانے والا، اپنے اصول خود مرتب کر کے سختی سے ان پر عمل پیرا ہونے والا، پڑھائی لکھائی میں ایوریج تھا، انجینئر بننے سے صاف انکاری، کمپیوٹر اس کا اوڑھنا بچھونا تھا اس نے نیٹ پر سرچ کر کے اپنے باہر جانے کا سب پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا اور مستقیم کو بتا دیا تھا کہ وہ باہر جا کر پڑھنے کے ساتھ ساتھ جاب بھی کرے گا اپنا خرچہ خود اٹھائے گا۔

''میرا خیال ہے بابا کہ میں باہر جا کر زیادہ ذمے داری کا ثبوت دے کر آپ کا سر فخر سے بلند کروں گا۔'' مستقیم نے نڈھال ہو کر بغور اسے دیکھا اس کے ارادے میں انہیں چٹانوں جیسی سختی نظر آئی...... تب انہوں نے گردن جھکا لی۔

''تم سوچ سکتے ہو کہ میں نے... بیک وقت تمہیں ماں اور باپ دونوں بن کر پالا میں تمہیں کس دل سے جدا کر دوں؟''

''جی بابا، میں مرتے دم تک آپ کا ممنون و مشکور رہوں گا، میں جانتا ہوں کہ ایک باپ جب ماں بن کر اولاد کو پالتا ہے تو وہ بہت کڑے اور کٹھن دور سے گزرتا ہے گو میں اس احساس سے خود نہیں گزرا لیکن جانتا اور مانتا ضرور ہوں کہ ایک باپ کے لیے دو رشتوں کو ایک رشتے میں ضم کرنا یا دو کرداروں کو بیک وقت نبھانا کتنا دشوار ہوتا ہے لیکن مائیں بھی تو اجازت دیتی ہیں ناں...... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اپنی محبت کی مغلوبیت کے احساس تلے عرصے دراز تک مجھے نومولود کہتے اور سمجھتے رہے۔ میں آپ کے جذبوں کی قدر کرتا ہوں...... یقین کیجیے میرے دل میں آپ کی محبت اتنی شدید ہے جتنی کوئی اپنی ماں سے کر سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں بابا کہ میں نے بہت خودسر زندگی گزاری، سب سے زیادہ میں نے آپ کو تنگ کیا لیکن بابا زندگی کے اس فیصلے پر میں اپنی خودسری سے بھی عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن مجھے آپ کی اجازت درکار ہے۔'' انہیں لگا جیسے آج ان کا نومولود بھرپور جوان ہو گیا ہو...... انہوں نے اسے دیکھنے کے لیے سر اٹھایا تو عالمگیر نے جھک کر ان کے دونوں ہاتھ چوم لیے اور گھٹنے پکڑ لیے وہ لڑکھڑا گئے، کانپ گئے...... اس کی جدائی کے خیال سے...... اس کی اتنی لمبی تمہید انہوں نے نہایت تحمل و خاموشی سے سنی اگرچہ ان کے دل کے سمندر میں مدوجزر برپا تھا پھر لرزتی آواز میں بولے۔

”میں تم کو خود سے جدا کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”میرے بہتر مستقبل کے لیے اب سوچ لیں۔“ وہ بھلا کہاں چوکنے والا تھا۔

”دیکھیں بابا اجازت تو آپ کو دینی ہوگی، میرا سب کام مکمل ہے......“ انہوں نے اس کے آخری جملے پر تڑپ کر اسے دیکھا۔ انہیں لگا آج وہ بوڑھے ہوگئے ہوں۔

”اچھا سوچتا ہوں۔“ پھر مری مری آواز میں انہوں نے کہا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ سوچنے کے بعد بھی آپ کا جواب اثبات میں ہونا چاہیے...... افسوس آپ اب تک کچھ سوچ ہی نہیں سکے۔“ وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا...... وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔

دوسرے روز جب ناشتے کی میز پر اسے بلایا گیا تو اس کا خالی کمرا خالی الماریاں گھر والوں کا منہ چڑا رہی تھیں...... نہ جانے وہ رات کے کس پہر نکل گیا تھا، کارنس پر ایک پرچہ چھوڑ کے۔

”بابا سلام!

جانتا ہوں آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں جتنے کسی ماں کے بھی نہیں ہوں گے کیونکہ آپ نے میری زندگی میں ماں اور باپ کے بیک وقت دو رول پلے کیے، میں نے ماں کے بجائے پہلا لمس آپ ہی کا محسوس کیا۔ مجھے یاد نہیں آپ نے میری کوئی خواہش کبھی رد کی ہو...... پھر بھلا اس کو آپ کیوں رد کر رہے ہیں؟ میرا پاسپورٹ، ویزا، سب تیار تھا اجازت کے چکر میں مزید رک جاتا تو ناقابلِ تلافی نقصان بھگتنا پڑتا اور پاسپورٹ ویزا کا آپ کو بتا دیتا تو شاید...... والدین اولاد کی غلطیاں معاف کرتے ہی ہیں آپ نے میری کئی کوتاہیوں کو معاف کیا ہے امید ہے اس آخری غلطی کو بھی بڑی فراخدلی سے معاف کر دیں گے۔

آپ کا نافرمان بیٹا۔ عالمگیر......“

زندگی میں پہلی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے انہیں لگا وہ ڈھے گئے ہوں۔ خط کی ہر ہر سطر گویا بم دھماکا تھی۔

☆☆☆

زخم کتنا بھی گہرا ہو، کسی نے بھی بخشا ہو بھر ہی جاتا ہے۔ زندگی آگے کو رواں دواں ہے وہ سامنے کا دیکھتی اور دکھاتی ہے...... سو ان کی زندگی کے معمولات بھی اپنے پرانے، ڈھب پر لوٹ آئے...... لیکن انہیں ہر دم ایسا لگتا جیسے وہ کہیں کچھ رکھ کر بھول گئے ہوں، اس کے جانے کے بعد گو زندگی اپنی تمام کشش کھو بیٹھی تھی دو بیٹے اور بھی تھے لیکن عالمگیر...... پھر عالمگیر تھا۔ وہ اکثر جب اسے شدت سے یاد کرتے تو خود اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتے، سونگھتے آنکھوں سے لگانے کے بعد سینے سے لگا کر ٹھنڈی آہ بھرا کرتے جیسے ابھی ابھی عالمگیر پیدا ہوا تھا اور انہوں نے اسے ہاتھوں کے لمس سے محسوس کیا ہو۔ اس کے جانے کے فوراً بعد اس کا فون آیا، وہ بے حد ضدی تھے سو ناراضی برقرار تھی انہوں نے فون پر بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب اکثر اس کا فون آتا دونوں بھائی بات کرتے، وہ ان سے معافی کی سفارش نہیں کرتا، دونوں بابا کو راضی کرنا چاہتے مگر وہ مستقیم ہی کیا جو ہٹیلے نہ ہوں۔

☆☆☆

ان کی ریٹائرمنٹ میں کچھ ٹائم باقی تھا ان کے بعد ان کی سیٹ مس زرین کو سنبھالنی تھی...... شروع میں ان خاتون کے چہرے پر ملال اور آنکھوں میں شکوہ انہیں صاف دکھائی دیتا تھا جسے ہر دم وہ نظر انداز کرتے رہے کہ وہ اپنے بنائے اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے والے شخص تھے پھر رفتہ رفتہ تمام جذبے سرد ہو کر معدوم ہو گئے۔ اس متین و بردبار خاتون نے اب تک شادی نہیں کی تھی، وہ کوشش کے باوجود کبھی پوچھ نہ سکے کیونکہ نہ کبھی انہوں نے کسی کی ذاتی زندگی میں مخل ہونے کی کوشش کی نہ اپنی زندگی میں در اندازی کی اجازت دی۔

وہ فطرتاً نہایت ایماندار شخص تھے۔ تعلقات بھی بہت اچھے لوگوں سے تھے جب انہوں نے بابر کی نوکری کے لیے بات کی تو ایک جاننے والے نے بابر کو ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر رکھوا دیا۔ ہمایوں بھی بی ای کے آخری سال میں تھا۔ اب گھر میں ان کے علاوہ اچھی خاصی بحالی آگئی تھی انہوں نے اپنی جمع پونجی سے گھر کو مزید دو منزلہ بنوا کر اسے کرائے پر دے دیا تھا۔ ان کے حساب سے تینوں بیٹوں کو ایک ایک پورشن مل جاتا تھا۔

تقریباً چھ ماہ سے عالمگیر کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ بابر اور ہمایوں رابطہ کرتے تو ہو نہیں پا رہا تھا۔ وہ مستقیم کو بتاتے تب وہ اس طرح ہنستے جیسے انہیں کوئی سروکار نہ ہو لیکن ان کا دل بے چین رہتا وہ بات نہیں کرتے تھے لیکن خیریت کا تو پتا چل جاتا تھا۔ پھر اچانک ایک روز عالمگیر کا فون آگیا، عالمگیر کا اصرار تھا کہ بابا ایک بار اس سے بات کر لیں مگر مستقیم اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے تھے...... اسے بتانا پڑا کہ اس کا شدید نوعیت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ آپریشن کے لیے جانے سے قبل بابا سے معافی مانگنا چاہتا ہے...... بس مستقیم کو لگا کہ دنیا اندھیر ہو رہی ہو قدرت نے بجا طور پر باپ ہوتے ہوئے بھی انہیں ممتا کا دل عنایت کیا تھا انہوں نے فون جھپٹ لیا۔

”میرے نومولود تو کیسا ہے؟ کیا ہو گیا تجھے...... میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ضبط کے تمام بندھن توڑ کر وہ بلک بلک کر رو دیے حالانکہ انہوں نے بہت تنہائی زندگی گزاری تھی۔ بیوی کو چھپ کر یاد کیا تھا مبادا وہ رو پڑیں اور ان کے بچے کمزور ہو جائیں۔

”بابا...... بابا جانی آپ مجھے معاف کر دیں، زندگی بھر میں نے آپ کو ستایا...... جاتے جاتے بھی آپ کو دکھ دے گیا......“ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

”نہیں...... نہیں میرے بیٹے، میری جان، تو نے مجھے کبھی نہیں ستایا، میں نے تجھے معاف کیا معاف کیا، معاف کیا......“ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر روئے جا رہے تھے ان کا وجود بھی لرز رہا تھا۔ وہ جو زندگی بھر کبھی نہ روئے کتنے ہی کٹھن دور آئے اور چلے گئے مگر آج انہیں احساس ہوا کہ مائیں اتنی جلدی کیوں رو پڑتی ہیں؟

”بیٹا تیرا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟“

”ہائی وے پر دھند کے سبب...... بابا بس آپ دعا کریں۔“ وہ بہت ہمت سے بولا۔

فون رکھ کر انہوں نے دل پکڑ لیا پھر اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جب ایک گول مٹول نومولود ان کے ہاتھوں میں آیا تھا۔ جس کی ماں اس کی پیدائش کے فوراً بعد داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ انہیں آج پھر وہی لمس محسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو چوم لیا گویا عالمگیر کو بوسہ دیا ہو۔

ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد انہیں ایک بڑے ادارے سے جاب آفر ہوئی تو انہوں اسے فوری جوائن کر لیا وہ گھر میں خالی بیٹھنے والے شخص نہ تھے۔ بیٹوں نے بہت منع کیا لیکن انہوں نے کسی کی نہ سنی خدا نے عالمگیر کو نئی زندگی دی تھی وہ روز ہی باپ کو فون کرتا اور ان سے گھنٹوں باتیں کرتا، اپنے تجربات کو ان سے شیئر کرتا انہیں بچوں کی طرح بتاتا کہ اس نے زندگی کو کتنے قریب سے دیکھا ہے۔ زندگی کا تلخ گھونٹ حلق سے اتارنا کس قدر مشکل ہے، اس نے بتایا کہ اس کی تعلیم عنقریب ختم ہونے والی ہے پھر

اسے اور اچھی جاب مل جائے گی ابھی وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کھولی نما ایک کمرے میں رینٹ پر رہتا ہے...... مستقیم بظاہر بہت خوش ہو کر اس کی باتیں سنتے لیکن اس سے دوری اور زندگی کے لیے اس کی مشقت انہیں اندر ہی اندر کھائے جاتی۔

ہمایوں بھی ایک اچھی فرم میں لگ گیا تھا وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ انہوں نے دو سگی بہنوں کو دونوں بیٹوں کے لیے پسند کر لیا شادی والے روز بھی انہیں عالمگیر شدت سے یاد آتا رہا جو آنہیں سکتا تھا۔

شروع شروع میں دونوں بہوئیں بہت اچھے طریقے سے رہیں پھر رفتہ رفتہ دونوں کا ملمع اترنے لگا...... مستقیم کے کھانے پینے کے اپنے اصول و وقت تھے مگر دونوں بہوئیں فقط ایک بوڑھے شخص کی ذمے داری اٹھانے سے گریزاں تھیں...... وہ عورتوں کی طرح بیٹوں سے ان کی بیویوں کی شکایت کرنے کے حق میں نہیں تھے، وہ اپنا کماتے تھے لہٰذا کسی سے دبنے والے نہ تھے۔

وہ بوڑھے اور ناتواں تو ہوتے جا رہے تھے اس عمر میں کھانے پینے کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے لیکن ان کا خیال کون رکھتا، بہوئیں بیٹیاں نہیں بن جاتیں۔ ان کے بیٹے آنکھوں والے ہوتے ہوئے بھی اندھے ہو گئے تھے۔ انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور جو نظر آتا اسے وہ خود نظر انداز کر جاتے اور جو کبھی پوچھ لیتے کہ بابا کا خیال کیوں نہیں رکھا جا رہا تو دونوں اپنے اپنے شوہروں سے لڑنے کھڑی ہو جاتیں کہ کیا بابا صرف ان کی ذمے داری ہیں۔ مرد عام طور پر لڑائی جھگڑے سے بچتے ہیں سو چپ ہو رہتے اور یوں بیویوں کو شہ مل گئی...... رفتہ رفتہ مستقیم فون پر اپنا دکھ عالمگیر سے کہنے لگے، عالمگیر بے حد ملول رہنے لگا...... ان کا خرچ جو وہ بھیجتا تھا مزید بڑھا دیا اور انہیں حالات سے نمٹنے کی ترکیبیں بتاتا جسے وہ سن کر ہنس دیتے۔ عالمگیر نے بہت پہلے ہی انہیں نوکری کرنے سے روک دیا تھا۔

ادھر ان کی بہوؤں کے نخرے نہیں مل کے دے رہے تھے، وہ بھی بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے دونوں بیٹوں اور بہوؤں کو اپنے کمرے میں بلایا اور بیٹوں سے ان کی بیویوں کے حوالے سے بات کی۔

''بابا میں تو آپ کا بے حد خیال رکھتی ہوں آپ مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔'' بولنے والی چھوٹی بہن چھوٹی بہو تھی...... اور انتہائی چالاک...... دیورانی، جیٹھانی بن کر دونوں بہنوں میں ٹھن ہی گئی تھی۔

''تم چپ بیٹھی رہو، نہ میں نے تم کو مخاطب کیا ہے نہ مجھے تم سے کوئی شکوہ ہے، میں اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوں، مجھے جواب بھی انہی سے چاہیے۔'' انہوں نے رخ موڑ کر بہو سے درشت لہجے میں کہا۔ دونوں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

''بابا آپ کو آئندہ کوئی شکایت نہیں ہوگی، آپ کا خیال اب یہیں عورتیں رکھیں گی اگر نہیں رکھا تب ہم بھی انہیں دیکھ لیں گے......'' پھر ذرا توقف سے بابر بولا۔ ''اصل میں تو یہ کام عورتوں ہی کے ہیں ہم تو مرد۔''

''نامعقول، گدھے، پاجی...... تیرا خیال تیری مرنے والی ماں نے رکھا تھا کہ باپ نے جو ایک مرد تھا۔'' بابر نے نظریں جھکا لیں۔

''میں کسی کو بھی بار بار آزمانے کا قائل نہیں...... میرا خیال ہے کہ تم دونوں اپنی اپنی بیویوں کو لے کر کرایے کے مکان میں رہو جب آٹے دال کا بھاؤ سمجھ میں آ جائے اور عقل ٹھکانے پر آ جائے تو لوٹ آنا...... آخر کو میرا سب کچھ تم ہی لوگوں کا ہے تمہارا باپ ہوں رکھ لوں گا تمہیں......''

''بابا ہم آپ سے دور نہیں رہ سکتے۔'' ہمایوں گڑگڑایا۔

''عالمگیر بھی تو رہ رہا ہے کالے کوسوں، تم بھی رہ

لینا جب یاد آئے تو مجھ سے ملنے چلے آنا مگر اکیلے۔''

''آخر آپ نے دو منزلہ گھر کس کے لیے بنوایا ہے؟'' شازیہ بول پڑی گویا بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔

''تم پھر بیچ میں بولیں؟'' انہوں نے اسے غصے میں گھورا۔

''تم کو منع نہیں کر دیا......'' ہمایوں نے بیوی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''یہ پورا گھر تم تینوں کا ہے میرے مرنے پر آپس میں بانٹ لینا۔ اپنی زندگی میں، میں تم کو نہ دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

''بابا اس مہنگائی کے دور میں ہم کہاں جائیں گے، کرایہ کہاں سے دیں گے کیا کھائیں گے پھر میرا ایک اور بابر بھائی کے دو بچے ان کے خرچے......''

''سنو بیٹا......'' مستقیم نے درمیان سے بات اچک لی۔ ''بنی اسرائیل سے جب من و سلویٰ کی نعمت چھنی تو انہیں اس کی قدر و منزلت کا احساس ہوا کہ وہ اپنی ناشکری کے سبب کیسی نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھے...... تم لوگوں کو بھی جلد احساس ہوگا خدا کا شکر ہے تم لوگ بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ امتِ محمد ﷺ سے ہو۔'' بیٹوں نے سر جھکا لیا بہوئیں بھی دم سادھے بیٹھی تھیں۔

''بابا آپ ہمیں ایک موقع اور دیں۔'' بابر گڑگڑایا۔

''تم اپنے باپ کی ہٹیلی فطرت سے واقف ہو، اس کے مضبوط ارادے اور فیصلے پتھر کی لکیر ہوتے ہیں، میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم دونوں کو ساتھ نہیں رکھوں گا، عالمگیر مجھے اچھی خاصی رقم بھیجتا ہے وہ نہ بھی بھیجے تو میرے اپنے پیسے ہیں، گھر کا کرایہ ہے میں خود تو کھا ہی لوں گا تم لوگوں کو بھی کھلا سکتا ہوں۔ میرے پاس اتنا ہے میں تم لوگوں کے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔ انشاء اللہ۔'' اس بوڑھے، ناتواں وجود نے چٹانوں جیسی مضبوطی سے کہا۔ ''میرے ارادے اٹل ہوتے ہیں فیصلہ ایک بار کرتا ہوں تو بدلتا نہیں نہ اس پر پچھتاتا ہوں......'' بیٹوں کے ساتھ ساتھ بہوؤں کے قدموں تلے سے بھی زمین کھسکنے لگی۔

''ہاں۔'' وہ کھنکھارے تو سب کی نظریں ان پر گڑ گئیں۔

''یہ ہو سکتا ہے کہ اوپر کے دونوں پورشن خالی کروا کر تم دونوں کو دے دوں......'' ان کے کہتے ہی بہوؤں کے جیسے چہرے پر بہار آ گئی۔

دونوں لڑکے ایک ایک پورشن میں شفٹ ہو چکے تھے وہ نیچے تھے۔ اپنے لیے انہوں نے ایک کل وقتی لڑکا رکھ لیا تھا۔ جبکہ ایک عورت آ کر ان کا کھانا پکا جاتی تھی...... وہ بغیر ٹینشن کے بہت مزے کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب انہوں نے عالمگیر کو اپنے فیصلے کا بتایا تو وہ بھی کچھ مطمئن سا ہو گیا۔ عالمگیر کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی اسے ایک دوسری جگہ بہت اچھی جاب مل گئی تھی اسے ساتھ کام کرنے والی لڑکی پسند آ گئی تھی اس نے بابا سے شادی کی اجازت طلب کی۔

''جب تمہیں باہر جانے سے روکا تب تو تم نے سنا نہیں اب کیا سنو گے۔'' عالمگیر شرمندہ ہو گیا۔

''بابا باہر جا کر کچھ بننا میرا خواب تھا...... اس لڑکی سے شادی میرا خواب نہیں، آپ روکیں گے تو میں رک جاؤں گا۔''

''نہیں......'' وہ ہنسنے لگے۔ ''تم شادی کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''بابا میں آپ کو شادی کی لائیو مووی دکھاؤں گا۔'' خوشی اس کی آواز سے چھلک رہی تھی۔

''چل نالائق......'' مستقیم بھی دل کھول کر ہنسے۔

''آج نومولود اتنا بڑا ہو گیا۔'' فون رکھ کر بھی وہ گھنٹوں سوچتے رہے۔

☆☆☆

نیٹ پر دونوں بیٹوں کے ساتھ عالمگیر کی شادی کی موؤی دیکھ کر وہ آبدیدہ ہوگئے آج انہیں اپنا نومولود اپنے برابر کا لگا، وہ خوش بھی ہورہے تھے اور ان کی آنکھیں نم بھی ہورہی تھیں۔ وہ پورا دن انہوں نے اداس اور ملول ہوتے ہوئے عالمگیر کو یاد کرتے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔

وہ کافی ناتواں ہوگئے تھے باتھ روم سے نہا کر نکل رہے تھے کہ سلپ ہوگئے، ٹانگ میں فریکچر ہوگیا تھا جس کا فوری طور پر آپریشن کرنا پڑا۔ ٹانگ میں راڈ اور پلیٹ ڈالی گئی۔ وہ مکمل بستر پر آگئے تھے۔ جس شخص نے بہت فعال زندگی گزاری ہو اس کا یوں صاحبِ فراش ہوجانا بہ ذات خود تکلیف دہ امر تھا۔

جب عالمگیر کو پتا چلا تب وہ اور زیادہ دکھی ہوگیا۔ اس نے مستقیم سے فون پر یہ بات کی تو اسے اندازہ ہوگیا کہ اس حال میں بابا نے بہوؤں سے خدمت لینا گوارا نہیں کیا ہے۔ عالمگیر ان سے گفتگو کرتا اور بہت غمزدہ رہتا، اس نے اپنی نسلاً انگریز بیوی سے بھی بابا کی بات کروائی۔ کیترین نے جب اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں ان سے بات کی تب وہ دیر تک نہال رہے۔

وہ بہت تیزی سے ری کور ہورہے تھے ملازم انہیں واکر سے چلواتا، گھر میں موجود چھوٹا سا باغیچہ جس میں وہ واکر سے چلتے تھے...... وہ کچھ دیر ایکسر سائز کرنے کے بعد وہیں ورانڈے میں کرسی سے ٹک کر بیٹھ گئے۔ چھوٹے سے لان میں بیلا اور چنبیلی کی مہک رچی بسی تھی...... لمحوں میں ایک عکس جھلملا کر غائب ہوگیا۔

''اگر میں زرین کی بات مان لیتا تو میری زندگی بھی سنور جاتی۔'' کچھ ہی دیر میں انہوں نے دماغ میں آئے خیال کو جھٹک دیا۔ ''مگر بچے برباد ہوجاتے۔'' ان کی منطق نرالی تھی۔ ''آج بچے اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں مجھ سے ڈرتے ہیں میرے فرمانبردار ہیں، ان کی بیویاں اگر میرا خیال نہیں رکھتیں تو یہ ان پر فرض بھی نہیں۔'' وہ سر ہلا کر خود سوال کرتے اور خود جواب دینے لگے۔ ''لیکن انسانیت کے ناتے وہ میرا خیال رکھ سکتی تھیں۔'' دل مسلسل انہیں بغاوت اور پچھتاوے پر اکسا رہا تھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے وہ انسانیت کے ناتے میرا خیال رکھ سکتی ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان میں انسانیت ہوتی تب ناں......'' وہ طنز سے مسکرائے۔

''مس زرین میرے بڑھاپے کا سہارا ضرور بنتیں میری زندگی بھی اچھی زندگی ہوتی لیکن میرے بچے......'' وہ گھوم پھر کر پھر اسی محور پر لوٹ آئے۔

''عالمگیر......'' کچھ دیر بعد خیالوں کا دھارا عالمگیر کی سمت بہا لے گیا آج انہیں شدت سے نومولود یاد آرہا تھا۔ جب انہوں نے اسے پہلی بار اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تھا وہ اسی لمس کو اپنے اندر تک محسوس کرنے لگے۔

''عالمگیر!'' وہ بہت جذب کے عالم میں پھر اسے پکارنے گئے۔

''نومولود......''

''جی بابا......'' ان کے کانوں میں عالمگیر کی محبت بھری آواز گونجی...... وہ تڑپ اٹھے۔

''میرے بیٹے میرے نومولود، میری جان، میرے عالمگیر...... بادشاہ سلامت......'' وہ نہ جانے کیا کیا جذب میں کہتے چلے گئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوکر چھلک پڑیں۔

''بابا......'' یوں لگا جیسے فضا عالمگیر کی آواز سے مہک اٹھی ہو۔ تبھی ملازم کی کرخت آواز نے انہیں آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔

''دیکھیں صاحب...... یہ کوئی صاحب گھر میں گھسے چلے آرہے ہیں۔''

''کون؟'' انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا...... تو جیسے چاروں طرف خوشیاں بکھر گئی ہوں۔ ان کا عالمگیر، ان کا نومولود ہینڈ کیری پھینک کر ان کی جانب دوڑا۔

''بابا......'' عالمگیر نے کھڑے ہوتے مستقیم کا واکر ایک سمت پھینک کر انہیں اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں جکڑ لیا۔

''بابا میں...... میں آپ کا ناخلف، نالائق نومولود......'' وہ نوعمر کمسن سا عالمگیر ان کی آنکھوں میں پھر گیا جو صرف سولہ برس کے سن میں ان سے بچھڑ کر دور چلا گیا تھا آج وہ بھرپور توانا مرد اُن کو سہارا دیے ان سے لپٹا کھڑا تھا۔

''میرے بچے، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔'' انہوں نے اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس کے ہاتھوں پر نظر کی جو انہیں تھامے ہوئے تھے۔ وہ رو دیے۔

''نہیں بابا جانی، نہیں...... اب آپ کبھی نہیں روئیں گے۔'' وہ کسی طور انہیں خود سے جدا نہیں کررہا تھا اور وہ ناتواں وجود عالمگیر کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔

''بابا I am catreen your منیز با in Law...... ہو۔'' عقب سے آتی نسوانی آواز پر انہوں نے عالمگیر کے پیچھے دیکھا...... میک اپ سے عاری ایک کمسن خوبرو دوشیزہ مسکرا رہی تھی۔

''ارے میری بیٹی......'' فرطِ جذبات سے انہوں نے ہاتھ پھیلا دیے...... کیترین بھی آکر ان سے لپٹ گئی...... پھر عالمگیر انہیں لیے لیے صوفے پر بیٹھ گیا...... ملازم ہوشیار تھا منٹوں میں عالمگیر کا سامان دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔

''بابا آپ مجھے معاف کردیں، میں نے آپ کا دل دکھایا اور آپ کو ناراض کرکے گیا۔ بابا اب ہم دونوں یہیں رہیں گے آپ کے قدموں میں......''

''کیا؟'' انہیں جیسے کرنٹ لگا۔ ''نہیں بیٹا باہر تمہارا درخشاں مستقبل ہے......''

''نہیں بابا...... مجھے دنیا نہیں چاہیے، مجھے جنت چاہیے...... آپ کے قدموں میں میرا مستقبل ہے......'' وہ قالین پر بیٹھ گیا...... ''وہ جنت جسے میں ناراض کرکے چلا گیا تھا۔''

''نہیں......'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''میرا کیا ہے میں تو لو دیتا چراغ ہوں آج نہیں تو کل بجھ جاتا ہے...... بیٹا جب میں چاہتا تھا تم یہاں رہو تب تم نہ رکے، اب جب میں چاہتا ہوں تم واپس جاکر وہیں زندگی گزارو تو تم انکاری ہو......''

''مجھے احساس ہوگیا ہے میرا فیصلہ غلط تھا۔ آپ کو میری ضرورت ہے۔''

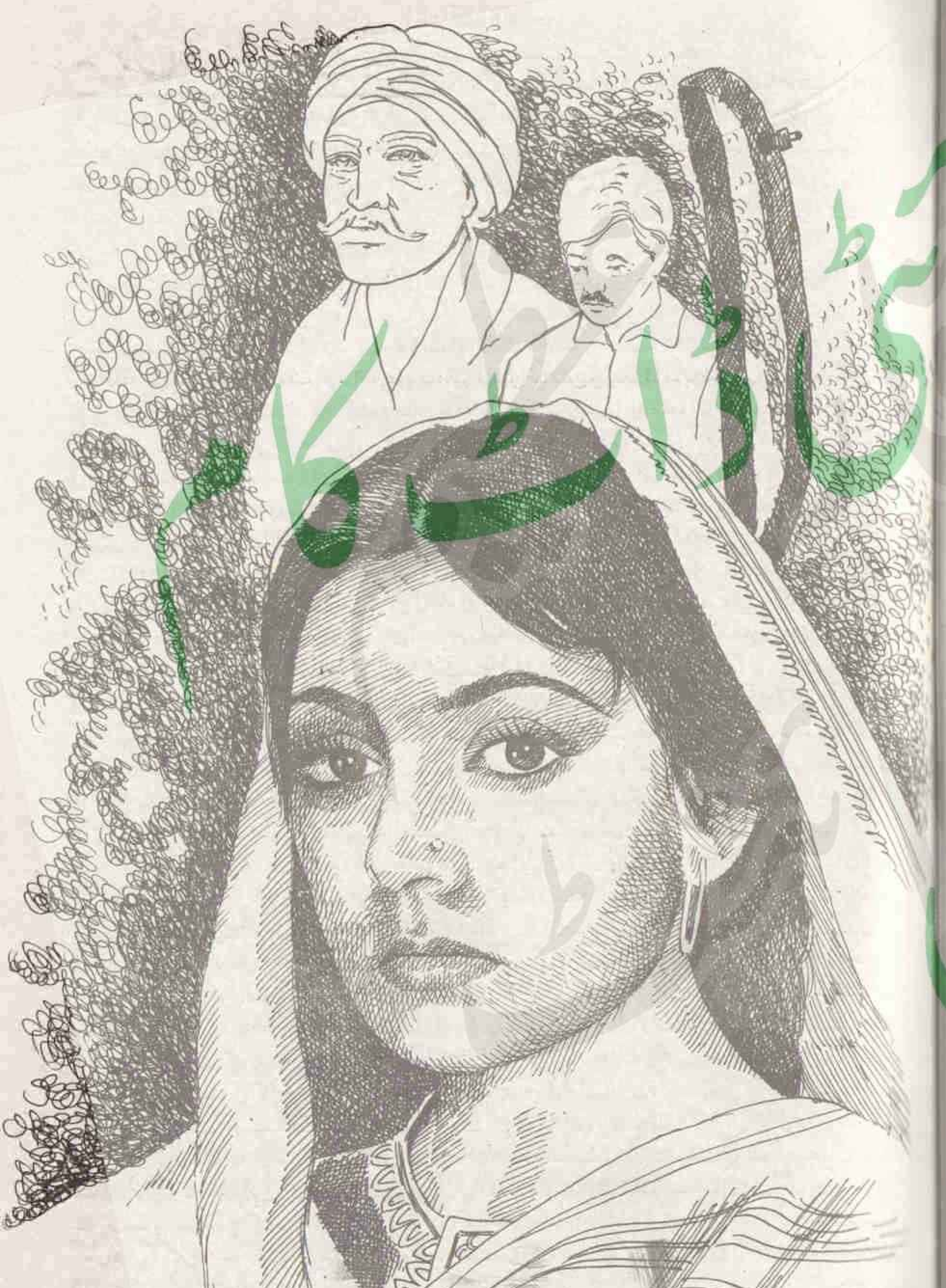
''نہیں بیٹا...... تمہارا فیصلہ غلط نہیں تھا...... بس جلد بازی میں کیا گیا تھا...... اب وہاں تمہارا مستقبل ہے، آج نہیں تو کل تم چلے جانا......''

''بابا میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں۔'' وہ کچھ شوخ ہونے لگا۔

''میں فیصلہ کرچکا ہوں کہ آپ کو میری ضرورت ہے اور میں باقی عمر آپ کی خدمت میں گزاروں گا، میں نے آپ کو بہت تکلیفیں دیں...... آپ کو چھوڑ کر چلا گیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ میرے بغیر نہیں رہ سکیں گے، بابا میں نے زندگی بھر آپ کو تنگ کیا، پریشان کیا ستایا...... مجھے کفارہ ادا کرنا ہے۔ بابا مجھے معاف کردیں، سچے دل سے۔'' وہ روتے ہوئے ان کے گھٹنوں سے جا لگا۔

''بیٹا میں نے تمہیں معاف کیا......'' مستقیم آبدیدہ ہوگئے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

''فادر یو آر گریٹ...... آئی سلیوٹ یو......'' وہ ان کے گھٹنے چھو کر کھڑا ہوا انہیں واقعتاً سلیوٹ کرنے لگا۔



شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

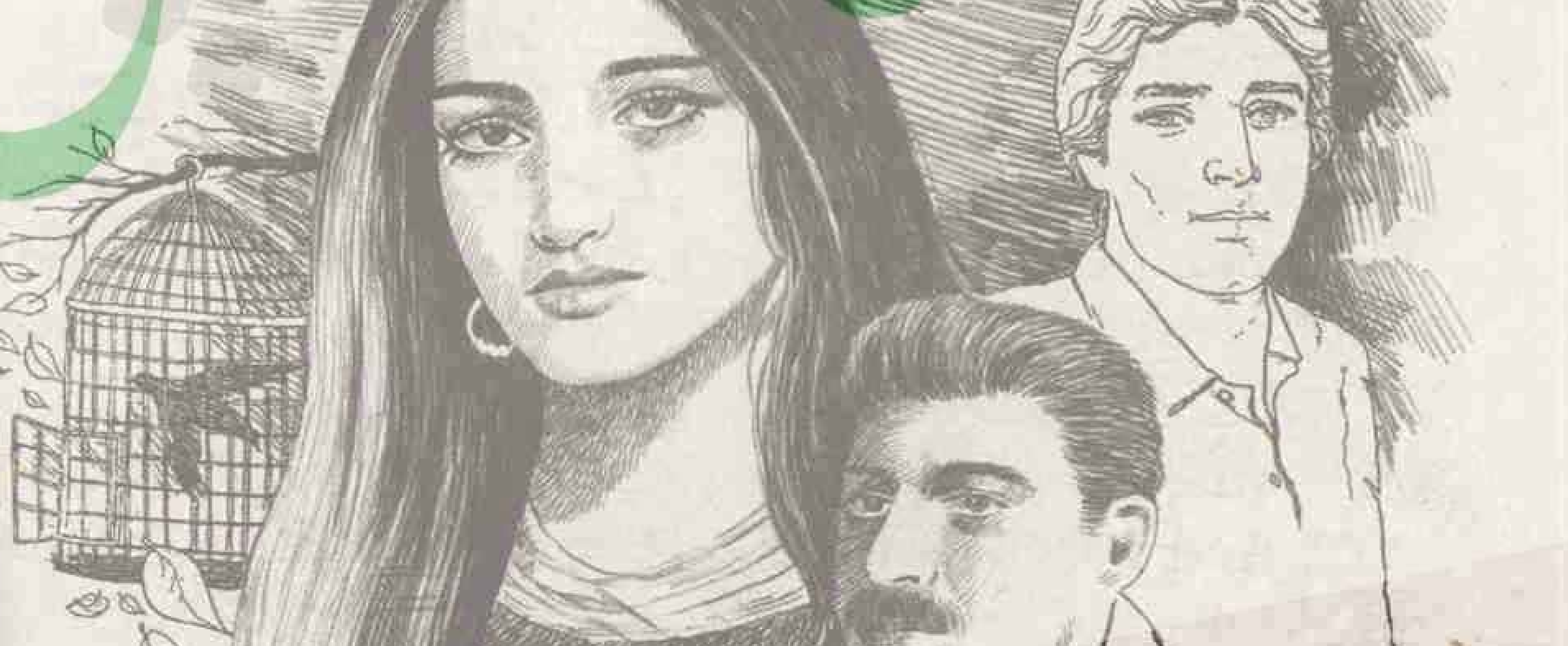
شیریں حیدر

قسط 9

تم نا حق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہئیے تھا- تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی- عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں- بد قسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آ جاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے- غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے-

آئیں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے اس تعلق میں کون کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مرادنگر نامی گاؤں میں تقسیم ہندوستان سے قبل ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ اکٹھے رہتے تھے، جس طرح پاکستان کے باقی سب حصوں میں تھے۔ چوہدری مرادعلی اور نور علی دو بھائی تھے، جن کے دادا کے نام پر اس گاؤں کا نام رکھا گیا تھا۔ فطرتاً دونوں بھائی بالکل مختلف ہیں، مرادعلی شریف النفس اور نور علی عیاش طبع۔ مرادعلی کی بیوی عابدہ اور تین بیٹے جہانگیر، شجاع اور شیر علی ہیں۔ شجاع عادات میں اپنے چچا پر ہے حتیٰ کہ ایک رات اپنی بھابی رابعہ کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے، مرادعلی بیٹوں میں فساد پڑ جانے کے باعث رابعہ کو یہ بات جہانگیر سے چھپانے کو کہتے ہیں اور جہانگیر، رابعہ اور شیر علی کو شہر منتقل کر دیتے ہیں۔ شہر جا کر رابعہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوتی ہے جس کا نام عمران رکھا جاتا ہے۔ نور علی کی بدمزاج بیوی شکیلہ ہے اور بیٹے اکبر اور بابر ہیں۔ نور علی کا بڑا بیٹا اکبر علی ہے جس کے ہاں دو بیٹیوں کے بعد دو جڑواں بیٹیوں کی ولادت ہوتی ہے تو اس کی ماں شکیلہ بیگم، ان بچیوں کے قتل کا حکم ملازماؤں کو صادر کرتی ہے۔ معراج، چوہدری مرادعلی کے مرحوم منشی قائم علی کی بیوہ۔ منشی قائم علی چند برس پہلے اپنے گاؤں خوشحال نگر سے اسی گاؤں میں آ گیا تھا۔ معراج جس نے نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی، گاؤں میں عورتوں کے لیے ڈسپنسری بنائی اور اپنے تجربے سے ان کی مدد کرنے لگی۔ زرتاج سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹی ماہ تاج کسی درندے کی زیادتی کا شکار ہوگئی اور چھوٹی دو جو کہ جڑواں تھیں، گم ہوگئیں۔ بچیوں کی گمشدگی کو معراج کی غفلت جان کر قائم علی نے اس کو شہر بھیج دیا۔ قائم علی سکون کی تلاش میں ایک کوٹھے پر جا پہنچا۔ ماہ تاج سے زیادتی کرنے والا سہیل ایک آوارہ اور بدکردار نوجوان ہے جو ماں باپ کے باہمی اختلافات کے باعث ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اس نے اپنے ساتھ زبردستی اپنے دوست سلیم کو شریک جرم کر لیا۔ سہیل کا باپ اسلم کردار کا کمزور آدمی ہے۔ قائم علی کی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک، جہاں آرا نامی طوائف کے ہاتھ لگتی ہے جس کے پاس اس سے قبل ہر عمر کی چھ لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں۔ الماس سب سے بڑی ہے اور اس کا نام فیروزہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں آرا کا اپنا سگا بیٹا، دلاور ہے، جسے عرف عام میں دلی کہتے ہیں۔ جہاں آرا اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی ہے۔ مریم ایک استانی ہے، جس کا آگا پیچھا اس کے محلے میں کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی ایک دور پار کی رشتہ دار سائرہ ہے، جس کے ہاں وہ پشاور جاتی ہے تو واپسی پر ایک گمنام، چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے لیٹرین میں ایک بچی اسے بے ہوش ملتی ہے، یہی قائم علی کی دوسری بیٹی ہے۔ اپنی ملازمہ جینا کو وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی کزن سائرہ نے اسے یہ بیٹی دے دی ہے۔ یوں قائم علی کی بیٹیاں، حسن آرا، ستارہ بن کر مریم کے گھر میں اور نین تارا، فیروزہ بن کر جہاں آرا کے گھر میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ زرتاج جب چوہدرانی شکیلہ کا حکم سنتی ہے تو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں خبر آتی ہے کہ چوہدری اکبر علی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ پیدا ہونے والی بچیوں میں سے ایک تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے اور اکبر علی کی بیوی فاخرہ کی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ زرتاج بے اختیاری میں اس بچی کو اٹھا کر شاکر کے پاس جاتی ہے۔ شاکر گاؤں کا نوجوان سنار ہے اور اس کی بات زرتاج سے تقریباً طے ہے۔ زرتاج شاکر سے کہتی ہے کہ اس بچی کو چھپا لے۔ زرتاج کے علم میں لائے بغیر وہ نور کے تڑکے اس بچی اور اپنا سارا سونا وغیرہ لے کر گاؤں سے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں بس میں اس کی ملاقات ناہید نامی ایک نوجوان خاتون سے ہوتی ہے۔ اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس شہر جا رہی ہے۔ بس میں وہ بچی کو سنبھال لیتی ہے اور جب شاکر بس سے اتر کر کچھ لینے کو باہر جاتا ہے تو واپسی پر وہ لڑکی غائب ہوتی ہے۔ بی بی جی گاؤں کی بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کا بیٹا عباس اور بیٹی کلثوم...... دو ہی اولادیں ہیں۔ عباس ہندو گھرانے کی ایک لڑکی سے دوستی قائم کر لیتا ہے۔ عباس، دیا کو لے کر بھاگ جاتا ہے تو پنچایت کے فیصلے کلثوم کی شادی ہندوؤں کے نوکر گھوٹو سے کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی رات کلثوم کی سہیلی کاجل خودکشی کر لیتی ہے کیونکہ وہ دیا کے بھائی شیکھر کی منگیتر ہے اور گھر والوں کو شک ہے کہ کاجل دیا کی شریک راز تھی، حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی رات کی سحر کو بی بی جی فجر کی نماز پڑھتے ہوئے ایسی سجدے میں گئیں کہ اٹھ ہی نہ سکیں۔ کلثوم بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ سہیل کے فیل ہونے پر اس کا باپ اسے برا بھلا کہتا ہے۔ فاخرہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیا نے اسلام قبول کر کے عباس سے شادی کر لی۔ اس کا نام زہرہ ہے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ شجاع کے آدمی معراج کے گھر میں گھس کر زرتاج کو لے جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ موجی، قائم علی سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے اور دوسری طرف الماس قائم سے شادی پر زور دیتی ہے۔ ناہید کو اس کا شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ کلثوم ماں بننے والی ہے لیکن گھوٹو یعنی جہانداد نہیں چاہتا کیونکہ اگر کلثوم ماں بن گئی تو اس کو کام کرنا پڑے گا۔ اکبر علی کی ملاقات رانی سے ڈیرے پر ہوتی ہے اور وہ اس کو دوبارہ آنے کے لیے کہتا ہے۔ رانی نگی سے کہتی ہے تو نگی جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ رابعہ حویلی آتی ہے تو عمران کی پیدائش کی خوشی میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے، زرتاج وہاں فیضی کو دیکھ کر رابعہ سے اس کے بارے میں پوچھتی ہے۔ ناہید کی بیٹی اور شاکر کی بیٹی کا نام سیما اور ربیعہ رکھا جاتا ہے، ناہید کو انور طلاق دے دیتا ہے۔ سہیل کو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اس کے ذہن سے سلیم کا تصور محو نہیں ہوتا۔ رابعہ شہر آ کر جہانگیر کو شجاع کی حرکت کے بارے میں بتاتی ہے جس پر جہانگیر غصہ کرتا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

شام کو کلثوم لوٹی تو کام کاج کرنے کے باعث نڈھال سی ہو رہی تھی، دن بھر اس کی کیفیت متلی والی رہی تھی اگرچہ چوہدرانی نے کہا بھی کہ وہ کام چھوڑ دے اور آرام کرے یا گھر لوٹ جائے۔ اسے عادت ہی نہ تھی کہ وہ یوں کام کیے بغیر ان کے ہاں سے روٹی لے کر واپس جائے، اس کی غیرت کو یہ کب گوارا تھا...... وہ تھکی ہوئی لوٹی بھی ہولے ہولے کام کرتی رہی اور شام کو لوٹی تو دل میں اس بات پر خوش تھی کہ جس طرح جہانداد نے وعدہ کیا ہے وہ کل سے اسی طرح کام پر جائے گا، اسی لیے اسے اس روز کی تھکن گوارا تھی۔

''کیا لائی ہو آج کھانے کے لیے؟'' جہانداد نے اتنی نرمی سے پوچھا کہ وہ حیران ہی رہ گئی۔

''ابھی دیتی ہوں کھانا، ذرا سی دیر آرام کر لوں......'' اس نے چارپائی پر لیٹ کر ٹیک لگائی۔

''تم لیٹ جاؤ، میں خود ہی کھا لیتا ہوں......'' اس نے تو جیسے کلثوم کو حیران کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

''گھور کیوں رہی ہو، کیا میرے ماتھے پر سینگ نکل آئے ہیں؟'' وہ ہشیاری سے ہنسا۔ کلثوم واقعی اسے اسی طرح گھور رہی تھی جیسے اس کے سر پر سینگ ہی نکل آئے ہوں۔ وہ اٹھا اور اس کا لایا ہوا کھانا گرم کرنے لگا، کھانا لے کر وہ اس کی چارپائی پر آ بیٹھا۔

''اٹھو تم بھی تھوڑا سا کھا لو......'' اسے بھوک تو تھی مگر اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت نہ تھی۔

''تم کھاؤ، میں تھوڑی دیر میں کھاتی ہوں!'' اس نے سوچا کہ معراج بی بی کی دی ہوئی تھوڑی سی دوا لے کر کھائے گی۔ ''مجھے تھوڑا سا اچار اور روٹی دے دینا، اپنا کھانا کھانے کے بعد......''

''اچار اس وقت کھاؤ گی تو وہ بچے کے لیے نقصان دہ ہوگا......'' اس نے اسے یوں کہا جیسے اسے اس بچے کی بہت خوشی ہو۔ ''ٹھہرو! میں تمہارے لیے دوا لے کر آیا ہوں، وہ لے لو گی تو طبیعت سنبھل جائے گی......'' اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دوا کی تین پڑیاں نکالیں۔ ''بڑی قابل دائی ہے، علی پور کی...... اسی سے لے کر آیا ہوں، تین خوراکیں ہیں، انہیں گرم دودھ میں ڈال کر تین پہر پی لینا، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا!'' مسئلہ تو وہ اپنا حل کرنے کے لیے یہ دوا لایا تھا اور اسے بہلاوا دے رہا تھا جیسے اسے کلثوم کی بڑی فکر ہو مگر کلثوم کم عمر اور معصوم تو تھی، بے وقوف نہ تھی، کچھ اندازہ اسے حویلی جانے سے اور ملازماؤں کی رازداری کی باتیں سننے سے ہو گیا تھا اور پھر ماں بننے کی خبر نے اسے ایک نئی طاقت اور سوچ عطا کر دی تھی۔

''مجھے دے دو دوا......'' کلثوم نے اسے محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ اسے اس کی نیت پر شک ہے۔ ''میں تھوڑی دیر میں لے لوں گی!''

''ارے، تم سے تو اٹھا بھی نہیں جا رہا......'' اس نے دوا کی پڑیاں اپنی جیب میں واپس رکھ لیں۔ ''ٹھہرو، میں تمہارے لیے خود ہی دودھ گرم کر کے لے آتا ہوں اور دوا اپنی نگرانی میں پلاتا ہوں!'' وہ اٹھا تو کلثوم کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا یقیناً وہ یہ دوا کسی خاص مقصد سے لایا تھا۔ معراج بی بی نے تو اسے بتایا تھا کہ وہ گرم چیزیں نہ کھائے پیے اور یہ کون سی دائی تھی جو اسے دوا گرم دودھ کے ساتھ کھانے کا مشورہ دے رہی تھی...... اور پھر جب گاؤں میں ایسی دائی موجود تھی جس کو اردگرد کے سات دیہات کے لوگ سب سے قابل سمجھتے تھے تو پھر جہانداد کیوں دس کوس کے فاصلے سے وہ دوا لے کر آیا تھا...... وہ جتنا سوچتی جا رہی تھی، اتنا ہی اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اب تو وہ پاس بیٹھ کر زبردستی پلائے گا بھی اور اگر وہ انکار کر دے تو کہیں اس کا گلا ہی غصے میں آ کر نہ دبا

دے...... وہ سوچ رہی تھی اور جب تک جہانداد دودھ لے کر پہنچتا، اسے ترکیب سوجھ چکی تھی۔

''میں ذرا کلی کر آؤں......'' اس کے آتے ہی وہ اٹھی اور صحن کے کونے میں بنے ہوئے غسل خانے نما احاطے میں چلی گئی، اس کی طبیعت مالش کر رہی تھی۔ دانستہ طور پر اس نے کافی دیر غسل خانے میں لگائی تا کہ دودھ بھی ذرا ٹھنڈا ہو جائے...... دل ہی دل میں اسے جتنی قرآنی دعائیں اور آیتیں یاد تھیں وہ پڑھتی رہی، اپنے گلے میں اس نے انگلی ماری تا کہ اسے الٹی آجائے، ابھی تک تو اس نے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ اس کی طبیعت اور بھی متلانے والی ہوگئی، واپس آئی تو جہانداد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''چلو شاباش...... اب ذرا چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ لو تا کہ طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے......'' اس نے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کلثوم کو لگا کہ اس نے زہر کا پیالہ ہاتھ میں تھام رکھا ہو، اس نے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگی۔ شوہر کا یہ التفات اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، اس نے کبھی اس سے نرمی اور شفقت سے بات کی تھی نہ بغیر گالی کے اور اب وہ بے وقوف مصنوعی محبت جتا کر اس سے اپنی بات منوانا چاہتا تھا، وہ محبت جسے کلثوم ہمیشہ ترستی رہی تھی، وہ تو کیا کوئی انجان شخص بھی دیکھتا تو جان جاتا کہ وہ سراسر ڈراما کر رہا تھا۔ اس نے گلاس اپنے منہ کے ساتھ لگایا، انتہائی ناگوار سی بو تھی، اس نے گلاس منہ سے ہٹا دیا۔

''کیسی دوا ہے یہ؟ اس میں تو عجیب سی بو ہے......''

''دوا تو اسی طرح ہوتی ہے نا...... میں نے تمہیں کون سا گلاب کا شربت دیا ہے، دوا ہے نا!'' جہانداد نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تھوڑی سی چینی ڈال دو اس میں......'' اس نے پھر وقت کو ٹالنا چاہا۔

''چینی ڈالی ہے میں نے......'' جہانداد کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی خفگی لیے ہوئے تھا۔ ''دوا پیتے ہوئے اتنے نخرے کرو گی تو ٹھیک کیسے ہوگی!'' اس نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک بڑا سا گھونٹ بھرا، ایسا کرتے ہوئے اسے جہانداد کے چہرے پر جو مکروہ مسکراہٹ نظر آئی اس نے اس کا رہا سہا شک بھی ختم کر دیا۔

''شاباش!'' اس نے اس دودھ کو حلق سے بھی نہ اتارا اور واپس اگل دیا، پیٹ پکڑ کر دوہری ہوگئی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گلاس بھی چھوٹ کر نیچے گر گیا، سارا دودھ صحن کے فرش پر پھیل گیا۔

وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے صحن کے نل تک پہنچی اور زور زور سے ابکائیاں لینے لگی، کچھ ہوتا پیٹ میں تو نکلتا، ابکائیاں لے لے کر وہ نڈھال ہوگئی اور وہیں فرش پر ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ گئی۔ جہانداد کو طیش تو بہت آیا مگر اس وقت غصے کا اظہار کر کے وہ بنا بنایا کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک پڑیا تو وہ دوبارہ خرید سکتا تھا، اسے ڈانٹ کر شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کلثوم کامیاب رہی تھی، اس نے جہانداد کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ اسے اس کی سازش کا علم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نگی کو تو اس رات نیند ہی نہیں آرہی تھی...... اسے اپنی سہیلی کی بے وقوفی اور اپنے جنون میں اس حد تک چلے جانے کا تو اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ اور رانی دونوں جانتی تھیں کہ اس گاؤں کے چوہدریوں کے کردار کے بارے میں لوگ کیسی باتیں کرتے ہیں مگر رانی تو جانے کن اندھی راہوں کی مسافر بن گئی تھی کہ اسے علم ہی نہ تھا

کہ وہ کس کنویں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رانی کی ماں گھر پر رہنے والی عورت...... اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ گھروں سے باہر مجبوری کی حالت میں نکلنے والی لڑکیوں کے لیے کیسے کیسے عفریت منہ کھولے منتظر ہوتے ہیں۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ رانی کی ماں کو سب کچھ بتا کر اسے کہے گی کہ وہ اس کے اندھیروں کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لے۔ اسے معلوم تھا کہ ان خوب صورت چہروں کی نقابوں کے پیچھے کیسے کیسے بھیانک روپ چھپے ہیں اور اسے بھی کیسے اندازہ ہوتا اگر اس روز وہ غلطی سے اکیلی گھر سے نکل کر گاؤں کی طرف نہ جاتی۔

ویرانی سی ویرانی تھی اس روز گاؤں کی گلیوں میں، دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا، جانے کیا وجہ تھی...... وہ گاؤں سے آدھا میل دور تھی، جب اس کے عقب سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز قریب آئی اور پھر رک گئی، اس نے قدرتی ردِعمل کے طور پر مڑ کر دیکھا...... وہ جو کوئی بھی تھا خوب صورت تو تھا مگر اس کے منہ سے اسے لگا کہ رال ٹپک رہی ہو۔ اتنی دوپہر میں، ایک اکیلی لڑکی، آس پاس کوئی نہ ہو...... اس کے لیے تو شکار کا بہترین موقع تھا۔ نگی کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا تو وہ ایک بے بس ہرنی کی طرح اندر سے کانپنے لگی مگر اس نے اپنی کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی تا کہ وہ گزر جائے۔

''ہٹ کیوں گئے سوہنیو؟'' اس نے مکروہ سی ہنسی ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''کس سے بات کر رہے ہو تم؟'' اس نے مڑ کر دیکھ کر یوں اداکاری کی جیسے اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہو اور وہ اس سے بات کر رہا ہو۔

''تمہارے سوا اور کس سے بات کروں گا؟'' اس نے اسی دل لگی سے کہا۔

''کیوں، تم میرے بھائی ہو جو مجھ سے بات کرو گے؟'' نگی نے چتون چڑھا کر کہا، وہ کمزور پڑ کر بے بس نہیں ہونا چاہتی تھی اور یوں بھی اسے کچھ نہ کچھ بہادری تو دکھانا تھی ورنہ وہ اسے آسانی سے ہضم کر لیتا۔

''واہ بھئی واہ......'' وہ بولا۔ ''بڑی اکڑ ہے تجھ میں، جانتی نہیں کہ تو کس سے بات کر رہی ہے، چوہدری شجاع کے نام سے تو اردگرد کے دس دیہات میں درختوں کے پتے بھی کانپتے ہیں، لوگ تو ڈرتے ہیں میرے نام سے اور تو......''

''میں صرف کتوں سے ڈرتی ہوں!'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''بندہ کوئی ایسا آج تک نہیں ہے جس سے مجھے ڈر لگا ہو......''

''بڑی زبان چلتی ہے تیری......'' اس نے دانت پیسے۔ ''تیری اکڑ توڑنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!''

''مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو پھر اپنے ہاتھ نہ تڑوا بیٹھنا!'' اس نے اللہ کے آسرے پر اسے تڑی دی۔

''میں دیکھتا ہوں کہ تو میرے ہاتھ کس طرح توڑتی ہے......'' اس نے گھوڑے سے اتر کر اسے ایک طرف کھڑا کیا اور خود اس کی طرف بڑھا، خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ بجائے واپس جانے کے گاؤں کی طرف تیزی سے بھاگی، شجاع کو تو اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ اچانک بھاگنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس نے کچھ سوچا اور بجائے بھاگ کر اس کا پیچھا کرنے کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے جا کر یہ جاننے کا فیصلہ کیا کہ ایسی جی دار لڑکی گاؤں میں ہے کس کی۔ وہ پلٹ کر چند قدم چل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کے پیچھے گھوڑے کو ایڑ لگا

دی۔

گاؤں کی چوڑی گلی میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پوری گلی خالی پڑی تھی اور وہ جو چند لمحے قبل بھاگ کر اس گلی میں داخل ہوئی تھی اسے جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نے نگل لیا تھا...... اپنے ہاتھ سے یوں شکار چھوٹ جانے پر اس کی سٹپٹاہٹ دیدنی تھی۔

☆☆☆

اس رات...... تمام رات، اسے ٹوٹے پھوٹے خواب آتے رہے اور اس دن کی یاد آتی رہی جس دن وہ بہ مشکل اپنی جان اور عزت اس بدنیت چوہدری کے ہاتھ سے بچا کر نکلی تھی۔ گلی کی طرف تو وہ یہ سوچ کر بھاگی تھی کہ وہاں وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو متوجہ کر سکے گی مگر جونہی وہ گلی میں داخل ہوئی اسے اپنے پیچھے چند لمحوں کے بعد گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اسے اچانک ہی ایک دروازہ کھلتا نظر آیا اور اس سے پہلے کہ وہاں سے کوئی باہر نکلتا، اس نے بھاگ کر اس گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

''کون ہو تم لڑکی؟'' اس مرد نے حیران ہو کر پوچھا جو دروازہ کھول کر باہر نکلنے والا تھا۔

''میں کسی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں، وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، بس آپ چند منٹ کے لیے مجھے پناہ دے دیں......'' اس نے فریاد کی۔

''کون ہے وہ...... اور اس وقت دن دیہاڑے کس طرح وہ......؟''

''میں نہیں جانتی کہ وہ کیوں اس طرح دن دیہاڑے میرے پیچھے پڑا ہے!''

''ٹھہرو، دروازہ کھول کر مجھے باہر جا کر دیکھنے دو کہ کون ہے، میں اس کا بندوبست کرتا ہوں......'' اس آدمی نے کہا۔ ''تم اندر چل کر بیٹھو...... وہاں میرے بچے ہیں، تمہیں میرے گھر کے اندر سے تو کوئی مائی کا لال نہیں لے کر جا سکتا!'' اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا۔

''نہیں نہیں...... دروازہ نہ کھولیں، وہ خود ہی چلا جائے گا!'' اس نے اسے روکا۔ ''آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔''

''ابھی تو تم نے کہا کہ تم اس آدمی کو نہیں جانتیں؟''

''میں نے غلط نہیں کہا......'' اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں صاف نظر آ رہی تھی۔

''میں نے غلط نہیں کہا مگر اس نے اپنا تعارف خود کو چوہدری شجاع کہہ کر کروایا تھا...... اور چوہدری شجاع کو کوئی جانتا ہو یا نہیں...... اس کے کارناموں کو بہت سے لوگ جانتے ہیں، کسی غریب کی بیٹی کو انسان نہیں سمجھتے یہ لوگ!'' اس عمر کی لڑکی کے منہ سے ایسی گہری بات سن کر وہ فقط اسے دیکھ کر رہ گیا۔

ایک گہری خاموشی پورے ماحول پر چھا گئی تھی، گلی میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہولے ہولے نزدیک آ کر دور جاتی معلوم ہوئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی...... اس نے اپنی رکی ہوئی سانسیں بحال کیں اور اس آدمی کا شکریہ ادا کر کے دروازہ کھول کر گلی میں جھانکا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا، اس نے باہر نکلنے کو قدم بڑھائے۔

''ٹھہرو...... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اکیلے باہر مت نکلو، ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں کہیں گلی کے آخر میں چھپا بیٹھا ہو اور تمہیں اکیلے دیکھ کر......''

''میں چلی جاؤں گی اور یوں لڑکیوں کا پیچھا کرنے والے گلیوں کے آوارہ کتے اتنے بہادر نہیں ہوتے۔'' اس نے کہا۔

''بدقسمتی ہے چوہدری مراد علی کی کہ جس کے ہاں شجاع جیسا آوارہ بیٹا پیدا ہوا، باپ بے چارہ تو انتہائی شریف آدمی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''نیکوں کے گھر بد اور بدوں کے گھر نیک پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں......''

''بہت شکریہ آپ کا، میں چلتی ہوں!''

''چلو...... میں بھی گھر سے نکل ہی رہا تھا!'' اس نے کہا اور دروازہ کھول کر اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔ ''جہاں تک ہمارا ساتھ ہے وہاں تک میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں بیٹا...... اس کے بعد تم اپنی راہ پر چلی جانا!'' وہ دونوں آگے پیچھے نکلے...... نگی کی منزل اپنا گھر تھا، گاؤں کے آخری سرے تک وہ آدمی اس کے ہمراہ رہا اور باقی فاصلہ نگی نے تقریباً بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔

☆☆☆

اچار کے ساتھ رات کی سوکھی روٹی کا ناشتا حلق سے چائے کے ساتھ اتارتے ہوئے بھی نگی مسلسل رانی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ رانی کو اپنے ساتھ پیش آنے والے اس دن کے واقعے کا بھی بتائے گی اور اسے اس کے چوہدری اکبر علی سے ملنے کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی...... اگر اس نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اس کی ماں سے کھیتوں سے واپسی پر بات کرے گی۔

ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکلی، اب وہ گھر سے نکلتے وقت بھی محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ لیتی تھی کہ کوئی شکاری گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو۔ اسے تو اس روز کے واقعے کے بعد سبق حاصل ہو گیا تھا کہ اس کے بعد اکیلے کام پر نہیں جانا، اسی لیے وہ گھر سے نکلی تو یہی مقصد تھا کہ وہ اور رانی اکٹھے چلی جائیں گی۔ جب سے نگی نے رانی کو منع کیا تھا چوہدری اکبر علی سے ملنے سے تب سے رانی اس سے بگڑی سی تھی۔ اب اسے اس کو منانا ہی تھا کہ رانی کا نخرہ بھی تھا، حسن ہو تو نخرہ بھی آ ہی جاتا ہے...... یوں بھی نگی کا مزاج صلح جو تھا۔

"بڑے دنوں کے بعد آئی ہو آج نگی تم تو......" رانی کی ماں سکھاں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہو گئی ہے؟"

"بس خالہ! کچھ خاص مصروفیت تو نہیں مگر گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہی دن گزر جاتا ہے!" اس نے شرمندگی سے وضاحت دی، کہاں تو وہ ہر وقت ایک دوسرے کے گھروں میں گھسی رہتی تھیں اور کہاں ذرا سی ناراضی کے باعث کئی دن سے وہ آپس میں ملنا بھی چھوڑے بیٹھی تھیں۔

"بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں!" رانی نے باہر نکلتے ہی طنز کرنا ضروری سمجھا۔

"چھوٹے لوگ نہ آئیں تو پھر بڑوں کو ہی آنا پڑتا ہے......" نگی نے بھی اس کے طنز کے جواب میں طنز کیا۔

"جواب تمہارے پاس گھڑے گھڑائے ہوتے ہیں!" رانی کے لہجے میں خفگی تھی۔

"کیا بات ہے، تم سہیلیاں ناراض لگ رہی ہو ایک دوسرے سے؟" سکھاں نے ان دونوں کے مابین تناؤ کو محسوس کیا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کچھ نہیں خالہ...... تمہیں تو پتا ہی ہے کہ اس کا مزاج کیسا ہے، لمحے میں دماغ گرم ہو جاتا ہے!" نگی نے فوراً کہا۔ رانی خاموش رہی، سکھاں نے نگی کو چائے کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ گھر سے ناشتا کر کے نکلی تھی اور رانی کو کام پر ساتھ لے کر جانے کے لیے آئی تھی۔

"تم جاؤ......" رانی نے روکھے پن سے کہا۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے!"

"کیا ہوا تمہیں، دیکھنے میں تو ٹھیک لگ رہی ہو؟" نگی نے حیرت سے پوچھا۔

"ضروری تو نہیں کہ تمہیں نظر آئے کہ مجھے کیا ہوا ہے......" رانی کے انداز میں بے پروائی تھی۔

"تم کہہ رہی ہو نگی کہ کوئی بات نہیں ہے اور اس کا مزاج تو آسمان پر پہنچا ہوا ہے!" رانی کی ماں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں خالہ، سہیلیوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے......" نگی نے پھر بھی نرمی سے کہا ورنہ رانی کا مزاج دیکھ کر تو اس کو اپنی صاف بے عزتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صلح کا پرچم لہرانے کے بجائے اٹھ کر چلی جائے مگر یہی اس میں اچھی بات تھی کہ وہ فوری ردِعمل کا اظہار نہیں کرتی تھی۔

"مجھے نہیں جانا آج کام پر، میں گھر پر ہی آرام کرنا چاہتی ہوں!" اس نے بے نیازی سے کہا تو نگی نے اجازت لی اور چل دی، باہر نکلنے تک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں، اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے اور سوچ میں پڑ گئی کہ اکیلے چلی جائے یا کہ نہیں...... آخر اس نے واپس مڑ جانے کا فیصلہ کیا اور گھر کی طرف چل دی۔

"کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟" سکھاں نے رانی کے روکھے انداز کو بھی محسوس کیا تھا اور نگی کی آنکھوں میں وہ آنسو بھی دیکھے تھے جنہیں روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا مگر اس سے کچھ کہہ کر اس نے اسے شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"بس میرا جی نہیں چاہ رہا تھا اس کے ساتھ جانے کو......" اس نے رکھائی سے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سکھاں کو برا تو لگا مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ ان دونوں کے بیچ کچھ ہوا ہے اور وقت گزرے گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ اپنے معمول کے کام کر رہی تھی کہ اس نے رانی کو باہر آتے دیکھا، اس نے صاف ستھرا جوڑا پہن رکھا تھا اور آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں خوب بھر بھر کر لگا رکھی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہو تم یوں بن ٹھن کر؟" اس نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

"کھیتوں میں کام پر...... اور کہاں!" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"کھیتوں میں کام کے لیے یوں جاتے ہیں؟" سکھاں نے کہا۔ "میں تو سمجھی کہ کسی کے بیاہ پر جا رہی ہو۔"

"کس کے بیاہ پر جاؤں گی میں اکیلے......" اس نے دوبدو جواب دیا۔ "ذرا سا منہ دھو لیا تو کیا بیاہ پر جانے والا حلیہ ہو گیا ہے میرا......" سکھاں تو نظر بھر کر اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی، جانتی تھی کہ وہ ایسی ہی تھی، ذرا سا منہ بھی صابن سے مل کر دھو لیتی تو اس کے چہرے پر گلابیاں چھلکنے لگتیں۔

"زیادہ بک بک نہ کر میرے ساتھ اور اپنا منہ دھو کر کام پر جا، کوٹھے والیوں کی طرح آنکھوں میں سرمہ انڈیل رکھا ہے تو نے......" سکھاں نے سختی سے کہا تو اس نے ماں کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا...... اس کی نظر میں کیا تھا، سکھاں کو سمجھ میں نہ آیا، وہ پاؤں پٹختے ہوئے اندر کمرے میں گئی اور واپس لوٹی تو اس کی

آنکھوں سے سرمہ غائب تھا مگر سکھاں کو کیا معلوم کہ سرمہ دانی اس نے اپنے پاس چھپا رکھی تھی۔

سکھاں نے اس کی طرف دیکھ کر مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا، اسے لگا کہ جوان بچی ہے کہیں پلٹ کر جواب دے دے تو رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکلی تو اس کا رخ کھیتوں کے بجائے چوہدری اکبر علی کے ڈیرے کی طرف تھا...... اس دن کا اس سے وعدہ جو کر رکھا تھا، راستے میں رک کر اپنی سہمی ہوئی ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیر کر اس نے سرمے دانی کو پھر چھپا لیا تھا، اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی...... اس کی چال میں انوکھا سا غرور تھا۔

☆☆☆

جہاں آرا نے اپنا ٹھکانا بدلنے کے بجائے دلاور کو کسی دوسرے اسکول میں داخل کروا کر اسے ہاسٹل میں رکھنے کا سوچا اور اس سے بات کی تو وہ بپھر گیا، ماں سے دور تو وہ ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا، منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

''میں نہیں کہیں بھی جانے والا...... ان کو بھیج دو اماں، وہ سات ہیں، ان میں سے ایک چلی جائے گی تو کوئی فرق نہیں پڑنے والا، میں تو ایک ہی ایک بیٹا ہوں تمہارا اور گھر میں کسی مرد کا ہونا بہت ضروری ہے!'' اس کے کہنے پر ماں کو ٹوٹ کر اس پر پیار آیا اور اس نے بے ساختہ اس کا منہ چوم لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ قد کاٹھ میں ٹھیک تھا اور ایسا جوان نکل رہا تھا کہ اس پورے علاقے میں کوئی اس جیسا نہ تھا، جہاں آرا کے تصور میں اس کے باپ کا سراپا گھوم گیا، وہ بھی تو ایسا ہی تھا، خوب صورت اور جوان...... اس پر اس کے چہرے پر مستقل سی سوچ!

''میں کہاں بھیجنا چاہتی ہوں تمہیں کہیں میرے لال! مگر کچھ پانے کے لیے تو یہ جدائی عارضی ہے نا......!'' اس نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، اس کے باپ کی یاد نے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ کچھ تو تھا اس میں کہ جہاں آرا کے دل کا سکون اور قرار لٹ گیا تھا، وہ اپنا آپ بھلا بیٹھی اور اس پر لٹا بیٹھی تھی۔ زمانے بھر سے ٹکر لے کر اس سے بیاہ رچایا اور......

''اگر تم نہیں بھیجنا چاہتیں تو کیا تمہیں کوئی مجبور کر رہا ہے کہ مجھے بھیجو؟''

''ہاں، کر رہا ہے مجبور......'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہارے سہانے مستقبل کا خواب...... تمہارے لیے آنے والے بہتر وقت کا تصور، میں تمہیں بہت بلندی پر دیکھنا چاہتی ہوں دلاور......'' جب سے دلی نے بتایا تھا کہ گلی کے لڑکے ''دلی'' نام کی مناسبت سے اسے دلال کہتے تھے، تب سے اس نے اسے دلاور کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا اور اس کی ساری بہنوں کو بھی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اسے اس کے نام سے پکاریں۔ ان سب کو معلوم تو تھا کہ دلی ان کا بھائی نہیں مگر بچپن سے ساتھ تھا اور پھر جہاں آرا کا بیٹا تو تھا ہی نا، جس نے انہیں ماں بن کر ہی پالا تھا۔

''اماں یہ الماس اور روبی آج کل شام کو کہاں چلی جاتی ہیں؟'' اچانک دلاور کے ذہن میں سوال آیا تھا۔

''وہ...... وہ دونوں ٹیوشن پڑھنے جاتی ہیں، انگریزی بولنا سیکھ رہی ہیں!''

''کہاں ٹیوشن پڑھنے جاتی ہیں؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ ''کیا گھر پر کوئی انہیں پڑھانے کے لیے نہیں آ

سکتا؟''

''بیٹا گھر پر کوئی آئے یا وہ جا کر پڑھیں، بات تو ایک ہی ہے نا......'' جہاں آرا نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''مگر انہوں نے انگریزی پڑھ کر کیا کرنا ہے، کس سے بولنی ہے انگریزی انہوں نے؟'' اس نے بحث کی۔ ''اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی انہوں نے، گھر بیٹھے پانچ پانچ جماعتیں پڑھ کر سمجھا ہے کہ بڑا کارنامہ کر لیا ہے!''

''بس بیٹا، بڑی چاروں کے معاملے میں تو غفلت ہو گئی، کچھ اس وقت لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہ تھا مگر اب چھوٹیوں کو تو سوچ رہی ہوں کہ اسکول میں بھیج کر پڑھاؤں گی......'' اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''آج کل انگریزی بولنے کا بڑا رواج ہے بیٹا اور معاشرے میں ان لوگوں کی عزت کی جاتی ہے جن کو انگریزی بولنا آتی ہے!''

''اب یہ بڑی ہو گئی ہیں اماں، اب ان کے بیاہ کی فکر کریں...... انگریزی بول کر انہوں نے کیا کرنا ہے؟'' اس نے ماں سے یوں بحث کی جیسے وہ بہت عقل مند ہو گیا ہو اور اسے اپنی بہنوں کی بہت فکر ہو۔ جہاں آرا کو اس کا اس طرح بات کرنا بہت اچھا لگا اور اسی بحث میں اصل بات دلاور کے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔

دلاور کے جانے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک تو اس کے ذہن پر اسی خوشی کا خمار رہا کہ وہ جوان اور ذمے دار ہو گیا تھا۔ یہی اندازہ اس کی بات چیت سے ہو رہا تھا...... مگر اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی جب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے تو ہر بات کا مطلب اور اس کے در پردہ راز کی بابت پوچھے گا۔ بڑی دونوں لڑکیوں کو وہ بھجوا تو اس لیے رہی تھیں کہ وہ ماڈرن لڑکیوں کی طرح چلنا پھرنا، لباس پہننا اور انگریزی بول کر مخاطب کو متاثر کرنا سیکھ لیں کہ اب پرانے انداز میں پیشے کا رجحان گھٹتا جا رہا تھا۔ ان کے محلے سے آہستہ آہستہ لوگ ہجرت کر کے شہر کے ان علاقوں میں جا رہے تھے، جہاں متمول لوگ رہتے تھے اور وہاں ''کام'' کرنے کا انداز بھی جدا تھا۔

☆☆☆

کیسے بھول سکتی تھیں وہ دن......

''مجھے کیسے معلوم ہو کہ یہ بچہ......؟'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ مجھے کیسے یقین آئے کہ یہ بچہ میرا ہی ہے؟'' اس کا دل دھک سے رہ گیا اور اس نے شکوہ کناں نظر سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارے تو کئی خواہشمند اور کئی واقف کار ہوں گے......''

''اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں!'' اس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''تو پھر مجھے کیا علم کہ یہ بچہ ان میں سے کسی کا نہ ہو؟'' ان کے لہجے میں دنیا جہان کی فکر کا سا انداز تھا۔

''بڑا دکھ ہے مجھے کہ آپ کو آدمی کی پہچان کرنا ہی نہیں آتی!'' اس نے شکوہ کیا۔ ''جہاں آرا کے دل کی مسند پر آج تک کوئی براجمان ہوا نہ کسی کی اتنی مجال کہ وہ جہاں آرا کو چھوئے بھی، یہ اختیار جسے دیا، وہی ہم پر شک کرے...... بڑا دکھ ہوا مجھے کہ میں نے دل لگایا بھی تو کس کے ساتھ۔ جسے مجھ پر اعتبار ہی نہیں!''

''میں نے یہ تو نہیں کہا......'' وہ ذرا سا ہکلائے، جہاں آرا ناراض ہوں...... یہ کیسے کوئی برداشت کرتا، انہیں کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ جہاں آرا ان چھوئی کلی تھی، ابھی کم سن اور نادان بھی تھی جو اپنے پیشے کے اسرار و رموز بھی نہ سمجھتی تھی۔

''تو کیا کہا آپ نے، کیا جو کچھ میرے کانوں نے سنا وہ کسی اور بات کی بازگشت تھی؟'' اس نے منہ پھلا کر کہا۔

''اصل میں جہاں آرا...... میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں......''

''آپ شادی شدہ آدمی ہیں اور باپ بننے سے ڈر رہے ہیں، کچھ میرے بارے میں بھی سوچیں جو شادی شدہ بھی نہیں اور ماں بننے جارہی ہے......'' اس نے منہ پھلا کر کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ختم کردو اس قصے کو!'' انہوں نے صلاح دی۔

''یہ قصہ تو میں نہیں ختم کرنے والی، آپ میں اگر جرأت نہیں ہمیں اپنانے کی تو آج کے بعد اس در پر نہ آیئے گا!'' اس نے غصے سے کہا۔ ''ہم یہی سمجھیں گے کہ ہم ہی اس قابل نہ تھے......'' وہ ان خوب صورت آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی جن آنکھوں میں ڈوب کر کئی لوگوں کو اپنے غم بھول جایا کرتے تھے۔

''ہمیں سوچنے کا موقع دو......'' انہوں نے جہاں آرا کو دلاسا دیا، دل میں یہی سوچا کہ اگر وہ اس سے شادی کر بھی لیں تو کیا حرج ہے، آخر انہوں نے اس سے محبت بھی تو کی تھی، جسمانی تعلق بھی تو قائم کیا تھا۔ اس کے ہاں ان کی پیدا ہونے والی اولاد ان کے نام کے بغیر پیدا ہوئی تو وہ طوائف کی اولاد ہی کہلائے گی...... اور اگر وہ بیٹی ہوئی تو......! یہ اتنا بڑا سوال تھا جو اُن کی نیند اڑا دیتا تھا۔ انہیں جس بات کا شک تھا، اس کے متعلق تو وہ ان کو قرآن پر قسم دینے کو تیار تھی اور پھر انہوں نے خود بھی یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں دیکھا تھا۔

''آپ کو سوچنے کے لیے کتنا وقت چاہیے؟'' اس نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میں کل آؤں گا......'' کہہ کر وہ رکے نہیں...... اور اس کے بعد وہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں مگر وہ کل نہ آئی تھی، ماں کی مخالفت کے باوجود اس نے الماس کو جنم دیا اور جب وہ کئی مہینوں کے بعد آتے بھی تو ان کے پاس مجبوریوں کی داستانیں، خاندان کی مخالفت کے بہانے اور کیا کچھ تھا...... جہاں آرا نے ان سے پیار کیا تھا، ان کی مجبوریوں کو سچ مان کر اسے پھر اپنے دل کی مسند پر بٹھا لیا، وہ آتے رہے اور برسا برس تک اپنی مجبوریوں کے الاپ الاپتے رہے، یہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ان کی دکھوں بھری زندگی سے چند دنوں کا فرار فراہم کرتیں اور جب دلاور ان کی گود میں آیا تو الماس جوانی کے سن میں تھی اور اس کے علاوہ اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے انہوں نے جن لڑکیوں کو خرید کر زیرِ تربیت رکھا ہوا تھا، ان کی تعداد بھی برس کے برس بڑھتی رہی۔ سب کو وہ یہی بتاتیں کہ وہ ان کی اپنی بیٹیاں ہیں۔ الماس ان کا خاص مہرہ تھی اور باقی لڑکیاں ان کے خیال میں ان کی الماس کے لیے سہارا بنیں گی۔

اس کے بعد تو انہوں نے الماس کی تربیت میں جس سبق کو کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، وہ مردوں کی بے وفائی تھی مگر ان کی بدقسمتی نے الماس کے کام کے اولین سالوں میں ہی، جب وہ اس کے دام کھرے کرنے کا سوچ رہی تھیں، ان کے اہم ترین سبق کو بھلا کر نہ صرف ایک مرد پر اعتبار کیا تھا بلکہ اسے اپنا آپ بھی سونپ دیا تھا، اپنا آپ...... ایک ان چھوا وجود...... جو ایک طوائف کی سب سے بڑی دولت ہوتا ہے۔ جہاں آرا کو یہی دکھ مارے دیتے تھا کہ ان کی بیٹی نے انہیں وہ قیمت نہ وصولنے دی تھی جس کی وہ حقدار تھیں۔ انہوں نے کبھی اسکول کی شکل دیکھی ہوتی تو کبھی یہ سبق پڑھا ہوتا کہ تاریخ خود کو دُہراتی ہے۔ وہ تو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کو ان کی ماں نے تربیت ہی جس پیشے کی دی تھی انہوں نے وہی کیا مگر جس کام سے انہوں نے الماس کو دور رہنے کو کہا تھا، اس بے وقوف نے وہی کیا تھا۔

ان کے ہاں ہر رنگ کی لڑکیوں کے حوالے سے لوگوں کے مختلف مفروضے تھے، کچھ کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ انہوں نے الماس کو خود جنا تھا اور کچھ کا کہنا تھا کہ ان میں سے کئی ان کی اپنی تھیں، جو کوئی بھی اور جو کچھ بھی کہے، اس سے انہیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اچھی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنے پیشے کی استاد تھیں اور باقی سب کو ان کے مشوروں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، اسی لیے ان کے منہ پر کھل کر کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ دلاور ان کی لاکھ کوشش کے باوصف پڑھنے کے لیے کہیں نہ گیا اور گزرتے وقت کے ساتھ وہ خود بخود اسی رنگ میں رنگ گیا تھا، جو ایسی جگہوں پر پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والوں کے نصیب ہوتے ہیں۔

☆☆☆

''ارے، ارے...... رکیے صاحب، کہاں بھاگے جاتے ہیں؟'' سیڑھیوں پر ہی انہیں الماس کے بھائی دلاور نے روک لیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے لہجے میں نرمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی، اس شخص سے ان کی شروع سے ہی نہیں بنی تھی، انہیں زہر لگتا تھا اس کا صاف ہاتھ پھیلا کر قبل از وقت وصولی کرنے کا انداز...... پکا دلال لگتا تھا وہ۔

''اماں ملنا چاہتی ہیں جناب آپ سے......'' اس نے خباثت سے کہا تو قائم علی واپس مڑے۔ ''ارے وہاں نہیں، ہمارے ساتھ آئیں!'' وہ آگے آگے سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ بھی اس کی تقلید میں خاموشی سے سیڑھیاں اترنے لگے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ بائیں طرف چل پڑا، اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے وہ ان کے چوبارے سے بیس بائیس مکانات کے فاصلے پر جا کر رکے، ایک نیلے رنگ کے دروازے والا مکان تھا، جس کے دروازے پر دلی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ ایک لمحے کو قائم علی کو ڈر بھی لگا کہ وہ کسی سازش کا شکار نہ ہو جائیں۔

اگرچہ جہاں آرا ان کے آگے بچھ بچھ جاتی تھیں مگر جب سے یہ نئی صورتِ حال سامنے آئی تھی وہ اس سے بے اعتنائی سے پیش آتیں، ان کے خیال میں بے پروائی قائم علی کی طرف سے ہوئی تھی، وہ ایک جہاں دیدہ اور شادی شدہ شخص تھا۔ جس ہیرے کو وہ اپنی زندگی بھر کا اثاثہ سمجھ کر تراشتی آرہی تھیں اور اس کی ایسی دیکھ ریکھ کر رہی تھیں جیسے کوئی آبگینوں کی کرتا ہے...... وہ ایک عام سے آدمی کی بے پروائی کی نذر ہو گیا تھا۔ اپنی بیٹی کی جو قیمت وہ وصولنا چاہتی تھیں وہ دینا (ان کے خیال میں) قائم علی کے بس کا کام نہ تھا۔

حالانکہ اگر غیر جانبداری سے دیکھا جاتا تو وہ تو گاہک تھا، رقم دے کر سکون خریدنے آیا تھا کیونکہ وہ اتنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ جہاں آرا کی بیٹی ہی اگر اس پر مرمٹی تھی اور اپنا آپ اسے سونپ دیا تھا تو اس میں اس

کا کیا قصور تھا۔ اللہ نے اسے وجاہت تو دی تھی کہ ایک پڑھی لکھی لڑکی اس پر اس وقت بھی دل ہار بیٹھی تھی جب وہ چٹا ان پڑھ اور ایک چھوٹا سا کاروباری آدمی تھا۔

''یہاں کیوں لے کر آئے ہو تم مجھے؟'' دلی نے دستک دینا بند کی تو اس نے پوچھا۔

''ذرا صبر کر لیں جناب، دروازہ کھلے گا تو آپ کو خود ہی علم ہو جائے گا کہ یہاں پر کیوں آئے ہیں آپ!'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ دروازہ ایک جوان سی لڑکی نے کھولا، اسے دیکھ کر دلی نے سیٹی بجائی اور تصدیق کی کہ اماں پہنچ گئی ہے کہ نہیں...... اس نے بتایا کہ اماں اندر ہے اور انتظار کر رہی ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر ہٹ کر ان دونوں کو راستہ دیا اور خود ان کے اندر جانے کے بعد دروازہ بند کرنے لگی۔

''چلیں......'' اس نے اندرونی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ چلیں صاحب...... اماں اندر ہی ہے، میں ابھی آتا ہوں، مجھے ذرا اس کا ایک ادھار چکانا ہے!'' دلی نے اس لڑکی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا، وہ بھی اسی کی منتظر نظر آتی تھی، قائم علی نے منہ پھیر لیا۔ خود ایسی حرکتیں کرتا پھرتا تھا اور کسی اور کو دیکھ کر، خصوصاً دلی کو، اسے شدید غصہ آ رہا تھا، وہ وہیں کمر پھیر کر کھڑا رہا...... ان دونوں کی دبی دبی آواز میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دونوں اس کی موجودگی کا احساس رکھتے ہوئے بھی واہیات باتیں کر رہے تھے اور ان کی آواز بہت آسانی سے تو نہیں مگر اس تک پہنچ رہی تھی۔

''اگر تم مصروف ہو تو میں چلتا ہوں......'' اس نے کہا تو دلی چونکا جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکا ہو۔

''آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں؟''

''تو اور کہاں جاتا میں؟'' انہوں نے غصے سے دانت کچکچائے۔

''چلیے صاحب......'' اس نے بادلِ ناخواستہ اس لڑکی کو چھوڑا اور قائم علی کو اپنی ہمراہی میں لے کر اندر کی طرف چلا، وہ لڑکی بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہی تھی۔

''آئیں، آئیں جناب......'' جہاں آرا نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ ''آج تو بڑے دنوں کے بعد یوں آپ سے تنہائی میں ملاقات کا موقع ملا ہے......'' درست ہی تو کہہ رہی تھی وہ، شروع میں جب آنا شروع کیا تھا تو آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم علی ہمیشہ جہاں آرا کو سلام کر کے اس سے الماس سے ملنے کی اجازت طلب کرتا تھا مگر پھر ایسا وقت آ گیا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ سراپا انتظار دروازے پر ہی کھڑی ہوتی اور وہیں سے وہ اسے اپنے کمرے میں لے جاتی تھی، یہی ملاقاتیں اور کمرے میں طویل تنہائی کے مواقع وہ رنگ لائے تھے جنہوں نے نہ صرف انہیں بلکہ جہاں آرا کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔

☆☆☆

رانی جتنی بھی بے اعتنائی برتتی، نگی کی محبت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا تھا، وہ ایک سمجھدار لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ رانی کی عمر میں جنون ایسا ہی ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ کام پر بھی اس لیے نہیں گئی تھی کہ اکیلے جانے سے کترا گئی اور واپس لوٹ کر آئی تو سکون ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ رانی کے پاس جا کر کچھ وقت گزارے...... ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکلی کہ رانی بیمار ہے اور وہ اس کا پتا کرنے جا رہی ہے۔

راستے میں بھی وہ سوچتی رہی کہ رانی کو منا کر رہے گی چاہے اس میں اس کی کتنی ہی بے عزتی کیوں نہ ہوتی ہو، بھلا سہیلیوں، سہیلیوں کے بیچ میں کیا بے عزتی والی بات ہوتی ہے...... وہ خود ہی سوچ کر مسکرا دی۔ سوچوں میں راستہ کیسے کٹا، اسے اندازہ بھی نہ ہوا۔

''ہیں...... وہ تو تیرے پیچھے ہی تیرے جانے کے تھوڑی دیر بعد کام کے لیے نکل گئی تھی......'' رانی کی ماں نے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔

''مگر میں تو یہاں سے نکلی تو گھر ہی چلی گئی تھی، اکیلے کام پر جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا!'' اس نے بتایا۔

''مجھے رانی کے اکھڑے اکھڑے رویّے سے اندازہ تو ہو رہا تھا کہ تم دونوں سہیلیوں کے بیچ کوئی بات ہوئی ہے مگر مجھے دخل اندازی کرنا اور پوچھنا اچھا نہ لگا کہ جو بھی ہے تم دونوں خود ہی ٹھیک ہو جاؤ گی......'' سکھاں نے کہا۔ ''تمہارے جاتے ہی شاید اسے اپنی زیادتی کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ تمہارے پیچھے ہی تھوڑی دیر کے بعد نکل گئی تھی......''

''میں تو گئی ہی نہیں ماسی......'' اس نے ملال سے کہا۔ ''وہ بیچاری اکیلے ہی کام کر رہی ہو گی!''

''کافی دیر سے گئی ہوئی ہے، اب تو لوٹنے والی ہی ہو گی، تم اس کا انتظار کرو، میں اپنا کام کاج نمٹا لوں!'' سکھاں نے پرات میں آٹا ڈالا اور اسے گوندھنے لگی، نگی تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر اس کے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگے، اسے اپنی کیفیت کی خود بھی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ اگر وہ بیٹھ کر رانی کا انتظار کرتی تو وہ جانے کب آتی اور آتی بھی تو اس کا مزاج گرم ہوتا کیونکہ اسے اکیلے کام پر جانا پڑا تھا۔

''میں چلتی ہوں ماسی...... رانی کو آئندہ کام پر اکیلے نہ بھیجنا!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے، اکیلے وہ جاتی کب ہے، تیرے ساتھ کی وجہ سے چل پڑتی ہے ورنہ تجھے پتا ہے کہ کام کرنے سے اس کی جان جاتی ہے......'' سکھاں نے آٹا گوندھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جانے اگلے گھر جا کر کیا کرے گی؟'' اس نے ساتھ ہی اپنی تشویش کا اظہار کر دیا۔

''سب ٹھیک ہو جاتا ہے ماسی، جب سر پر پڑتی ہے تو اچھے اچھوں کے مزاج سیدھے ہو جاتے ہیں!'' وہ ہنسی۔

''تیرے لیے تو تیری ماسی کا بیٹا ہے نا نگی، پر اس کے جوڑ کا تو ذات برادری میں ہے ہی کوئی نہیں، جانے اس کے نصیب اسے کہاں لے جائیں گے......''

''اللہ سب سے بڑا ہے ماسی اور وہی ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے، اس کے لیے بھی اس نے کچھ بہت اچھا طے کر رکھا ہو گا......'' نگی نے خلوصِ دل سے کہا۔

''تو اسے جانتی تو ہے مگر اتنا نہیں جتنا میں اس کی ماں اس کو جانتی ہوں......'' سکھاں نے آٹا گوندھ کر رکھ دیا تھا اور اب نگی کے پاس آ بیٹھی تھی۔ ''اس کے اندر بغاوت کا بیج ہے، اسے اپنا ماحول پسند نہیں، گھر نہیں پسند...... غرض اسے جو کچھ میسر ہے اس پر وہ ناخوش ہے۔ اس کی خواہشات بہت بڑی بڑی ہیں، ان کا کوئی انت نہیں ہے!''

''زیادہ تو نہیں ماسی مگر اتنا جانتی ہوں کہ وہ ناخوش رہتی ہے، اس میں قناعت نہیں ہے، وہ بہت کچھ پانا چاہتی ہے جو ہم جیسی لڑکیوں کو عمر بھر نہیں ملتا...... '' نگی نے کہا۔ ''اس کے سپنے پورے کرنے کی طاقت شاید ہمارے طبقے کے کسی جوان میں نہیں ہوگی، ہم تو نسل در نسل بکے ہوئے لوگ ہیں، کسی ایک جگہ ٹھکانا نہیں۔ جو ہماری قیمت ادا کر کے ہمیں خرید لے، ہم اسی کے خدمت گار...... ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہماری نسل پر چڑھے ہوئے سود در سود قرض کا آغاز کس نے کیا اور اس کا اختتام کب ہوگا......''

''تو تو بہت سیانی ہے بیٹی، اسے بھی کچھ سمجھایا کر، اپنے جیسی سوچ اسے بھی دے دے......''

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہ رہی تھی ماسی کہ تو اس کو سمجھا......'' نگی نے تہیہ کیا کہ وہ اس کی ماں کو کسی حد تک بتا کر خبردار کردے گی۔ ''اسے سمجھا کہ چھوٹے دلوں میں بڑی بڑی خواہشات نہیں بسانی چاہئیں......''

''کون سی خواہشات کی بات کر رہی ہو بیٹی؟'' سکھاں کے انداز میں تشویش تھی۔

''یونہی کہہ رہی تھی ماسی......'' اس نے اس وقت اتنا بتانا ہی کافی سمجھا اور چل دی...... کاش وہ تھوڑی سی دیر اور رکتی، سکھاں کو تھوڑا سا اور اشارہ دیتی...... جو وہ رکتی تو دیکھتی کہ اس کی پیاری سہیلی اپنی خواہشات کی کیا قیمت چکا کر گھر لوٹی تھی...... وہ ذرا سا اور ٹھہرتی تو دیکھتی کہ سکھاں بیٹی کو دیکھ کر بھی نہ جان پائی تھی کہ اس کی بیٹی کہاں سے آ رہی تھی اور کیا کر کے آ رہی تھی۔

☆☆☆

شاکر نے ارادہ کیا کہ وہ بچی کو کچھ دنوں کے لیے سلمٰی کے حوالے کر کے گاؤں کا چکر لگا آئے گا، دکان تو اس نے چھوٹے سے پیمانے پر شروع کر دی تھی اور انہی کی بیٹھک میں کرایے دار کی حیثیت سے رہنے لگا تھا، کرایہ بھی اس نے سلمٰی کو زبردستی یہ کہہ کر ادا کیا تھا کہ وہ اسے اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا اور بہنوں کا بھائیوں پر حق ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وہ کوئی سودا سلف اپنی جیب سے لے آتا اور کبھی بچوں کو تفریح کروانے کے لیے باہر لے کر جاتا تو انہیں ٹافیاں وغیرہ لے کر دے دیتا۔ بچیاں گھر پر ہی رہتی تھیں، ان کے لیے بھی آتے ہوئے کچھ نہ کچھ لے کر آتا تھا۔

سعید منع ہی کرتا رہ جاتا مگر شاکر کا جواب اسے لاجواب کر دیتا کہ وہ ان بچوں کا ماموں ہے اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ سعید لاجواب ہو جاتا اور اس کے اس احسان کو اس کے سوا کسی طرح نہ چکا سکتا تھا کہ سلمٰی اور ناہید کو بار بار تاکید کرتا کہ اس کی بچی کا اچھی خیال رکھا کریں۔ اس روز بھی رات کے کھانے کے وقت سعید اور شاکر دونوں ہی تھے، بچے بھی پاس ہی تھے البتہ ناہید عدت میں ہونے کے باعث سامنے نہ آتی تھی۔ سلمٰی روٹی لے کر آئی تو شاکر، سعید سے اپنے گاؤں جانے کی بات کر رہا تھا۔

''کیا آپ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے جانے کی بات کر رہے ہیں شاکر بھائی؟'' سلمٰی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کہ واپس نہ آؤں......'' اس نے جانے کیسے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ''کچھ رکے ہوئے کام کرنا تھے!''

''کہیں شادی وادی تو نہیں کرنے جا رہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ممکن ہے......'' مرد ہو کر بھی اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تھا، سعید اس نوجوان کو دیکھ کر رہ گیا تھا جس میں شہر کے نوجوانوں جیسی ہوشیاری، چالاکی کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اب تو دیہات میں بھی ایسی سادگی کمیاب تھی۔

''تو شادی کر کے اسے بھی شہر لے آئیں، اب آپ نے شہر میں نئی نئی دکان شروع کی ہے، لوگ دیہات سے شہروں کی طرف آ رہے ہیں اور آپ......''

''ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا آپا!'' شاکر نے کچھ عرصے سے اسے آپا کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''گاؤں جا کر ہی حالات کا علم ہوگا!''

''کوئی ہے آپ کی نظر میں؟'' سلمٰی نے پھر استفسار کیا۔

''کہہ سکتی ہیں......'' شاکر اس لیے بھی محتاط تھا کہ عورتیں بال کی کھال اتارتی ہیں، اسے اشارہ بھی دے دیتا تو پھر وہ مزید جاننے پر اصرار کرتی اور وہ ابھی اپنے دل کا بھید کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''کب جانے کا ارادہ ہے؟'' سعید نے پوچھا۔

''دو تین دن میں نکل جاؤں گا!'' شاکر نے کہا۔

''دکان کا کیا کرو گے، کیا بند کر جاؤ گے اتنے دنوں کے لیے؟''

''جلد آنے کی کوشش کروں گا، تاہم دکان تو بند ہی کر کے جانا پڑے گی، البتہ مال آپ کو امانت کے طور پر سونپ جاؤں گا!'' شاکر کا ارادہ یہی تھا کہ اب وہ پلٹ کر گاؤں میں کاروبار نہیں کرے گا، تھوڑے دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر میں ترقی کے مواقع کہیں زیادہ تھے۔ اس بات کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ زرتاج مانے گی یا کہ نہیں...... اس بچی کے ساتھ تو وہ اس گاؤں میں یوں بھی نہیں رہ سکتے تھے، گاؤں میں لوگوں کو اس کا کیا جواز دیتے۔

زرتاج کی یاد دل میں اترتے ہی اس کے اندر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار سی پڑنے لگی، کتنے دن ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے...... اب چند دن کا فاصلہ ان کے بیچ میں رہ گیا تھا، پھر وہ اسے بیاہ کر لے آئے گا، معراج بی بی سے اب اسے یہ کہنا تھا کہ وہ اب شہر میں ہی اپنا کاروبار بھی کرے گا اور زرتاج کو بھی اپنے ساتھ شہر لے آئے گا...... سوچتے ہی اسے کچھ یاد آیا۔

''سعید بھائی...... اب کے واپس آؤں گا تو چاہوں گا کہ اپنے لیے کرایے پر کوئی اور گھر دیکھ لوں!'' اس نے کہا۔

''خیر سے جاؤ اور خیریت سے لوٹو تو سب دیکھا جائے گا......'' سعید نے مسکرا کر کہا تھا۔

''سیما کو بھی ساتھ لے کر جاؤ گے کیا؟'' سعید نے پوچھا۔

''لے تو جاؤں مگر کشمکش میں ہوں کہ اسے کس طرح سنبھالوں گا......'' شاکر نے حسبِ عادت سر جھکا کر کہا مگر جو وہ دیکھ پاتیں کہ اس کی آنکھوں میں امید کے کیسی جوت جگمگا رہی تھی۔

''اسے چھوڑ جائیں، میں سنبھال لوں گی......'' سلمٰی نے پیشکش کی۔

''میں آپ کا ممنون ہوں گا!'' شاکر نے تشکر بھرے انداز میں کہا۔ رات بھر اس سہانے تصور میں گزری کہ اگلے روز اسے گاؤں کے لیے روانہ ہونا تھا، وہ اپنی منصوبہ بندی کیے بیٹھا تھا مگر قدرت نے اس کے لیے کیا سوچ رکھا تھا، اسے معلوم نہ تھا...... جس روز اسے نکلنا تھا، سیما رات بھر الٹیاں کرتی رہی تھی اور نڈھال پڑی

تھی۔اس کی اتنی فکر نہ تھی، اس کا کون سا اس سے کوئی خونی رشتہ تھا مگر اس گھر کے نفوس کیا سوچتے، اس نے انہیں تو یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے، وہ سوچتے کہ کس طرح کا باپ ہے اسے اس بیماری میں چھوڑ کر چلا گیا۔ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا، قدرت کی طرف سے اس کے لیے رکاوٹ حائل ہو گئی تھی، اسے کچھ دن صبر کرنا تھا۔وہ چند دن...... جو اس کی زندگی کا رخ ہی موڑنے والے تھے۔

☆☆☆

''اماں......!''

''ہوں......؟'' ہلکی سی غنودگی بھری آواز تھی۔

''سو گئی ہیں کیا؟'' زرتاج نے پوچھا۔

''کیا بات ہے، تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟'' معراج بی بی نے پوچھا۔

''اماں ایک بات کہنا تھی آپ سے......''

''کہو؟''

''اماں...... یہ ہم سب لڑکیوں کے نصیب ایسے کیوں ہوتے ہیں، مردوں کے معاشرے میں کسی نہ کسی طرح پستی رہتی ہیں؟'' اس نے ماں سے عجیب سا سوال کیا۔

''تاجی! تجھے یہ آدھی رات کو کیا سوجھی......؟'' بہت کم اماں اسے تاجی کہتی تھی لیکن جب کہتی تو اس میں یا پیار ہوتا یا غصہ، اسے اس وقت سمجھ میں نہ آیا کہ ماں کے بے تاثر لہجے میں کیا تھا، چہرہ تو اسے اندھیرے کے باعث نظر ہی نہیں آ رہا تھا، شاید اماں غصے میں ہوں گی...... ابا کے بعد اماں کو غصہ بھی تو بہت آتا تھا۔

''اماں یہ کلثوم کو ہی لے لے، گھوٹو جیسا شخص، جسے کوئی منہ نہ لگانا چاہے...... وہ بے چاری اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے، اس لیے کہ وہ سزا کے طور پر اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا، وہ بھی چاہتی اماں تو اس کے ساتھ بیاہ کرنے کے بجائے کنویں میں چھلانگ لگا دیتی مگر...... بات تو ایک ہی ہے نا!''

''مجھے تو تیری بات کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا، کہنا کیا چاہتی ہے تو؟'' اماں کے لہجے میں اب صاف خفگی تھی۔

''اماں کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ لڑکیوں کو پیدا کرتے ساتھ ہی ان کے نصیب لکھنے کا اختیار ماں باپ کو دے دیتا!'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے اس وقت، کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے؟'' معراج کی کوشش ہوتی تھی کہ زرتاج کو کسی ایسے موضوع پر نہ ہی آنے دے جس سے اس کو ماضی کی یادیں ستانا شروع کر دیں۔

''اماں آپ کو نیند آ رہی ہے کیا؟'' اس نے چڑ کر پوچھا۔''ویسے تو آپ رات رات بھر جاگ کر گزار دیتی ہیں!'' معراج کے پاس اس کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا، نیند تو جانے کب سے اس سے یوں روٹھی تھی کہ ٹکڑوں اور ٹوٹوں میں تھوڑی سی دیر کو اونگھ آتی اور پھر آنکھ کھل جاتی تو رات بھر آنکھوں میں ہی کٹ جاتی۔

''تم سو جاؤ اب اور اس طرح کی باتوں کو اس وقت مت سوچو!'' معراج نے اسے ٹالا۔''چلو اب آیت الکرسی پڑھو اور آنکھیں بند کر کے کوئی اچھی بات سوچو......'' اس کے پاس سوچنے کے لیے کون سی اچھی بات تھی

''جانے یہ شاکر اب کی بار شہر گیا ہے تو اتنے دن کیوں لگا دیے ہیں......'' اماں بڑبڑائی تھیں تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی، وہ اور اماں ایک وقت میں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔

''اماں آپ کو بتانا تھا کہ اس روز جو لوگ ہمارے گھر چھت سے کود کر آئے تھے......''

''کیا ہوا ان کو؟'' معراج اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اماں میں نے ان میں سے ایک آدمی کو چوہدری مراد علی کی حویلی میں دیکھا تھا، فیضی نام کا آدمی...... اور مجھے رابعہ بی بی نے بتایا تھا کہ وہ چوہدری شجاع کا خاص آدمی تھا، چوہدری شجاع، چوہدری صاحب کا منجھلا بیٹا ہے......''

''تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟'' معراج نے خفگی سے کہا۔

''پہلے مجھے کون سا علم تھا......'' اس نے صفائی پیش کی۔''وہ تو اس روز حویلی میں، میں نے اسے دیکھا اور رابعہ بی بی سے پوچھا تھا!''

''اس کا مطلب ہے کہ چوہدری شجاع نے تجھے کہیں دیکھا ہے......'' یہ کہتے ہوئے معراج بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔''مجھے اس کی بابت چوہدرانی سے بات کرنا ہی ہو گی!'' خلا میں گھورتے ہوئے معراج نے کہا۔

''کیا اس وقت بات کرنے جائیں گی اماں؟'' زرتاج نے حیرت سے پوچھا۔

''مگر اس نے تمہیں کہاں دیکھا ہو گا؟''

''ممکن ہے کہ اپنی حویلی میں کہیں سرسری سا دیکھا ہو، میں نے تو اسے شاید ایک بار ہی دیکھا ہے!'' زرتاج نے اپنی صفائی دی۔

''اگر تم نے اسے ایک بار دیکھا ہے تو اس نے بھی شاید تمہیں ایک بار ہی دیکھا ہو...... مگر وہ اتنا کمینہ صفت انسان ہے کہ وہ کسی کی بیٹی پر اچھی نظر ڈال ہی نہیں سکتا......'' معراج نے کہا۔''اسی لیے تو میں نے تمہیں ہمیشہ چھپا چھپا کر رکھا ہے، میں نے تین بیٹیاں گنوائیں زرتاج...... شوہر کا پیار اور اعتبار کھویا...... اب میرے پاس تمہارے سوا بچا ہی کون ہے، میں تمہیں کسی بھی طرح نہیں کھو سکتی۔ تمہیں کچھ ہوا تو میں یونہی مر جاؤں گی......'' وہ رو رہی تھی، آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ توڑ کر باہر آنے لگے۔''میں کچھ دن انتظار کروں گی شاکر کا، اگر وہ نہ لوٹا تو میں تمہیں تمہارے گھر کا کر دوں گی، اس سے پہلے کہ ان خبیثوں کی تم پر دوبارہ بری نظر پڑے......''

معراج کا یہ کہنا تھا کہ زرتاج کے آنسو بھی بہنا شروع ہو گئے، وہ کس طرح کسی اور کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔قیامت تک شاکر کا انتظار کر سکتی تھی، وہ اس کی کنواری آنکھوں کا خواب تھا، اس کی تعبیر کوئی اور کیسے ہو سکتا تھا...... ''اللہ نہ کرے کہ اماں کو مجبور ہو کر میری شادی کسی اور سے کرنی پڑ جائے، میں کسی اور کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتی......'' اس کے ماموؤں کے بیٹے اس سے بھی چھوٹے تھے اور اس کے علاوہ ان کا خاندان کہاں تھا اور کون تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

''جانتی ہوں میں کہ شاکر اور تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو مگر اس سے پہلے کہ ہمارے ہاتھ میں وقت نہ رہے اور تیری جوانی ان درندوں کی بھینٹ چڑھ جائے......'' وہ چھکوں پھکوں رونے لگی، زرتاج حیران تھی

کہ کیسے اس کی ماں اس کے دل کے حال سے بھی واقف تھی پھر بھی اس کے ساتھ ایسی باتیں کر رہی تھی۔ معراج نے تو جوانی میں خود کو کسی کی محبت میں مبتلا ہو کر تڑپتے ہوئے دیکھا تھا، وہ کس طرح غافل ہو سکتی تھی اپنی بیٹی کی امنگوں سے مگر غربت از خود اتنی بڑی مجبوری ہوتی ہے کہ اس کے آگے دنیا کی تمام مجبوریاں ہیچ ہوتی ہیں۔ غریب آدمی کی امنگوں اور آرزوؤں کی کسی کی نظر میں کیا وقعت......

☆☆☆

کلثوم اگلے ہی روز صبح بغیر چوں چرا کیے کام کے لیے نکل گئی۔ یہی چاہتا تھا نہ وہ کہ اسے کام نہ کرنا پڑے، اس نے بھی اس سے پوچھا تک نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ راستے میں وہ معراج بی بی کے پاس گئی اور انہیں بتایا کہ جہانداد نے اسے کہیں سے کوئی پڑیا لا کر دی تھی، اس میں اس کے بقول وہ دوا تھی جو کلثوم کی متلی کی کیفیت کو ختم کر دیتی مگر کلثوم کو شک ہو گیا اور اس نے وہ دوا کیسے طریقے سے ضائع کر دی تھی، اس وقت تو زرتاج کی ہنسی نکل گئی تھی، کلثوم نے کیسی چالاکی دکھائی تھی مگر دل میں اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ اگر جہانداد نے اس پر زبردستی کی تو کہیں اس بے چاری کو اپنی جان سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔

معراج اور زرتاج تو اس کے لیے ماسوا اس کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں اسے سمجھائیں کہ وہ جہانداد کے کہنے پر کوئی دوا نہ کھائے۔ وہ بھلا کب چاہتا ہوگا کہ وہ بستر پر پڑ جائے اور اس نکمے کو کام کرنا پڑے۔

''اس بھک منگے کو شرم بھی نہ آئی تمہاری زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہوئے......'' معراج نے کلثوم سے کہا تو وہ روہانسی ہو گئی، بھلا اس بے چاری کا اس میں کیا قصور مگر معراج کا یہی ڈانٹنا تھا کہ جس سے سب لوگ ڈرتے تھے۔

''اماں...... وہ کیا خود اس کو کہہ رہی ہے کہ اس کو ایسی فضول دوائیں لا لا کر دے؟'' زرتاج نے ماں کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا، کلثوم کو ذرا سی ڈھارس بندھی۔

''ماسی...... میں نے تو اس سے زبردستی کی شادی کے بندھن کو بھی یہ سمجھ کر قبول کر لیا کہ یہ میرے اللہ کی طرف سے ہی ہے، اس لیے اس میں میرے لیے کوئی بہتری ہوگی، مجھے اس سے جتنی بھی کراہت محسوس ہوتی ہے میں اس کو برداشت کرتی ہوں کہ اس کے علاوہ دنیا میں میرا ہے بھی کون...... مگر جس دن سے مجھے یہ خوش خبری ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد کی نعمت دینے کا فیصلہ کیا ہے...... یقین کریں ماسی میرے قدم ہی زمین پر نہیں ٹکتے، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کوئی تو میرا اپنا ہوگا، میرے جسم کا ٹکڑا......'' اس نے جذباتی انداز میں کہا تھا۔ ''میں جیسے تیسے بھی ہوا اس کو پال بھی لوں گی مگر جانے کیوں وہ اس کے پیچھے پڑا ہے!''

''اللہ نے تمہیں اولاد دینی ہے تو وہ ضرور دے گا، مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ طاقت ور ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں مگر اپنی سی احتیاط ضرور کرنا، وزن وغیرہ اٹھانے سے پرہیز کرنا!'' معراج نے کہا۔ ''میں تو اس کے لیے ہدایت کی دعا ہی کر سکتی ہوں...... بے ہدایتا، نگوڑ مارا!'' اماں کے یوں کہنے پر زرتاج کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''کلثوم...... اگر وہ کبھی اماں کو نظر آ گیا نا تو، تو دیکھنا......'' وہ کھی کھی کر کے ہنسی تو معراج کو غصہ آ گیا۔

''زیادہ فالتو باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، خوامخواہ!'' معراج نے کہا۔ ''میں کوئی پاگل ہوں جو راہ چلتے

دیکھ کر اس کا سر پھاڑ دوں گی؟''

''چلتی ہوں ماسی......'' کلثوم اٹھ کر چل دی، زرتاج نے اس کے پیچھے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر ماں کے پاس آ کر بیٹھی تو اس کی نظر ناگاہ اس جگہ پر پڑ گئی جہاں کچھ دیر پہلے کلثوم بیٹھی تھی۔

''اماں......'' چیخنے کے انداز میں اس نے ماں کو پکارا، جس نے اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تو سراسیمہ ہو گئی، پاؤں میں چپل اڑسے اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھولا اور اسے وہ ذرا دور نظر آ گئی، اس نے پوری آواز سے اسے پکارا، کلثوم نے مڑ کر دیکھا تو معراج اسے واپس آنے کا اشارہ کر رہی تھی، وہ ٹھٹک کر وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، گلی کے کئی لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔

''کام ہے ذرا تجھ سے......'' معراج نے لوگوں کی نظروں کے محور بننے پر اس بے چاری کو شرمندگی سے بچانا چاہا۔ ''میری بات سن کر چلی جانا!'' کلثوم واپس اس کے گھر کی طرف ہو لی، گلی کے لوگوں کی توجہ اب اس پر سے ہٹ گئی تھی اور معراج کھڑی اس کے قدم گن رہی تھی، اس کا ایک ایک قدم اٹھانا خطرناک تھا...... مگر کیا کرتی، کسی کو یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے اٹھا کر اس کے گھر تک چھوڑ جائے۔

''سب خیر ہے نا ماسی، ابھی تو میں یہاں سے اٹھ کر گئی ہوں......'' اس نے قریب پہنچ کر حیرت سے پوچھا۔

''یہاں تو سب خیر ہے......'' معراج نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کی طرف کھینچا۔ ''تیرے ساتھ خیر نہیں لگتی مجھے......''

☆☆☆

عباس کو زہرہ کی باتیں بدزبانی لگنا شروع ہو گئی تھیں، اس کے دل میں ایک وہم سا بیٹھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ کر آ گئی ہے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی اور ملے تو وہ اسے چھوڑ کر اس کے ساتھ چل دے۔ وہ اسے اتنے کڑے پہرے میں رکھتا تھا اور گھر سے باہر جاتا تو اب باہر سے تالا لگا کر جاتا تاکہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے اور کسی کو گھر میں نہ آنے دے۔ اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ جب کمروں میں روزن چھوٹے ہوں تو آندھی کا دباؤ زیادہ شدت سے ہوتا ہے۔

زہرہ اس کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر آ تو گئی تھی مگر اب اسی کی نظر میں بے اعتبار ہو گئی تھی۔ اسے عباس عجیب سا لگنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اس سے پوچھا تھا کہ بیٹی کا نام اس نے کیا سوچ رکھا تھا تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، وہ زہرہ کا منہ دیکھنے لگا...... ''تم نے کچھ سوچا ہوگا، مجھے تو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی!''

''میں کیوں سوچتی نام، بیٹی تمہاری ہے، نام بھی تم سوچتے اور نام سوچنے کے لیے کتنی فرصت درکار ہوتی ہے بھلا؟'' اس نے مصنوعی ناراضی سے منہ پھلایا۔

''کلثوم رکھ لو......'' اس نے تجویز دی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں عباس؟'' وہ چڑ کر بولی۔ ''کلثوم اس کی پھوپی کا نام ہے!''

''تو کون سا پھوپی اور بھتیجی ایک ہی جگہ رہ رہی ہیں!'' اس نے جواز پیش کیا۔

''پھر بھی کبھی نہ کبھی تو اکٹھے ہوں گی نا......!'' اس نے غصہ دبانے کی کوشش کی، دل میں خیال آیا کہ اس

طرح کے کام غالباً عورتیں ہی کرتی ہوں گی، مردوں کو بھلا کیا پتا اور خاص طور پر لڑکیوں کے ناموں کا۔ وہ تو غریب دن بھر محنت اور مزدوری کرتا رہتا ہے اور تو اور اسے وہ عشق بھی بھول گیا ہے، جس نے ہم دونوں کو اپنے اپنے گھروں سے نکالا تھا۔

دنیا اور آخرت کی خواری بھی مول لی، اب میں بیٹی کا نام رکھنے کے لیے خوامخواہ اس سے توقع کر رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی نام بتائے اور وہ مجھے پسند ہی نہ آئے...... وہ سوچے جا رہی تھی اور خود ہی سوال و جواب کر رہی تھی۔ یوں بھی وہ یوں بات بے بات بگڑتا تھا کہ وہ ڈر جاتی تھی۔

''زرینہ نام کیسا رہے گا؟'' اس نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پسند ہے تو اچھا ہے......'' اس نے بھی نرم لہجے میں کہا۔ ''یہی رکھ لو!''

''کتنے عرصے کے بعد تم نے نرمی سے بات کی ہے مجھ سے عباس......'' زہرہ نے شکوہ کیا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

''کیا کروں زہرہ......؟'' اس نے بے بسی کا اظہار کیا۔ ''نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو جاتا ہوں۔ حالات نے مجھے ایسا بنا دیا ہے، ورنہ تم سے کتنا پیار ہے یہ تو تم جانتی ہی ہو......''

''یہ کیسا پیار ہے عباس، جو ایک سال میں ہی کم ہو گیا ہے......'' وہ اس کے ساتھ لگ کر سسک اٹھی۔

''پیار تو کم نہیں ہوا!'' عباس نے اسے پیار سے کہا۔ ''بس پیٹ کے دھندے نے سب کچھ بھلا دیا ہے......''

''تم مجھ پر شک کرتے ہو اور سختی بھی...... یہ بھی تو سوچو کہ اگر تمہیں مسائل ہیں یا کوئی دکھ ہے تو ویسا ہی دکھ میرا ابھی تو ہے، اگر تم پچھتا رہے ہو تو اور بات ہے۔'' اس نے موقع دیکھ کر شکوہ کیا۔

''پچھتا نہیں رہا...... پچھتا رہا ہوتا تو بہت عرصے پہلے ہی کچھ فیصلہ کر لیتا، اب تو ہم اولاد کی مضبوط ڈور میں بھی بندھ گئے ہیں!'' اس نے اسے یقین دلایا۔ ''بس کبھی کسی وقت کچھ سوچ کر ڈر جاتا ہوں......''

''مت سوچا کرو ایسی غلط سلط باتیں......'' زہرہ نے اس سے لگاوٹ سے کہا۔ ''ذرا پکڑو زرینہ کو، میں ذرا گھر کا کام کاج کر لوں۔''

''اچھا بابا لاؤ، دے دو ہمیں زرینہ بی بی کو!'' اس نے بیٹی کو اس کے ہاتھ سے لیا اور ڈرتے ڈرتے اٹھایا، اسے بھلا کہاں عادت تھی ایسی نرم و نازک چیز کو پکڑنے کی، ذرا سی دیر میں ہی گھبرا کر زہرہ کو بلایا اور بچی کو اس کے حوالے کر دیا۔ زہرہ کو کم از کم اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے اس سے اس روز پیار سے بات کی تھی اور بچی کو بھی اٹھایا تھا، اس کی تسلی کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ اظہار کرے نہ کرے مگر اس کے دل میں اس کے لیے پیار تو تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اجڑی ہوئی شکل کے ساتھ اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر سکھاں نے دل تھام لیا۔ ''کہاں سے آ رہی ہو، کیا کھیتوں پر گئی تھی، تھک گئی ہو یا......'' ایک ساتھ کئی سوال داغتی ہوئی ماں اس وقت رانی کو ایسی مصیبت لگ رہی تھی جس سے جان چھڑانا آسان نہ تھا مگر ماں نے بولتے بولتے اسے خود ہی

اشارہ دے دیا تھا اور اسے اس مصیبت سے نمٹنے کا طریقہ خود ہی مل ہی گیا تھا۔

''بہت تھک گئی ہوں اماں......'' اس نے مختصراً کہا۔ ''آرام کرنا چاہتی ہوں!''

''اگر ہمت نہیں تھی تو گئی ہی کیوں تھی کھیتوں پر کام کرنے......'' سکھاں نے پیار سے کہا۔ ''تیرے پیچھے نگی پھر آئی تھی تیرا معلوم کرنے''۔ رانی کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔

''کیا کہتی تھی؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔

''تیری طبیعت کا معلوم کرنے آئی تھی، تم نے صبح کہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں......''

''میری اتنی فکر کیوں ہے اسے......'' رانی نے بے اعتنائی سے کہا۔

''سہیلی ہے تیری، اس لیے فکر کر رہی ہے، وہ بیمار ہو گی تو کیا تجھے فکر نہ ہو گی!'' سکھاں نے اسے سرزنش کی۔

''اچھا اماں اب آرام کرنے دے مجھے، کیا فضول کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہے......'' اس کے انداز میں ایسی گستاخی تھی کہ سکھاں اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ اتنے گستاخانہ انداز میں تو اس نے کبھی ماں سے بات نہ کی تھی، پھر بھی سکھاں نے اس کی تھکاوٹ اور اس کی نگی سے ناراضی پر محمول کیا تھا۔ رانی اٹھ کر اس چھوٹے سے گھر کے اندرونی کمرے کی طرف بڑھی تو سکھاں کو اس کی ٹانگوں میں لرزش محسوس ہوئی تھی، اس کے دل میں ترس اور ہمدردی جاگی اور وہ اس کے پیچھے دودھ گرم کر کے ایک گلاس لے گئی، وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس نے آواز دی تو اس نے ہولے سے ہوں کیا۔

''اٹھ کر دودھ پی لو......'' اس نے پیار سے اسے پکارا۔

''رکھ دو اماں، ٹھہر کر پی لوں گی!'' اس نے بیزاری سے کہا تھا۔

''اٹھ کر پی لو میری بیٹی!'' اس نے اصرار کیا۔ ''ٹھنڈا ہو جائے گا تو پھر کیا فائدہ......''

''کہا ہے نا اماں کہ پی لوں گی، رکھ دو کہیں!'' اس نے پھر اسی گستاخی سے کہا تھا جسے سکھاں پہلے بھی نظر انداز کر رہی تھی مگر اسے اب بھی غصہ نہیں آیا تھا کہ اسے اپنی بیٹی کے مزاج کا علم تھا جسے بگڑنے کے لیے ایک منٹ سے بھی کم وقت درکار ہوتا تھا۔ اس نے خاموشی سے دودھ کا گلاس اس کے سرہانے کی طرف نیچی سی چوکی رکھ کر اس پر رکھ دیا اور خود باہر چلی گئی، ابھی اسے رات کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اس کے باہر جانے کے بعد رانی نے کروٹ بدل کر دیکھا...... اور اٹھ کر دودھ کا گلاس پی لیا، اسے بہت ناطاقتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بار تو یہ بھی دل چاہا کہ اٹھ کر ماں کا ہاتھ بٹا دے مگر اس میں ہمت نہ تھی اور نہ ہی اس بات کی طاقت کہ وہ ماں کی نظر میں نظر ڈال کر بات کر سکے، اس لیے وہ خاموش رہی۔

اسے یہ بھی علم تھا کہ ماں کی نظروں سے اوجھل رہ کر تو وہ اپنے راز کو راز رکھ سکتی ہے مگر یہاں سے اٹھ کر باہر گئی تو ماں کی کھوجتی نظروں سے اپنا بھید زیادہ دیر کے لیے چھپا نہ پائے گی...... وہ لیٹی چھت کے شہتیروں کو تکتی رہی اور جانے کب نیند کی وادیوں میں اتر گئی، جہاں اس کی نظروں کے سامنے چوہدری اکبر علی کا سراپا تھا، وہی چوہدری اکبر علی جو کچھ دیر پہلے تک اس کی خواہشات کا وہ چاند تھا جسے پانے تو کجا، چھونے کی تمنا بھی ایک خواب کے مانند تھی۔ اب اسے اس نے اسے پا لیا تھا، یوں کہ نہ صرف وہ اس کے وجود بلکہ دل کی

گہرائیوں تک بھی اتر گیا تھا۔ وہ کیا تھی اور اس کی حیثیت کیا، یہ پاتال تھی تو وہ آسمان، وہ ایک ایسا پارس پتھر تھا، جس نے اسے چھوکر سونا بنا دیا تھا...... ابھی تک وہ اس سے ملن کے نشے میں تھی اور اس کے علاوہ اس کا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اسی کے خیالوں میں کھوئی رہے۔

☆☆☆

''تجھے آرام کی بہت ضرورت ہے کلثوم!'' معراج نے اسے دیکھ کر بتایا۔

''آرام کیسے کرسکتی ہوں میں ماسی؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''میں آرام کروں تو کام کون کرے گا!''

''تو چوہدرانی سے بات کرکے وہیں حویلی میں پڑی رہا کر، گھر نہ لوٹا کر، چار دن روٹی نہیں ملے گی تو کوئی ہاتھ پاؤں تو مارے گا ہی نا......'' کلثوم کے حلق میں پھندے سے پڑنے لگے، اسے معراج کے لہجے میں اس وجود کی سی فکرمندی جھلکتی سنائی دی تھی، جو ماں کا ہوتا ہے وہ ماں جو اپنی اولاد کو زمانے کے سرد اور گرم سے بچانے کی خاطر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتی ہے...... اگر اس کی ماں ہوتی تو کچھ اس کے حصے کے عذاب خود پر لے لیتی بلکہ وہ ہوتی تو ایسی زندگی اس کا مقدر تو نہ ہوتی۔

''میں کیسے حویلی میں پڑی رہ سکتی ہوں ماسی، کام کرنے کی ہمت نہیں تو کیا ان کے بھیک کے ٹکڑوں پر پڑی رہوں!'' اس نے اس آہ کا گلا گھونٹا جو اس کے لبوں پر آیا ہی چاہتی تھی...... اس کے اندر انا تھی جو اسے بھیک مانگنے پر آمادہ نہ ہونے دیتی تھی اور پھر حویلی میں پڑے رہنے کی بات تو وہی کرسکتا ہے جسے یہ علم نہ ہو کہ ان حویلیوں میں اس جیسی معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کے لیے قدم قدم پر خطرات منہ کھولے ہوتے ہیں...... مگر اسے حیرت تو یہ ہو رہی تھی کہ حویلی میں جاتے رہنے کے باوجود، معراج ماسی اسے حویلی میں پڑے رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

''اگر احتیاط نہیں کروگی تو خود اپنی جان کو خطرے میں ڈال لوگی!'' معراج نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ ''اس بدبخت کو سبق سکھانا بہت ضروری ہے، چند دن کے لیے اس کے ہوش ٹھکانے لانے کے لیے تم کام کاج چھوڑ دو اور دیکھو کہ کیا کرتا ہے وہ......''

''کیا کرے گا وہ، اس کی نشے کی لت پوری نہیں ہوگی، روٹی نہیں ملے گی تو اس کا سارا نزلہ مجھی پر گرے گا، مار کٹائی کرے گا...... اور کیا ہوگا ماسی!'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، معراج کا دل چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لگا لے، اس کی زرتاج جیسی ہی تو تھی، کاش وہ اس کے لیے کچھ کرسکتی، کاش وہ اسے اس کے دکھوں سے نجات دلا سکتی مگر اسے کون نجات دلا سکتا تھا سوائے اللہ کی ذات کے......

''چلو تم اپنی پوری احتیاط کرو، اس نامراد کے کہنے پر کچھ بھی مت کھانا یا پینا، وہ اپنی نسل کا دشمن ہوا بیٹھا ہے، اسے تو اللہ ہی ہدایت دے سکتا ہے مگر تمہیں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے!'' معراج نے اسے سمجھایا۔ ''بعض اوقات انسان کی غفلت اور بے پروائی اسے عمر بھر کے پچھتاوؤں میں مبتلا کر دیتی ہے، ایسا نہ ہو کہ اللہ کی دی جانے والی نعمت کی قدر نہ کرو تو وہ تمہیں اس نعمت سے آئندہ کبھی نہ نوازے!''

''میں نے تو کبھی بھی نہیں چاہا کہ ایسا ہو بلکہ میرے لیے تو میری اولاد اہم ہے، جہانداد جیسا بھی ہے، میں نے کبھی اس سے نفرت نہیں کی کیونکہ وہی میرا نصیب ہے اور نصیب لکھنے والا تو اللہ ہے نا......'' کلثوم نے کہا۔ ''مجھے اس نے اس نعمت کے قابل سمجھا، میری گھٹن زدہ زندگی میں یہ بچہ ہوا کے جھونکے جیسا ہے!''

''اللہ کرے کہ خیریت کے ساتھ تمہارا وقت پورا ہو اور ٹھیک ٹھاک بچہ پیدا ہو!'' معراج نے اسے دل سے دعا دی تھی اس پر زرتاج نے آمین کہا۔ ''اب کہاں جاؤ گی؟'' معراج نے پوچھا تھا۔

''کام پر......'' اس نے مختصراً جواب دیا تھا۔

''تمہاری کوئی حالت نہیں کام پر جانے والی......'' معراج نے سختی سے کہا۔ ''یہیں پر آرام کرو تم، گھر جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، شام کو گھر لوٹ جانا!''

''مگر جہانداد کو علم ہوا تو......''

''اسے کیسے علم ہوگا، اس کے لیے تم روٹی ہی لے کر جاتی ہونا، وہ لے جانا......'' معراج کا انداز حتمی تھا۔ ''مجھے کہیں جانا ہے اور زرتاج گھر پر اکیلی ہے، تم اس کے پاس دن گزارو اور شام کو اس کے لیے روٹی لے کر چلی جانا۔'' اب اسے انکار کی تاب نہ تھی، زرتاج نے خوشی کا اظہار کیا کہ کلثوم اس کے پاس ہوگی۔

☆☆☆

چوہدرانی جی کافی مصروف تھیں اور معراج بیٹھی اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کب وہ فارغ ہوں اور وہ ان سے بات کرسکے، ان کے پاس سے ایک اٹھ کر جاتی تو دوسری کسی نہ کسی مسئلے کو لے کر آن بیٹھتی۔ اسی انتظار میں معراج کبھی کسی کام والی کے پاس جا بیٹھتی اور کبھی کسی کے پاس۔ خدا خدا کرکے مختلف مسائل والیوں کا جھرمٹ چھٹا تو وہ اٹھ کر عابدہ بی بی کے پاس آ بیٹھی، تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے ہی اس کو مقصد کی بات کی طرف آنا تھا مگر جونہی اس نے بات شروع کرنا چاہی، اس کے منہ سے بات ہی نہ نکل پائی۔

''کیا بات ہے معراج...... کچھ کہنا چاہتی ہو تو کہو، رک کیوں گئی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''چھوٹا منہ بڑی بات چوہدرانی......'' اس نے کہا اور دل سے ایک ٹیس اٹھی کہ کبھی وہ بھی کسی گاؤں میں اس اہم منصب پر ہوتی تھی کہ لوگ اس سے اسی عزت اور احترام سے بات کرتے تھے اور وہ لوگوں کے مسائل کے حل میں مدد و معاون ہوتی تھی۔ ''بات ایسی ہے کہ جرأت نہیں ہو پا رہی!''

''ایسی کون سی ضرورت آن پڑی ہے معراج کہ تمہارا منہ ہی نہیں کھل رہا، کہو جو بھی کہنا ہے بلا جھجک کہو!'' وہ یہی سمجھی تھیں کہ اسے کوئی پیسے دھیلے کی ضرورت پڑ گئی ہوگی، ممکن ہے زرتاج کے بیاہ کا سوچ رہی ہو۔

''ضرورت تو نہیں......'' اس نے ہوا میں دیکھتے ہوئے کہا، کچھ دیر سوچا۔ ''مگر یہی سمجھ لیں کہ میری ایک مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی ہے!''

''کیا چاہیے معراج، کھل کر بات کرو......'' عابدہ بی بی کو شاید معلوم نہ تھا کہ معراج انا کی پکی ہے، کتنی بھی مجبور ہو اپنے پیٹ سے کپڑا نہیں اٹھائے گی۔

''عزت کی حفاظت کی طلب گار ہوں چوہدرانی جی!'' اس نے مبہم سی بات کی تو وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئیں۔

''میں کچھ سمجھی نہیں......''

''آپ کو تو ہم اپنی عزتوں کے رکھوالے سمجھتے ہیں چوہدرانی جی......'' معراج نے ذرا ڈرتے ڈرتے بات

شروع کی۔ ”مگر جب رکھوالے ہی عزتوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیں تو کیا کریں ہم جیسے غریب لوگ!“

”خیر تو ہے معراج...... کس نے کچھ غلط کیا ہے؟“ وہ ہول گئیں، معراج کا سنجیدہ لہجہ انہیں دہلا گیا۔

”جرأت ہی نہیں ہے کہ نام لوں مگر معاملہ ایسا ہے کہ آپ سے ہی بات کر سکتی ہوں!“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا، اسے بھی علم تھا کہ شجاع...... عابدہ بی بی کی دکھتی رگ تھا، اس کے ساتھ انہیں ساری اولادوں سے زیادہ پیار تھا، اس لیے کہ چوہدری صاحب اس سے نالاں رہتے اور وہ ہمیشہ ان کے زیرِ عتاب رہتا بلکہ وہ تو اس سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ یہی عابدہ بیگم کے مطابق ان کی غلطی تھی کہ ان کا تفریق کا رویہ ہی شجاع کو باغی کیے ہوئے ہے۔

”وہ چوہدری شجاع......“ اس نے عابدہ بیگم کے چتون چڑھتے ہوئے دیکھے تو فوراً رک گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ اب بات شروع بھی کر دی ہے تو اس کو مکمل کیسے کیا جائے۔

”کیا ہوا میرے بیٹے کو؟“ انہوں نے پوچھا تو معراج کو اندازہ ہوا کہ دنیا کی ہر ماں کے دل میں تڑپ ہو گی تو اپنی اولاد کے لیے ہی ہو گی۔

”اللہ نہ کرے کہ ان کو کچھ ہو......“ معراج نے کہا۔ ”میں تو آپ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ ان کے خاص آدمی گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزتوں پر بری نظر رکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے لوگ چوہدری شجاع کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے!“

”کون لوگ ہیں جو بری رائے رکھتے ہیں میرے بیٹے کے بارے میں؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر معراج کو دیکھا۔ ”اور گاؤں کی کس بہو بیٹی کی طرف سے شکایت لے کر تم آئی ہو؟“

”میں کسی کی کیا شکایت لے کر آؤں گی چوہدرانی جی...... چوٹ اپنے جسم پر لگتی ہے تو ہی درد ہوتا ہے، کسی اور کی چوٹ کا ہمیں کیا احساس!“

”کیا کسی نے زرتاج سے کچھ کہا ہے؟“ انہیں تو یہی بات سمجھ میں آئی تھی۔

”زرتاج کو بھی کچھ کہہ سکتے ہیں اور جو چاہے اس کے ساتھ کر سکتے ہیں......“ اس کے انداز میں درد ہی درد تھا۔ ”میں تو پہلے ہی زخموں سے چور ہوں، مزید کسی زخم کو سہنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں!“

”ہوا کیا ہے معراج، پہیلیاں نہ بجھواؤ......“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہمارے پاس ایک عزت ہی کی تو دولت ہے چوہدرانی جی...... اس پر بھی چوہدری شجاع کے آدمیوں نے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے، ہمارے غریب خانے کی چھت سے کود کر وہ ہمارے صحن میں اترے تھے، میں گھر پر نہ تھی، اگر محلے والے مداخلت نہ کرتے تو میرا بڑا نقصان ہو جاتا......“

”تمہیں کیسے علم ہے کہ وہ شجاع کے آدمی تھے؟“ انہوں نے سیخ پا ہو کر کہا۔

”ان میں سے ایک کا نام فیضی ہے اور زرتاج اس کو پہچانتی ہے، اس نے اس آدمی کو آپ کی حویلی میں خود دیکھا ہے......“ اس نے ہمت کر کے فقرہ مکمل کیا۔

”میں دیکھتی ہوں کہ کیسے کوئی اتنی جرأت کرے کہ میرے بیٹے کے ٹکڑوں پر پلے اور اسی کا نام بدنام کرے......“ اس وقت عابدہ بیگم کے چہرے پر جس جوش اور غصے کی لہر تھی اس کا سایہ تک بھی ان کے چہرے

پر اس سے قبل معراج نے نہ دیکھا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ مالکوں کی مرضی کے بغیر تو ان کے ملازم اتنی جرأت نہیں کر سکتے مگر نہ کہہ سکی، زرتاج نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی ساری گفتگو میں بار بار اپنے مالک کا نام لے رہے تھے، اس کا مطلب تو یہی بنتا تھا کہ وہ اپنے مالک کی مرضی سے آئے تھے مگر اس وقت عابدہ بیگم یہ بات نہیں سن سکتیں، یہی سوچ کر وہ چپ ہو گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ شجاع سے ضرور استفسار کریں گی، اس کی تسلی کے لیے یہی کافی تھا کہ ان تک بات پہنچ گئی ہے۔

اس کا آنا جانا دونوں حویلیوں میں تھا، اب اس کا ارادہ تھا کہ کسی وقت شکیلہ بی بی تک بھی یہ بات پہنچا دے تاکہ چوہدری نور علی کے کانوں تک بھی پہنچے اور اگر کبھی دوبارہ شجاع کی طرف سے ایسی کوشش ہو تو وہ ان سے مدد طلب کر سکے۔ اس وقت تو وہ گھر کی طرف چلی جہاں سے سامان لے کر اسے کہیں جانا تھا، اس کے نکلتے وقت بلاوا آیا تھا اور اب اس بات کو کافی وقت ہو چلا تھا، وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چلی، گھر والی گلی مڑتے ہی اسے دور سے اپنے گھر کا کھلا دروازہ نظر آیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا، وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

☆☆☆

”ہاں تو صاحب...... ہماری زندگی کی سب سے بڑی دولت ہتھیانے کو تل گئے ہیں آپ؟“ جہاں آرا کا انداز کاروباری تھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں آپ کی زندگی کی کوئی بھی دولت ہتھیانے کا!“ اس نے اپنے اندرونی اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”الماس تو بچی ہے اور بے وقوف ہے، آپ اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہیں، آپ کو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے......“ انہوں نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

”ایسی بچی بھی نہیں ہے وہ اور شادی کرنا اس کی ضد ہے...... میری نہیں، میں ایک شادی شدہ اور بال بچے دار آدمی ہوں، میں تو اس سے شادی کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا!“ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اگر بال بچے دار ہو تو پھر یہاں کس لیے آتے ہو؟“ دلی نے بدتمیزی سے پوچھا۔ ”اب بھی سنبھل جاؤ اور اپنے بال بچے پر دھیان دو، کل سے تمہارا تھوبڑا یہاں نظر نہ آئے مجھے......“ اگر جہاں آرا نہ ہوتیں تو ممکن ہے کہ وہ قائم علی کو ایک آدھ گھونسا بھی لگا دیتا۔

”تم خاموش رہو دلاور......“ انہوں نے اسے ڈانٹا۔ ”جب میں بات کر رہی ہوں تو تم بیچ میں باپ بننے کی کوشش مت کرو!“ دلی نے پھنکار کے انداز میں سانس لی اور ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا مگر دل ہی دل

میں وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ الماس ضدی ہے اور اس نے اس بات پر خودکشی کر لینے کی دھمکی بھی دے رکھی تھی، صاف صاف الفاظ میں اس نے ماں اور بھائی کو بتا رکھا تھا کہ اگر کسی نے اس کو اس بچے کو ضائع کرنے کو کہا یا کسی نے قائم علی کو یہاں آنے سے منع کیا، کسی نے اسے گزند پہنچانے کی کوشش کی یا اس سے شادی نہ کرنے پر سودا بازی کرنے کی کوشش کی تو وہ خود کو ختم کر لے گی۔ اسی وجہ سے تو قائم علی سے ملاقات کے لیے اس جگہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔

''کیا چاہتی ہیں آپ؟'' قائم علی نے نرمی سے پوچھا۔

''میں کیا چاہوں گی...... کیا میری اوقات!'' اس نے ایسی بے چارگی کی اداکاری کی کہ قائم علی جیسے سیدھے اور شریف آدمی کو دل ہی دل میں اس کی بے بسی پر دکھ محسوس ہوا۔ ''بھکاریوں کے پاس حق انتخاب نہیں ہوتا...... اس وقت ترپ کے سارے پتے آپ کے ہاتھ میں ہیں!''

''آپ یوں نہ کہیں، اپنا مطالبہ بتائیں......'' اسے معلوم تھا کہ انہوں نے اسے وہاں بے مقصد نہیں بلوایا تھا بلکہ اپنی مجبوری اور اپنی بیٹی کی ضد کو وصولنے کے لیے ہی بلایا تھا، غالباً وہ لوگ ان کی مالی حالت سے ناواقف نہ ہوں گے کیونکہ انہوں نے کھلا ہاتھ رکھا تھا ہمیشہ۔ وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کی محبت اور ضد کی کیا قیمت لگاتے ہیں۔

''جب ہماری اپنی بیٹی ہی ہمارے کہے میں نہیں صاحب تو ہم آپ کو کیا الزام دیں...... وہ باؤلی اپنا دل آپ پر ہار بیٹھی، ہم نے تو سوچ رکھا تھا کہ کبھی بھی اس کی شادی نہیں کریں گے، وہ تو ہیرا ہے اور ایسا ہیرا کہ جس کا مول اس بازار میں کوئی نہیں لگا سکتا......'' انہوں نے اسے بتایا۔ ''ہم تو اسے کچھ انوکھا ہی بنانا چاہتے تھے، ایسا کہ جیسا کوئی اور نہ ہو اور اس کا کام چلتا رہے، میں نے اس مقصد کے لیے چھوٹی چھوٹی... بچیاں خرید کر ان کو اس کی منہ بولی بیٹیاں بنا کر پال رہی ہوں، یہی بچیاں کل کو اس کا کاروبار سنبھالتیں...... مگر ہوا یہ ہے کہ الماس خود کو ہی نہیں سنبھال سکی!'' ان کے لہجے میں ناکامی کا رنگ بھی گھلا ہوا تھا اور الماس جیسے ہیرے کی ماں ہونے کا غرور بھی......

''میری اس میں کیا غلطی ہے اور اب میں اس کا ازالہ کس طرح کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کا کوئی ازالہ نہیں مگر اب موجودہ صورتِ حال میں اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں کہ آپ الماس سے شادی کر لیں......'' جہاں آرا نے دوٹوک بات کی۔ ''ہاں مگر اس شادی کی ساری شرائط ہماری تجویز کردہ ہوں گی، ورنہ......''

''ورنہ کیا......؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''ورنہ آپ برے پھنس سکتے ہیں صاحب......'' اس نے چتون چڑھا کر کہا۔ ''ہماری معصوم بچی کو ورغلانے ...... یا زنا کے الزام میں!'' قائم علی کو اپنے سینے میں گھٹن سی محسوس ہوئی۔ ''اور اگر اس نے کچھ کر کرا لیا تو اس کے قتل کے الزام میں......'' اس کے گلے میں جیسے کسی نے پھندا ڈال کر اس کے دونوں سرے زور سے کھینچے تھے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

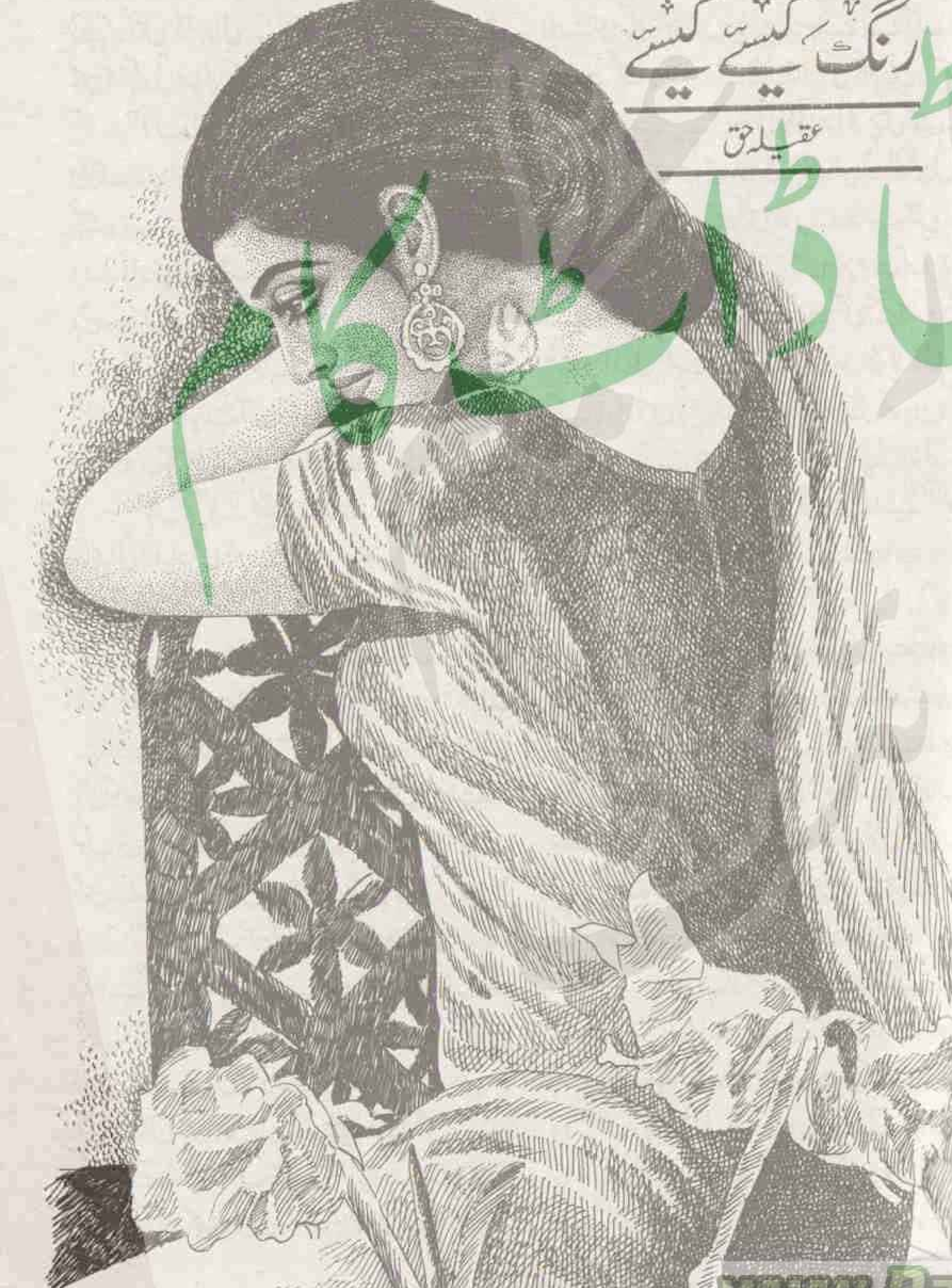
رنگ کیسے کیسے

عقیلہ حق

''ارے خالہ کوئی رشتہ بتائیں میری نند کے لیے۔'' بھابی نے خالہ رشیدہ کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''ماشاء اللہ تمہاری نند اچھی بچی ہے۔ کم عمر، نیک، سلیقہ شعار تم بتاؤ کیسا رشتہ چاہتی ہو؟'' خالہ رشیدہ نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''بس خالہ انسان کے بچے ہوں، دو وقت کی روٹی کھلا دیں۔ پیسہ، دولت تو نصیب کا ہوتا ہے اور یہ



بدنصیب کون سی خوش قسمت ہے اور جہیز وغیرہ کی امید نہ رکھیں۔ ان کے باپ کون سی جائدادیں چھوڑ کر گئے ہیں۔ بس دو جوڑوں میں بیاہ کر لے جائیں تا کہ اس مصیبت سے مجھ کو چھٹکارا ملے' میری اپنی بھی زندگی ہے کہ نہیں۔" بھابی کے لفظوں نے باورچی خانے میں کام کرتی صالحہ کے سینے میں گھاؤ ڈال دیے۔

"اِک رشتہ ہے تو سہی نہ لین نہ دین، لڑکا موٹر مکینک ہے اپنا ذاتی گھر ہے ملیر میں...... ماں باپ نہیں ہیں...... چھ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ ذمّے داری والا رشتہ ہے، نبھا لے گی تمہاری نند؟" رشیدہ خالہ نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں نبھائے گی...... اور ان کو کون سا شہزادہ گلفام بیاہنے آئے گا اس زمانے میں تو ویسے ہی رشتوں کا کال ہے۔" بھابی نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں تم کہہ تو ٹھیک رہی ہو...... لیکن بیٹی کچھ خاندانی معیار بھی ہوتے ہیں...... اللہ بخشے تمہارے ساس سسر بڑے وضعدار اور خاندانی تھے۔ یہ بچے سب میرے سامنے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ بڑے نازونعم میں پالا ہے ان کو تمہارے سسر نے، یتیم بچی ہے اور تمہاری بڑی نند نہ اعتراض کرے اور پھر تمہارا میاں بھی تو سوچ سکتا ہے کہ خالہ رشیدہ کو یہ بدحال مصیبت زدہ لوگ ہی ملے تھے، میری اتنی پڑھی لکھی اور خوب صورت بہن کے لیے۔" خالہ رشیدہ کچھ جزبز تھیں۔

"ارے خالہ جن کو اعتراض ہو وہ اس مصیبت کو اپنے گھر لے جائے۔ ذمّے داریاں اٹھائیں گے نہیں، اعتراض کرنے کھڑے ہو جائیں گے اور رہا سوال میرے میاں کا تو خالہ ان کا تو آدھا سر سفید ہو گیا ہے ان بہن بھائیوں کے پیچھے، ویسے بھی اب ان کی ذمّے داری یہ لوگ نہیں' میں اور میرے بچے ہیں، ان کو میں خود سمجھالوں گی۔" بھابی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ صالحہ کو خالہ کے ساتھ ہی روانہ کر دیں۔

"بیٹا اس لڑکے کی تنخواہ کم ہے، ذمّے داریاں زیادہ...... بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ غریب لوگ ہیں لیکن اِک بات اچھی ہے کہ نہ کچھ لے کر آئیں گے اور نہ ہی کچھ جہیز میں چاہیے، سوائے اِک نیک اور خدمت گزار لڑکی کے۔" خالہ کی نظریں مسلسل خاموش، چپ چپ ہی روٹی پکاتی صالحہ پر ٹکی تھیں۔

"ارے میری بھولی خالہ یہ تو لڑکیوں کا نصیب ہوتا ہے، ویسے بھی ہمارے مذہب میں ہے کہ فاقے کے خوف سے نکاح میں دیر مت کرو رزق دینے والا تو اللہ ہے اور ویسے بھی یہ بھی یتیم اور وہ بھی یتیم اپنا ذاتی گھر لو یتیم خانہ کھل جائے گا۔" بھابی قہقہہ مار کر ہنس دیں۔ "میں آپ کو خوش کر دوں گی، آپ بات آگے بڑھائیں۔" بھابی نے صالحہ کے پژمردہ وجود سے نظریں چراتے ہوئے اپنے کنگنوں کو دیکھا جو پچھلے ہفتے ہی بن کر آئے تھے۔

☆☆☆

"چلو شکر ہے کہ آپ صالحہ کے فرض سے سبکدوش ہوئے۔" ناصرہ نے جھمکے اتارتے ہوئے ساجد سے کہا۔

"ہاں لیکن عجیب سے لوگ تھے، ہمارے درمیان بالکل نہیں جچ رہے تھے۔ بری زیور تک نہیں لائے، صالحہ کافی افسردہ لگ رہی تھی۔ میرا دل خوش نہیں ہے، قیامت کے روز میں اپنے والدین کو کیا جواب دوں گا؟" ساجد تھا تو بھائی...... بہت افسردگی سے بولا۔

"ارے، آپ تو فکر مند ہو گئے، اللہ نے آپ کا وعدہ پورا کروایا جو آپ نے اپنے مرتے ہوئے باپ سے کیا تھا اور صالحہ خوش رہے گی کہ ہر حال میں وہ مطمئن رہنا جانتی ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ آپ کا اب اپنا بھی گھر بار ہے، اب اس کو وہیں رہنا ہے۔" ناصرہ نے ساجد کو بہلایا...... لگتا تھا کہ گھر سے کانٹا نکل کر ساجد کے دل میں چبھ گیا۔

☆☆☆

"السلام علیکم۔" "خالہ رشیدہ کیسی ہیں، آپ تو صالحہ کی شادی کروا کر ایسی غائب ہوئیں کہ شکل تک نہ دکھائی۔ نہ مٹھائی کے پیسے لینے آئیں، میں نے سوچا خود خیر خیریت لے لوں اور مٹھائی کے پیسے بھی دے دوں۔" ناصرہ نے پانچ ہزار روپے خالہ رشیدہ کی مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔

"بس بیٹی، میں بھی بیٹیوں والی ہوں، پتا نہیں کیوں تمہاری نند کی شکل دیکھ کر مجھ کو احساس ہوا کہ کہیں میں کسی ظلم کا ذریعہ تو نہیں بن گئی، بس اِک عجیب سے ملال نے گھیر لیا مجھ کو، یتیم یسیر بچی تھی...... میں ہی اِک ماں کی طرح اس کی مرضی پوچھ لیتی۔" خالہ رشیدہ حقیقتاً افسردہ ہو گئیں۔

"ارے خالہ، اس کی کیا مرضی...... ارے غنیمت ہے کہ اپنے ٹھور ٹھکانے کی ہو گئی، ورنہ کون پوچھ رہا تھا۔ یہ تو میری نیکی ہے جو اس کے لیے ہاتھ پیر مارے، اب وہ جانے اور اس کا نصیب اور چھوڑیں یہ سب باتیں، میں اِک بہت ضروری کام سے آئی ہوں اس وقت آپ کے پاس۔" ناصرہ بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے خالہ رشیدہ کے قریب ہوئی۔

"آپ نے میری چھوٹی بہن کو دیکھا تھا نا شادی میں؟"

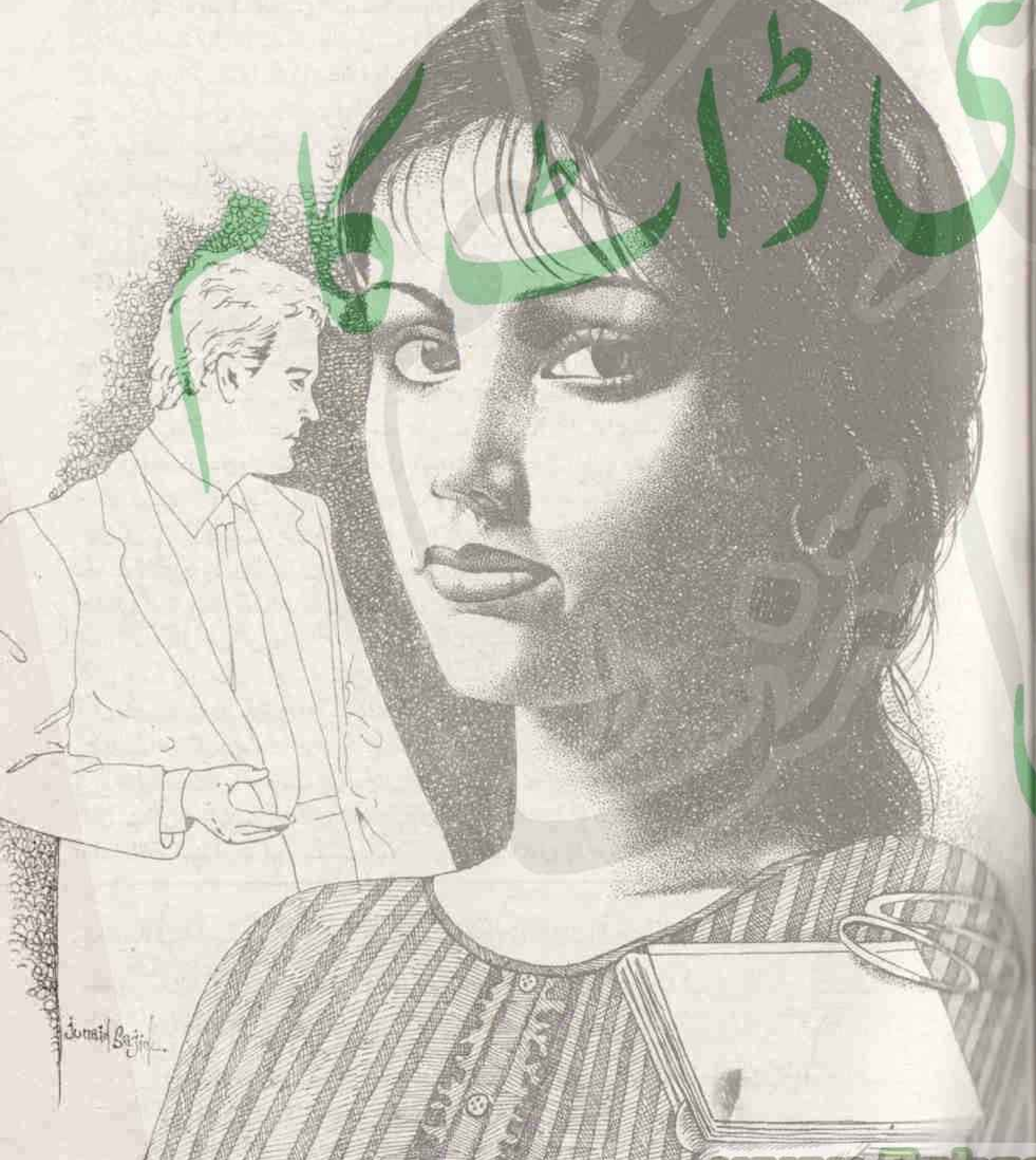
"کون سی وہ جو گہرے سانولے رنگ کی موٹی سی لڑکی تھی۔ وہ تھی نا تمہاری بہن؟" خالہ رشیدہ نے سادگی سے پوچھا۔

"خیر لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں تو ایک ہے، میری بہن...... اب آپ اس طرح تو نہ کہیں۔" ناصرہ برا مانتے ہوئے بولی۔

"بس اب آپ اس کے رشتے کے لیے کوشش کریں، میں جانتی ہوں آپ کے پاس ایک سے ایک اچھا رشتہ ہوتا ہے، آپ ہمارے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہیں، رشتہ بہت شاندار ہو اور مالی طور پر بہت مستحکم لوگ ہوں، اب شادی زندگی میں ایک بار تو ہوتی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں اب لڑکیوں کی خواہشیں کس طرح بڑھ گئی ہیں۔ کم از کم ایسا رشتہ تو ہو کہ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا دے اور رہائش کسی اچھے پوش علاقے میں ہو اور اگر ڈیفنس میں ہو تو سبحان اللہ۔ لڑکے کا اپنا ذاتی بزنس ہو یا کم از کم سی ایس ایس آفیسر تو ہو بس میں چاہتی ہوں کہ وہ بہت عیش کرے، اس کی جوتی اٹھانے کے لیے بھی ملازم ہو اور اس کو خوش دیکھ دیکھ کر میرے ماں باپ کی روحیں خوش ہوں۔" ناصرہ کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی۔

"لیکن بیٹا تمہارے تو ماں باپ نہیں ہیں...... پھر شادی کے اخراجات کون اٹھائے گا؟ اور جہاں تک میں جانتی ہوں تمہارا میکا تو کافی کمزور ہے۔" خالہ رشیدہ کچھ حیران سی تھیں۔

"ارے خالہ جب کمزور تھا تب تھا، اب تو میرے دونوں بھائی بہت اچھی نوکریاں کر رہے ہیں...... یہ تھوڑی کہ ان کی کمائی پر صرف ان کے بیوی بچوں کا حق ہے اور یتیم بہن کے لیے کیا محلے والے آئیں گے۔ آپ بے فکر رہیں...... ارے، میں تو حلق میں انگلیاں ڈال کر اس کا جہیز بنواؤں گی، کچھ بھی کریں، اپنے آپ کو بیچیں...... میں کچھ نہیں جانتی...... ماں باپ نہیں ہیں تو کیا بھاوجوں کی اتنی ہمت ہے کہ اس کو اکیلا سمجھیں، بس آپ اچھا سا رشتہ ڈھونڈیں ایسا رشتہ کہ سب دیکھتے رہ جائیں، میں آپ کو خوش کر دوں گی، دگنی فیس دوں گی...... بس خیال رہے کہ رشتہ ہر حال میں شاندار ہو، کچھ جلدی نہیں ہے۔ آرام سے دیکھیے...... میں کچھ نہیں جانتی ہاں اور......" ناصرہ پتا نہیں کیا کیا کہے جا رہی تھی۔ خالہ رشیدہ تو گم صم نند اور بہن کے تضاد میں الجھی کچھ سن ہی نہیں پا رہی تھیں۔



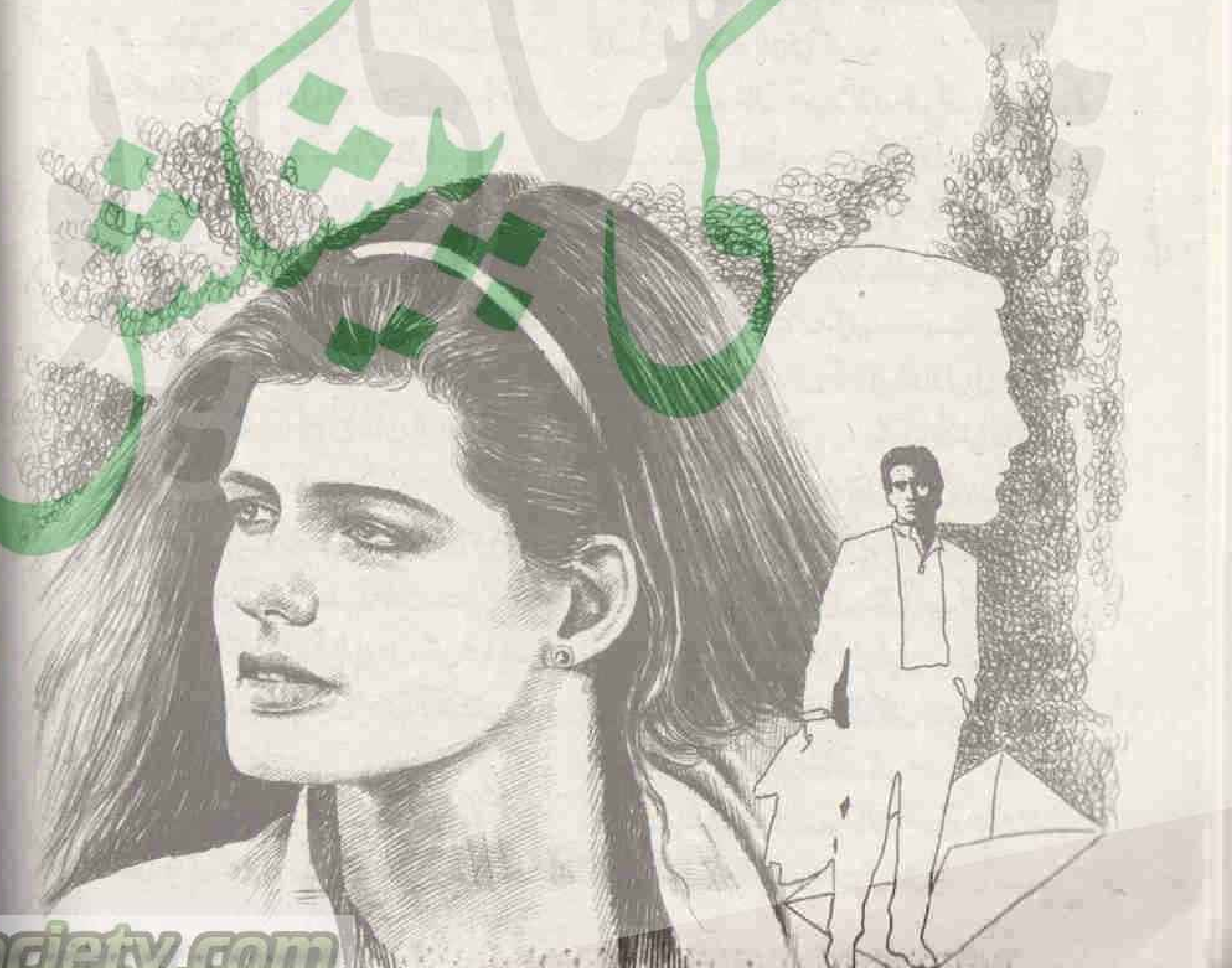
قسط 9

ایک تھی نیناں

راحت وفا

کچھ کھٹی سی، کچھ میٹھی سی ... کبھی شعلہ سی ... کبھی شبنم سی ... تھوڑی بھولی سی ... تھوڑی نادان سی ... محبت، نفرت اور اعتبار کے تکون میں سرگرداں ... رشتوں کے ٹکراؤ اور الجھاؤ کی داستان ... جس میں بھول اور نادانی کی کسک اور گناہِ بے لذت کی حقیقت کا اسرار ہر قدم پر کچوکے لگاتا ہے۔

ایک نابغہ روزگار، پرتجسس، نفسیاتی اور رومانوی ناول جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

خان جی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر مہ جبیں کو لاکھ خواہش اور فرمائش کے باوجود نہ ملازمت کی اجازت ملی اور نہ ذاتی کلینک اور اسپتال بنانے کی اجازت ملی۔ راجا صاحب متوسط طبقے کے بیروزگار نوجوان تھے۔ خان صاحب نے جانے کیا سوچ کر اکلوتی بیٹی ان سے بیاہ دی تجوریوں کے منہ کھول کے جہیز اور بنگلا، گاڑی، خدمت کے لیے مہ جبیں کی ہم عمر ملازمہ سکھاں بھی ساتھ میں رخصت کردی۔ سکھاں کے والدین نے رقم لے کر بیٹی ساتھ بھیج دی۔ بیٹی کے ارمانوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر مہ جبیں کو راجا صاحب نے میٹھی زبان سے رام کیا ان کی خواہش پر بنگلے کے وسیع کشادہ لان میں چھوٹا سا اسپتال نما کلینک بنا دیا یوں مہ جبیں کی خواہش کو راجا صاحب نے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنا دیا۔ دولت بڑھتی گئی مگر مہ جبیں بستر سے لگ گئیں۔ وسیمہ باپ کی دی ہوئی آزادی اور ناجائز دولت کی ریل پیل سے مادر پدر آزاد ہوگئی۔ بیٹا ریحان اختر بھی اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ وسیمہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کی حادثے کا شکار ہوئی اپنا بیٹا لاوارث چھوڑا۔ پولیس نے بچہ راجا صاحب تک پہنچایا۔ جس کا نام طلال رکھا گیا۔ مہ جبیں کے والدین اور سکھاں کے والدین اپنے آبائی علاقے میں خان جی کے سوتیلے بھائی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ راجا صاحب اور ڈاکٹر مہ جبیں کے انتقال کے بعد ریحان اختر نے بھانجے کی بہت لاڈ پیار سے پرورش کی مگر ستم رہ گئے۔ طلال ایک ضدی، ہٹ دھرم نوجوان تھا۔ ریحان اختر نے امیر کبیر گھرانے کی رابعہ سے محبت کی شادی کی، اس سے بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نیناں رکھا گیا۔ نیناں میں ریحان اختر کی جان تھی۔ اچانک رابعہ کو کچھ ایسا ثبوت دیکھنے کو ملا کہ وہ ریحان اختر سے نفرت کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان فصیل قائم ہوگئی۔ نیند کی گولیوں اور اعصابی تناؤ سے کمی کے لیے رابعہ تقریباً ذہنی مریضہ بن گئی مگر ریحان نے وہ ثبوت غائب کردیے۔ طلال کی نیناں پر نظر تھی جبکہ رابعہ کی بڑی بہن عارفہ کا اکلوتا بیٹا رمان احمر جو کہ ملٹی نیشنل کمپنی میں ریجنل منیجر ہے وہ اور نیناں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر رمان کی پھپھو کی بیٹی دعا فاطمہ، رمان سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہے لیکن وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے۔ دعا بار بار رمان سے کھلم کھلا نیناں کی وجہ سے دو بدو ہوتی ہے مگر رمان کے دل میں صرف نیناں ہے۔ عارفہ، رابعہ ان کی دادی زیتون بیگم بار ہا اس موضوع پر بات کر چکی ہیں۔ عارفہ کو نیناں پیاری ہے تو دعا بھی عزیز ہے مگر رمان نہیں مانتا۔ نیناں کی سہیلی مدیحہ جو کہ اس کی کالج فیلو ہے اس کا تعلق غریب گھرانے سے اس کے گھر میں بڑا بھائی زلفی، اماں اکبری اور پھپھو موجود ہیں پھپھو کو وہ آپا کہتے ہیں آپا کی زندگی سنگین حادثے کا شکار ہے اس لیے مدیحہ اور زلفی ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپا مدیحہ کو امیر سہیلی سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں سبحان رابعہ کے بہترین دوست ہیں مگر ان سے انہوں نے محبت نہیں کی جبکہ سبحان نے اپنی پیاری دوست کے بعد نہ شادی کی نہ اپنے تایا ابا کی بات مانی۔ بیرون ملک ملازمت کرلی اب وہ واپس آئے ہیں یہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کرکے باہر ہی مستقل سیٹ ہونے کے لیے...... جس پر تایا ابا راضی نہیں ان کے خیال میں سبحان کو سعدیہ سے شادی کرلینی چاہیے۔ جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ کہانی میں نیا موڑ آیا ہے کہ رابعہ کی ملاقات میڈیکل اسٹور پر سیلز مین ذوالفقار سے ہوئی ہے۔ جس نے دواؤں کے شارٹ ہونے اور نہ کھانے کا مشورہ دیا۔ رابعہ نے اس ہمدرد کی بات مان لی۔ رابعہ میں آنے والی خوش آئند تبدیلی سے نیناں بوا بہت خوش ہیں۔ ریحان اور طلال متحیر ہیں۔ طلال کی اور نیناں کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ طلال، نیناں پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ جس پر رابعہ بہت غصہ ہوتی ہیں اور ایمان اختر کو بتاتی ہیں لیکن ایمان اختر کوئی رسپانس نہیں دیتے۔ رابعہ کی ذوالفقار سے اچھی دوستی ہو جاتی ہے جس پر ریحان اختر جیلس ہوتے ہیں۔ رمان، رابعہ کے کہنے پر نیناں کو مدیحہ کے گھر لے کر جاتا ہے بائیک پر جو دعا کو اچھا نہیں لگتا۔ ریحان اختر، رمان کو آفس ملنے کے لیے بلاتے ہیں تو وہ آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ ایک ایگزی بیشن میں رابعہ کی ملاقات سبحان سے ہوتی ہے تو سبحان رابعہ کو پہلے والے انداز میں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ رشتے کرانے والی کے مشورے پر اکبری بیگم، ذوالفقار سے گھر تبدیل کرنے کو کہتی ہیں۔ طلال اور ریحان اختر چاہتے ہیں کہ نیناں آفس جوائن کرے لیکن وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ نیناں رمان کو فون کرتی ہے لیکن دعا اس سے بات نہیں کراتی۔ ریحان اختر، رمان کو اپنے ساتھ بزنس میں شامل کرنا چاہتے ہیں لیکن رمان راضی نہیں ہوتا۔ ذوالفقار اپنے گھر تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کررہا ہے، سبحان اپنا گھر بیچ کر بڑے ابا کو بھی اپنے ساتھ لے کر جارہے ہیں۔

(اب آگے پڑھیں)

کافی شاپ کے پُرسکون ماحول میں ذوالفقار کی نگاہوں کا کیمرا ان کے چہرے پر فکس تھا۔ وہ بوا کی وجہ سے بہ مشکل تمام وہاں آئی تھیں۔ اب ذہن گھر میں تھا۔

”ذوالفقار! کہو کیا ضروری بات کرنی تھی، مجھے ذرا جلدی ہے۔“

”آپ کو میرے پاس سے جانے کی جلدی ہے۔“ اس نے کمال حیرت سے پوچھا۔

”کیا مطلب......؟“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”رابعہ جی! ہم تو آپ کے پاس بیٹھ کر دنیا بھول جاتے ہیں۔“ مخمور لہجہ تھا، شریر اشارے رابعہ کو پہلو بدلنا پڑا۔

”ذوالفقار! آپ کی باتیں مجھے احساس دلاتی ہیں کہ میں آپ سے عمر میں کتنی بڑی ہوں۔“

”ارے، یہ کیا بات کی آپ نے، آپ کیا ہیں یہ ہم سے پوچھیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا مگر رابعہ کو کچھ اچھا نہیں لگا۔

”ذوالفقار! آپ میرے اچھے دوست ہو، مجھے زندگی میں آپ کا ملنا اچھا لگا ہے، میں واپسی کے سفر میں آپ کے تعاون کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ وہ اس کی بے باک نگاہوں سے کتراتے ہوئے بولیں۔

”صرف تعاون کو۔“

”آپ کا مجھ پر احسان ہے ورنہ میں آج بھی بستر پر ہوتی۔“

”تو احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔“ وہ خاصی بدتمیزی سے مسکرایا۔

”معلوم ہے مجھے، خیر آج کیا مسئلہ ہے بولو۔“ انہوں نے نارمل ہو کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ایکچو لی! مکان مالک کو باہر جانے کی جلدی ہے اور ہمارے گھر کا کوئی خریدار نہیں۔“ ویٹر نے کافی کا مگ وو براؤنی سامنے میز پر لا کر رکھے۔

”ہونہہ، اچھا......“ وہ فورک سے براؤنی کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولیں۔

”پھر کیا، بس ذہن الجھا ہوا ہے۔“

”آپ کا گھر کتنے کا ہے......؟“

”یہ تو خریدار کی حیثیت پر منحصر ہے۔“ وہ بہت ہوشیاری سے کہہ گیا۔

”بیچنے والے کی ڈیمانڈ کیا ہے؟“ وہ بولیں۔

”بس وہ تیس پینتیس لاکھ کا تو ہے۔“ وہ شاطرانہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تیس پینتیس لاکھ...... اگر میں خرید لوں تو......“ بڑی سنجیدگی سے انہوں نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

”آپ! آپ رابعہ جی ہمارے چھوٹے سے گھر کا کیا کریں گی......؟“ خاصی بناوٹ اس نے خود پر طاری کی۔

”کچھ نہیں، وہ میرے لیے غیر اہم ہے مگر آپ کے احسان کے سامنے بہت اہم ہے۔“ وہ غیر معمولی سنجیدہ ہوگئی تھیں۔

”رابعہ جی! آپ، آپ تو ایسے نہ کہیں، آپ اتنی خوب صورت ہیں کہ......“

”مجھے پتا ہے...... ویسے بھی آپ سے ایسے جملے سننے کی عمر نہیں ہے۔“ انہوں نے ہلکے سے طنز کا سہارا لیا مگر وہ خاصا چرب زبان تھا اس کی باتوں میں مطلب پرستی کی مہک موجود تھی۔ شاید وہ جان چکی تھیں مگر ان کے ذہن میں ایک ہی تاویل موجود تھی کہ کسی کی مدد کرنے سے بھی ذہنی سکون ملتا ہے اور اپنے حصے کی دولت پر تو اپنا حق ہوتا ہے۔ ذوالفقار نے کچھ نہ کچھ تو اُن پر توجہ دی ہے انہیں توجہ چاہیے تھی جو انہیں پھر سے زندگی کی طرف لے آئی تھی۔ ورنہ وہ ریحان اختر کے محبت نہ کرنے کے اعتراف کے بعد صدمے سے ہی مر جاتیں۔

''آپ کیا سوچنے لگیں......؟'' کافی لمحات انہوں نے کہیں دور جا کر گزارے تو ذوالفقار نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس اپنے بارے میں غور کر رہی تھی۔''

''میرا خیال ہے اب تو آپ کو میرے بارے میں غور کرنا چاہیے۔'' کافی بڑی بات وہ آسانی سے کر کے نگاہوں میں خمار لاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ناقابلِ یقین حد تک چونکیں......اور بولیں۔

''ذوالفقار! شاید آپ نہیں سمجھ سکے کہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں سب سمجھ کر ہی کہتا ہوں، مجھے آپ کے علاوہ کوئی سوچ نہیں رہی۔''

''کمال کرتے ہو، بالکل غلط سوچتے ہو۔'' وہ متغیر چہرے کا رنگ دکھا کے اٹھنے لگیں تو وہ اطمینان سے بولا۔

''رابعہ جی! پلیز بیٹھ جائیں، سوچ پر تو اختیار نہیں ہوتا۔''

''سوچ کا مقام ضرور ہوتا ہے۔'' وہ سنجیدہ ہو چکی تھیں۔

''کیا آپ کو محبت کی ضرورت نہیں؟''

''اس محبت کی نہیں جو آپ کے دماغ میں ہے۔'' انہوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''چلیں اس پر غور کریں، میں تو آپ کو بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بہت سلیقے سے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو وہ نظریں چرا کر اٹھیں اور بولیں۔

''میں چلتی ہوں، پھر بات ہوگی۔''

''اور وہ گھر......''

''ہاں، وہ کل بتاؤں گی۔'' ان کا موڈ خاصا اپ سیٹ ہو چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے باہر نکلیں۔ وہ پیچھے ہی رہ گیا......گاڑی تک پہنچی نہ تھیں کہ رمان نے اپنی گاڑی ان کے پاس جا کر روکی۔

''رابی خالہ!''

''ہوں، ہاں!'' وہ بوکھلا سی گئیں۔

''آپ یہاں، خیریت......اور موڈ کیوں خراب ہے؟'' رمان نے کچھ چبھتا ہوا سوال کیا۔

''وہ بس کافی پینے آ گئی تھی۔''

''اکیلے یا......؟''

''کیا مطلب......؟''

''اچھا خیر جائیں، آپ ڈسٹرب ہیں۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے نکال لے گئیں تب کافی دیر رمان بہت سنجیدگی سے بہت کچھ سوچتا رہا۔ ذہن میں اتھل پتھل سی مچ گئی۔ ریحان انکل کے جملے چٹکیاں لینے لگے تو اس نے سر جھٹک کر ان جملوں کی نفی کی۔

''نہیں، یہ ممکن نہیں، رابی خالہ کے لیے سبحان انکل صرف دوست ہیں۔'' سبحان کے خیال کے ساتھ ہی وہ لپک کر کافی شاپ کے اندر گیا چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کہیں سبحان نظر نہ آئے تو کچھ تسکین ملی۔

☆☆☆

اسی رات وہ کسی کام سے رابعہ خالہ کے گھر کے قریب گیا تو دل نیناں سے ملنے کے لیے مچل اٹھا مگر آسمان

ایک نوجوان عورت ایک چھوٹی سی دکان کی ٹیلی فون ڈائریکٹری بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔ ایک صاحب اس کے پیچھے ڈائریکٹری خالی ہونے کے منتظر تھے، عورت بے نیازی سے ڈائریکٹری الٹتی پلٹتی رہی۔ ان صاحب سے صبر نہ ہو سکا، وہ عورت سے مخاطب ہوئے۔ ''بی بی! مجھے افسر اطلاعات بننے کا شوق نہیں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ایک منٹ کے لیے ڈائریکٹری مجھے دے دیجیے۔ میں اپنا نمبر دیکھ کے آپ کو فوراً واپس کر دوں گا۔'' عورت نے ڈائریکٹری اس کے حوالے کر دی۔ ''برائے مہربانی ذرا جلدی کیجیے گا۔ ایک آنے والے مہمان کے لیے کوئی خوب صورت سا نام تلاش کر رہی ہوں۔''

فاطمہ واحد، سمن آباد - کراچی

پر سیاہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ سن کر بارش کے متوقع ہونے کا یقین ہو گیا۔ ایک دل چاہا کہ جائے اور ایک دل چاہا کہ موسم کے تیور کڑے ہیں۔

''یار! ایسے موسم میں دلبر کا دیدار ہی تو ہونا چاہیے۔'' یہ خیال آتے ہی اس نے گاڑی کا رخ اس طرف موڑ لیا......مگر گیٹ سے گاڑی اندر داخل ہوتے ہی موٹی موٹی بوندیں گریں اور پھر گرتی چلی گئیں۔ وہ گاڑی لاک کر کے اندر آ گیا تو ریحان صاحب ہاتھ میں گاڑی کی چابی اور موبائل پکڑے باہر نکل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکراتے مسکراتے سنجیدہ ہو گئے، پیچھے آتے فیضو کو گردن گھما کر دیکھا اور کہا۔

''بیگم صاحبہ سے کہو کہ رمان صاحب کو سمجھائیں......'' رمان ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا کچھ نہ سمجھا، کچھ نہ جانا......وہ گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گئے تو اسے ہوش آیا۔ اس وقت تک نیناں کو ٹیرس پر اس کے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آ گئی۔ وہ گم صم سا رابعہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ نیناں بھی پیچھے پیچھے وہیں آ گئی۔

''ارے، تم کب آئے؟'' رابعہ کو رمان کو دیکھ کر حیرت سی ہوئی۔

''بس ریحان انکل جا رہے تھے اور میں آیا تھا۔''

''اچھا! لیکن تمہیں کیا سمجھانا ہے یہ تو مسٹر ریحان نے بتایا ہی نہیں......'' رابعہ کے لہجے میں چبھن تھی۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو مجھے کیا سمجھانا ہے؟'' وہ شولڈر جھٹک کر بولا۔

''نہیں معلوم، خیر کیا فرق پڑتا ہے، بیٹھو۔''

''رابی خالہ! کوئی بات ہے ضرور۔''

''ریحان کے دماغ میں کیا ہے، یہ ہمیں جاننے کی ضرورت نہیں۔''

''مما! بارش ہو رہی ہے۔'' نیناں نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''ہاں، اچھی سی چائے اور پکوڑے بنواتی ہوں۔'' رابعہ کو بھی ایک دم یاد آ گیا، وہ باہر چلی گئیں اور وہ نیناں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں تو تمہیں لے کر باہر جانا چاہتا تھا۔''

''تو چلیں۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''مگر اب نہیں......''

"کیوں، چلیں نا! باہر بہت پیارا موسم ہے۔" وہ چھوٹی سی بچی کی طرح مچلی۔ وہ چپ چپ سا تھا۔ اس کی طرف دیکھا تو اس کی پیاری معصوم صورت پر ایک دم ڈھیر سا پیار آ گیا۔

"چائے آ رہی ہے پھر جائیں گے۔"

"میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر جانے لگی تو اس نے چھیڑا۔

"کیا غضب کی بات ہے کہ تمہیں بھی تیاری کی ضرورت ہے۔"

"میرا نیا ڈریس سل کر آیا ہے وہ پہن کر آتی ہوں۔" وہ گلابی سی ہو کر بھولپن سے کہتے ہوئے چلی گئی۔ کچھ دیر میں رابعہ آ گئیں، بوا نے فیضو کے ہاتھ ٹرے بھیج دی مگر وہ سنجیدہ سا کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

"ریحان کی بات کا اثر مت لو وہ جھوٹ بولتے ہیں، دھوکا دیتے ہیں۔" رابعہ کو اندازہ تھا کہ رمان جیسا شوخ و شنگ نوجوان چپ اور کھویا، کھویا کیوں ہے؟

"مگر ذہن میں تو جنگ چھڑ جاتی ہے، ریحان انکل کے جھوٹ اور فریب کی میرے پاس گنجائش کہاں......؟"

"پھر جھٹک دو سب الجھنیں، آئیں گے تو میں پوچھوں گی۔"

"نہ بھی پوچھیں تو مجھے کون سا فرق پڑتا ہے۔" شامی کباب کھاتے ہوئے وہ بولا۔

"شاید فرق ڈالنے کے لیے ریحان کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے۔"

"میں نے انہیں واضح کر دیا ہے کہ میں ان کے پاس ملازمت نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک کیا، گند سے دور رہنا بہتر ہے۔"

"تو انہیں اصرار نہیں کرنا چاہیے، موڈ آف نہیں کرنا چاہیے۔"

"وہ ضدی انسان ہیں، موڈ کی پروا مت کرو۔" رابعہ نے چائے میں چینی مکس کر کے اسے کپ تھماتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

چند دن کی ملاقاتوں نے مدیحہ کے انگ انگ میں شرارے بھر دیے تھے...... ہر کام سے غافل، پڑھنے لکھنے سے بھی غافل اپنی ہی دنیا میں مست اور مگن رہنے لگی تھی۔ پرانے سے ٹیپ ریکارڈ کے ساتھ وابستگی کا یہ عالم تھا کہ پرانے گھسے پٹے کیسٹس جنہیں زلفی نے سن سن کر اسٹور میں پھینک دیا تھا انہیں مدیحہ نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اب بار بار آئینہ دیکھنے اور گانے سننے کے علاوہ کوئی کام نہیں رہا تھا۔

"مدیحہ، مدیحہ!" اکبری بیگم کو پوری قوت سے چلانا پڑا تب کہیں اس نے آواز سنی...... آپا نے خشمگیں نگاہوں سے آنکھوں میں کاجل لگاتی مدیحہ کو گھورا۔

"جی اماں آئی۔"

"یہ گھر کو تم نے کیا بنا دیا ہے، مغرب کی اذان سنائی دی تمہیں؟" اکبری بیگم نے خوب لتاڑا۔

"گانے سننا کیا گناہ ہے؟"

"ہاں گناہ ہے اور کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" آپا نے کمرے سے باہر آ کر سختی سے پوچھا۔

"آپا! پڑھتے، پڑھتے بور ہو جاتی ہوں تو گانے سن کر فریش ہو جاتی ہوں۔" وہ اٹھلائی۔

"بند کرو یہ بے ہودہ جواز، پڑھائی لکھائی سے بھی غافل ہو، امتحان دینا ہے اور تمہیں آئینے سے فرصت نہیں۔" اکبری بیگم پورے جلال میں تھیں۔

"آپا آپ سمجھائیں اماں کو۔"

"کیا...... کیا سمجھاؤں کہ تم اونچی ہواؤں میں ہو۔" آپا نے متانت سے جواب دیا تو وہ ٹپٹا گئی۔

"پڑھتی تو ہوں نیناں کے پاس۔"

"جانے کیا پڑھتی ہو، سرمہ سلائی ہاتھ میں رہنے لگی ہے۔" اکبری بیگم بڑبڑائیں اور کمرے میں چلی گئیں۔

"ماں کی فکر مندی غلط نہیں ہوتی، تبدیلی کی وجہ امیر سہیلی ہے یا......؟" آپا نے بہت مدھم آواز میں پوچھا۔ جیسے کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا...... یا پھر وہ اپنی آواز خود بھی جیسے سننے کو تیار نہیں تھیں۔

"آپا! آپ کو اماں کی طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

"مجھے تو زیادہ فکر ہے، تمہاری جس گھر سے تعلق داری بن گئی ہے وہ کچھ مناسب نہیں۔" وہ کچھ سے کچھ کہہ گئیں۔

"کیوں، کبھی وجہ بھی بتائیں، نیناں بہت اچھی ہے، اس کی مما بہت خوش اخلاق ہیں اور طلا......؟" وہ بولتے بولتے رک گئی تو آپا نے پُرتفتیش نگاہوں سے دیکھا۔

"کیا...... کیا بولو، مکمل کرو۔"

"نیناں کے طلال بھائی بھی بہت نائس ہیں۔" بڑے سلیقے سے اس نے طلال کا ذکر کیا تو آپا کو جھٹکا لگا۔

"تو، تمہیں کیا لینا دینا، اب گھر میں ہی پڑھو۔"

"کیا؟ اس میں کیا برا ہے اگر کچھ برا ہوتا تو میں ذکر کیوں کرتی؟" وہ بگڑی۔

"نیناں تک رہو بس۔" آپا نے تنبیہ کی اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔

مدیحہ نے واضح طور پر ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔ آپا سے بے پناہ محبت کے باعث وہ بہت فکر مند سی ہو گئی۔ آپا کو تو اداس دیکھ نہیں سکتی تھی...... اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ پُرسکون اور خوش و خرم رہیں، ان کے پاس زمانے کے عطا کردہ رنج و غم ہی تو تھے جن کے ساتھ ہی جوانی بڑھاپے میں بدل گئی تھی...... بچا ہی کیا تھا۔

"وہ شاید ٹھیک کہتی ہیں دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے لیکن ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا کہ سب ہی شک کریں۔ وہ سب اچھے ہیں اور طلال...... طلال کو تو میں نے نیناں کے کہنے سے بھی مختلف پایا ہے...... امیر ہونا کوئی جرم نہیں، ضروری تو نہیں کہ سب برے ہی ہوتے ہیں، یہ خیال ٹھیک نہیں۔" اس نے سوال جواب کر کے خود کو اپنی جگہ ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا اور پھر طلال کا چہرہ اس کی سوال کرتی نگاہیں اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔

☆☆☆

ریحان اختر کے حکم کے مطابق طلال نے سالوں سے بند کلینک کھلوا دیا۔ دھول، مٹی اور مٹی کا ڈھیر بن

جانے والا کلینک جو کہ چھوٹا سا اسپتال ہی تھا، صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ دور برآمدے میں ستون سے لگی بوا کی اشکبار نگاہوں نے سب منظر دیکھا اپنی ڈاکٹر بی بی کی پُرنم نگاہیں دیکھیں، کس ارمان اور چاہ سے مسیحائی کا گھر بنا تھا اور کس بے دردی سے اسے مسمار کرادیا گیا۔ طلال سیاہ عینک کے شیشے صاف کرتا ہوا واپس آیا تو وہ پھٹ پڑیں۔

''تمہیں معلوم نہیں کیسی محبت تھی تمہاری نانو کو..... تم نے مزدور لگادیے، گرا ڈالا۔''

''نانو کو مرے زمانے گزر گئے ہیں، بند کلینک انڈے نہیں دے رہا تھا۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

''کچھ چیزیں یادگار ہوتی ہیں، مجھے بی بی کی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں۔'' وہ رودیں۔

''اوہ! اللہ کا واسطہ، یہ ناٹک بند کریں، اپنی حالت پر رحم کریں۔'' طلال نے زور سے ہاتھ جوڑ کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ ملبے کے ڈھیر کو دیکھ کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے مڑیں تو رابعہ اور نیناں کو دیکھ کر رک گئیں..... رابعہ کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کیوں رنجیدہ اور آبدیدہ ہیں۔

''بوا! طلال کا کوئی قصور نہیں، یہ سب ریحان اختر کے کہنے پر ہوا ہے۔''

''یہی تو دکھ ہے۔''

''نہ کریں دکھ! انہوں نے اس جگہ کچھ اور بنانا ہوگا۔'' رابعہ نے بہت نرمی سے کہا۔

''مگر مما! یہ دادو نے بہت پیار سے بنوایا تھا۔'' نیناں کو بھی ملال ہوا۔

''چھوڑو بیٹا، اب وہ نہیں ہیں تو ریحان کی مرضی ہے۔'' رابعہ نے بیٹی کو بھی سمجھایا۔

''رابعہ! اب مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔'' بوا کی آواز بھیگی تھی، لہجے میں کپکپی موجود تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہ کریں، بے حس ہوجائیں۔'' رابعہ نے کندھے سے لگ کر تسلی دی۔

''رابعہ بیٹی! دھیرے دھیرے وہ سب نشان مٹ رہے ہیں۔''

''کوئی نئی بات نہیں ہے بوا! آپ خود تو بتاتی ہیں کہ آپ کی بی بی کو راجا صاحب نے کتنا صدمہ دیا۔ انہیں بستر سے لگادیا۔ یہ کلینک ان کے لیے اذیت گاہ بن گیا تھا، اس کا گر جانا ہی بہتر ہے۔'' رابعہ نے کہا تو وہ پلکیں دوپٹے سے صاف کرکے اثبات میں گردن ہلا کر چپ رہیں۔

''مگر مما! بابا پوچھ ہی لیتے۔'' نیناں کو بھی ملبے کا ڈھیر دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

''کس سے؟ ریحان اختر خود مختار ہیں۔'' رابعہ نے طنزیہ کہا اور اندر چلی گئیں۔ نیناں، بوا کو سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ اسی وقت طلال تیار ہوکر باہر نکل رہا تھا کہ رمان کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی..... اس کی پیشانی پر ایک ہزار ایک سلوٹ نمودار ہوئی مگر حسبِ معمول رمان نے نوٹس نہیں لیا کیونکہ وہ اپنی امی کے کہنے پر رابی خالہ اور نیناں کو لے جانے آیا تھا..... بڑی امی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ آئی سی یو میں تھیں، عارفہ اور گلو ان کے پاس تھے۔ رمان اسپتال سے ہوکر انہیں لے جانے آیا تھا۔ اس لیے بہت سنجیدہ تھا..... مگر طلال نے حسبِ عادت بات ضرور کی۔

''ہیلو! مسٹر رمان.....''

''ہیلو۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''نیناں اب بھی ٹیوشن پڑھتی ہے کیا؟'' اس کے جملے میں گہرا طنز تھا۔

''شٹ اپ.....'' رمان اشتعال میں کہہ کر آگے چل دیا۔

''مسٹر رمان! یہاں غیر ضروری آمد کی آپ کو اجازت نہیں۔''

''یار! آپ بکواس سے باز نہیں رہ سکتے، میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں، رابی خالہ اور نیناں کو لینے آیا ہوں۔''

''مگر ماموں شہر سے باہر ہیں۔''

''سو وہاٹ.....؟'' وہ چڑ گیا۔

''تو آپ مامی اور نیناں کو نہیں لے جاسکتے۔''

''جسٹ شٹ اپ.....'' رمان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا رابعہ کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر زیتون بیگم کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں..... رابعہ اور نیناں نے ان کا سفید سرد چہرہ اور بند آنکھیں دیکھیں، دلخراش چیخیں حلق کے اندر ہی دم توڑ گئیں اور حیرت و تاسف کے مارے آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ عارفہ نے بڑے حوصلے سے ان دونوں کو سہارا دیا۔ رمان کے سینے سے گلو لگا بین کر رہا تھا..... حقیقت تو یہ بھی تھی کہ عارفہ کے اپنے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی، وہ سچ مچ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم ہوگئی تھیں..... مگر موت پر کب کسی کا اختیار رہتا ہے؟ یہ جملہ سوچ کر ایک دوسرے کو سنا کر حوصلہ دینے کی پوری کوشش کی جارہی تھی۔ ایمبولینس میں میت گھر پہنچی، رمان نے شہر کے اندر اور باہر سب عزیز و اقارب کو فون پر اطلاع دی۔

''رمان! سبحان کو بھی اطلاع دے دو۔'' رابعہ نے فون کرتے دیکھ کر کہا۔

''اور ہاں! ریحان کو بھی فون کرو۔'' عارفہ نے آکر کہا تو رابعہ نے منع کردیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ شہر سے باہر ہیں۔''

''کچھ بھی سہی..... اطلاع تو دینی چاہیے آگے ان کی مرضی.....'' عارفہ نے سمجھایا اور ٹی وی لاؤنج میں چاندنیاں بچھوانے چلی گئیں۔

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں..... ورنہ وہ یہی کہیں گے کہ مجھے کون سی اطلاع دی تھی۔'' رمان نے بھی عارفہ کی تائید کی۔

''جو، جی میں آئے کرو مگر وہ خود غرض انسان کبھی احساس نہیں کرے گا۔'' رابعہ یہ کہہ کر عارفہ کے پاس چلی گئیں..... تب نیناں سہمی سہمی سی، روئی، روئی سی اس کے پاس آئی اور فون اس کے ہاتھ سے لے کر بولی۔

''بابا کو میں فون کرتی ہوں۔'' رمان مان گیا۔ اس نے نمبر ملایا..... مگر بڑی دیر بیل جانے کے باوجود فون اٹینڈ نہیں ہوا پھر اس نے دوسرا نمبر ملایا مگر اس پر بھی بات نہ ہوسکی۔ وہ افسردہ سی ہوکر فون واپس دے گئی مگر چند لمحوں بعد پہلے نمبر سے ایک لائن کا میسج آیا۔

”کیا بات آپ کی سمجھ میں آگئی؟“ رمان نے کئی بار پڑھا مگر کچھ معنی و مفہوم سمجھ میں نہ آئے...... کچھ دیر بعد بجلی سی دماغ میں کوندی وہ سمجھ گیا کہ انہوں نے یہ جملہ رمان احمر کے لیے بھیجا ہے، رمان کے تن بدن میں آگ لگ گئی، وہ غصے سے کھول اٹھا مگر ضبط کے سوا کوئی چارا نہیں تھا، یہ موقع محل ردِعمل کا نہیں تھا۔ اس لیے پوری قوت سے فون میز پر پٹخ کر اس طرف آگیا جہاں باہر مردوں کے لیے فرشی نشست کا انتظام ہو رہا تھا...... اس کام میں وہ یہ بات بھول بھال گیا مگر جونہی وہ کسی کام سے اندر آیا تو نیناں نے پوچھ لیا۔

”رمان! بابا کو پھر سے فون کیا؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے پتنگے لگ گئے۔

”کیوں ضروری نہیں ہے، میری بڑی امی چلی گئیں، بابا کی کچھ لگتی تھیں۔“ نیناں پوری شدت سے چلائی۔

”کچھ نہیں لگتی تھیں، اپنے کام سے کام رکھو۔“ اس نے اور زیادہ سختی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پہلی بار وہ اس طرح پیش آیا تھا کہ اس کا نازک سا دل دکھ سے بھر گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

”کیا ہوا؟“ بوا کچھ دیر پہلے ہی پہنچی تھیں اسے آبدیدہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”کچھ نہیں، مجھے ڈانٹا ہے۔“ وہ بوا کے گلے لگ کر رو دی۔

”ارے ڈانٹا کہاں ہے، وہ تو اکیلا ہے اس لیے پریشان ہو گیا ہے۔“ عارفہ کچھ قریب تھیں، سن کر بولیں۔

”رمان نے بابا کو فون نہیں کیا۔“

”ارے اپنے بابا کی بات نہ کرو، وہ شہر سے باہر ہیں، انہوں نے کون سا آنا ہے؟“ بوا نے اس کے خیال کی تردید کر دی۔

”کہاں گئے ہیں؟“

”یہ تو نہیں معلوم۔“

”طلال بھائی سے پوچھیں۔“

”ہونہہ، خواجہ کا گواہ ڈڈو، چلو بیٹھ کر کلمہ پڑھیں۔“ بوا نے تمسخر اڑایا اور اسے ساتھ لیے اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

”فیضو! فیضو! جلدی ناشتا لے آؤ۔“ طلال نے اپنے کمرے سے ہانک لگائی۔

”جی لاتا ہوں۔“ فیضو نے کچن سے جواب دیا...... جلدی جلدی ٹرے میں ٹوسٹ آملیٹ اور جوس کا گلاس رکھ کر باہر نکلا تو ٹھٹکا۔

”سلام بی بی......“ جلدی سے مدیحہ کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“

”وہ سب تو نہیں ہیں۔“

”کہاں ہیں، نیناں بھی......؟“ وہ چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

”سب بیگم صاحبہ کے گھر ہیں۔“

”خیریت......؟“

”بیگم صاحبہ کی دادی فوت ہو گئی ہیں۔“ فیضو نے کہا۔

”اور یہ ناشتا......؟“ اس کی نگاہوں میں پُرشوق سوال تھا۔

”یہ طلال صاحب کے لیے ہے۔“

”طلال صاحب گھر پر ہیں۔“ ایکدم ہی چہرہ گلرنگ ہو گیا۔ فیضو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی طلال کی آواز آگئی تو وہ ڈر کے اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس نے ایک دو لمحے کچھ سوچا پھر خود بھی فیضو کے پیچھے طلال کے کمرے کی جانب آگئی...... ہلکے سے دروازے پر دستک دے کر فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ سفید دودھیا کڑکڑاتے شلوار سوٹ میں ملبوس بیڈ کے کنارے پر رکھے خوب صورت سیاہ سینڈل پہن رہا تھا اسے یوں خلافِ توقع دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ فیضو نے کچھ بتانا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ چلا گیا۔

”سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ ہکلائی۔

”وہ کیسے؟“ دلچسپی سے پوچھا گیا۔

”میرا مطلب ہے آپ ناشتا کریں۔“

”مس مدیحہ آئیں بیٹھیں، ہم اتنے برے تو نہیں ہیں۔“ اس نے خاصی ادا سے کہا۔

”ارے آپ تو بہت اچھے ہیں۔“ مدیحہ چار قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

”سچ، دراصل آپ خود بہت اچھی ہو۔“

”میں...... میں نہیں تو، اماں اکثر کہتی ہیں کہ میں کالی کلوٹی ہوں، بھائی کی نظر اتارنے والا ٹیکا ہوں۔“ وہ بڑے بھولپن سے بولی تو وہ کھلکھلا کے ہنستا چلا گیا۔

”یہ تو آپ کی اماں ٹھیک نہیں کرتیں، آپ کے نمکین سراپا میں جو جاذبیت ہے وہ کوئی ہم سے پوچھے۔“ نگاہوں میں خمار آلود مستی بھر کے وہ قریب کھڑے ہو کر بولا تو وہ کپکپا اٹھی، ریڑھ کی ہڈی میں سے کرنٹ گزرا۔

”وہ، میں چلتی ہوں، نیناں کو بتا دیجیے گا۔“ وہ خاصی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

”اجی چھوڑیں کوئی ضرورت نہیں نیناں کو بتانے کی۔“

”جی......!“

”جی، اپنی اور ہماری ملاقاتوں کو پردے میں ہی رہنے دو۔“ اس نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تو مدیحہ نے لمحوں میں دور تک کا سفر طے کر لیا۔

”اب میں چلتی ہوں۔“

”ارے کیسے جائیں گی؟ میں مامی کی طرف جنازے میں جا رہا ہوں، آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ جلدی سے ناشتا کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں، وہ ہماری طرف آپ کی گاڑی نہیں جا سکتی۔“ وہ شرمندگی سے منمنائی۔

''اوہ! تو پھر.....''

''میرے بھائی آجائیں گے، میں فون کر دیتی ہوں۔''

''ہوں! اس وقت تک تو ہمارے پاس بیٹھیں۔'' اس نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''شکریہ!'' اس نے گلاس تھام لیا اور قریب ہی بیٹھ گئی۔

''کاش! مجھے جانے کی جلدی نہ ہوتی تو.....'' اس نے جلدی جلدی ناشتا کرتے ہوئے توقف کیا۔

''تو.....؟'' دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے پوچھا۔

''تو آپ جیسی تمکین کے ساتھ گپ شپ رہتی، مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ میری دوست ہیں۔''

''نیناں تو آپ کی بات بھی ٹھیک سے نہیں کرتی۔'' مدیحہ نے کہا تو طلال کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا، بہرکیف آپ اپنی بات کرو صرف اپنی۔'' طلال نے کمال ہوشیاری سے کہا تو وہ سچ مچ اپنے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ ایک دم وال کلاک پر نظر پڑی تو وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوہ! میں تو لیٹ ہو گیا ہوں، اب میں جا رہا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا جبکہ مدیحہ وہیں جمی رہ گئی۔ خوب صورت سازوسامان سے آراستہ کمرا، پرفیوم کی بھینی بھینی مہک اور اس کے وجیہہ سراپا کا احساس بہت پُرکشش تھا۔ دل نے دھیرے سے دعا کی کہ کاش وہ یہیں اس خوابناک ماحول کا حصہ بن جائے۔

☆☆☆

''کہاں کی تیاری ہے میاں برخوردار.....؟'' وہ تیار ہو کر الماری سے ٹوپی تلاش کر رہے تھے کہ بڑے ابا بڑی عجلت میں کمرے میں داخل ہوئے۔

''جی، وہ نمازِ جنازہ کے لیے جا رہا ہوں۔''

''اچھا تو تمہیں پتا چل گیا۔''

''کیا.....'' سبحان کچھ نہ سمجھے۔

''آخر کو اس بے چاری کا باپ جہاں سے رخصت ہو گیا۔ اب کیا فائدہ جنازے میں جانے نہ جانے کا، بے فائدہ ہے وہ زندگی جس میں احباب کا ہجوم ہو مگر پیکرِ خلوص ایک بھی نہ ہو۔'' وہ بہت اپ سیٹ تھے جبکہ سبحان کی لاعلمی بتا رہی تھی کہ وہ حیران ہے۔

''میں کچھ نہیں سمجھا، میں تو رابعہ کی دادی کی نمازِ جنازہ میں جا رہا ہوں۔''

''اوہ! اچھا یہاں بھی سبحان صاحب بے حس ہی رہے۔'' ان کے لہجے میں حیرت کے ساتھ طنز بھی شامل ہو گیا۔

''آپ پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔''

''سعدیہ کا باپ مر گیا ہے..... بعد نمازِ ظہر نمازِ جنازہ ہے۔''

''اوہ، اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' وہ ایک دم افسردہ ہو گئے۔

''وہ بے چاری اب بالکل ہی تنہا پڑ جائے گی مگر ہمیں کیا ہم تو اپنی دنیا میں آگندہ ہیں۔'' وہ بولے۔

''میں واپسی پر آپ سے بات کروں گا، لیٹ ہو رہا ہوں۔'' انہوں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

''جی، ضرور جاؤ وہاں سے لیٹ ہو گئے تو۔'' وہ بڑبڑائے۔

''آپ نہیں گئے۔'' انہوں نے غیرارادی طور پر پوچھ لیا۔

''نہیں، تماشا دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔'' وہ جھلا اٹھے۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو، موت زندگی پر اللہ کا اختیار ہے۔ سعدیہ کے ابا کوئی مرنے والے پہلے آدمی نہیں ہیں اور اس میں ہمارا کیا دخل ہے۔'' وہ ان کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''جہاں ہمارا اختیار ہے وہاں بھی تو ہم کچھ نہیں کرتے۔'' ان کا اشارہ ان کے شادی نہ کرنے کی طرف تھا۔

''نہیں، ہم ہر معاملے میں بے اختیار ہیں۔'' انہوں نے رد کیا۔

''اب اس بچی کا کیا ہو گا؟'' بڑے ابا نے پھر حسبِ پسند موضوع چھیڑا۔

''جو اللہ کو منظور ہو گا۔'' وہ مختصراً بولے۔

''کچھ خیال کرو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائیں گے۔'' بڑے ابا نے آخری ہتھکنڈا اختیار کیا تو وہ مسکرا دیے۔

''ایک دو روز میں گھر کی رجسٹری ہونے والی ہے، نوردین بابا سے کہیے آپ کی الماریوں کا سامان نکال کر پیک کرنا شروع کریں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھے تو پشت سے بڑے ابا کی آواز آئی۔

''کان کھول کر سن لو سعدیہ ہمارے ساتھ جائے گی۔''

''جی ہاں! ہم نے مال گاڑی میں جانا ہے۔'' وہ پلٹ کر شگوفہ چھوڑنے سے باز نہ آئے۔

''سن لیا چٹ پٹا جواب.....'' نوردین بابا وہاں آتے ہوئے بولے۔

''مگر ہم اس جواب سے مطمئن ہونے والے نہیں۔'' بڑے ابا نے جواب دیا۔

''چھوڑ دیں سرکار! سعدیہ بیٹا کا بھی اللہ مالک ہے۔''

''کیسے چھوڑ دیں؟'' وہ مدھم آواز میں بولے۔

''ایسے ہی سبحان میاں کو پسند جو نہیں۔'' نوردین بابا خود بھی ان دنوں بہت افسردہ سے تھے۔

''ضروری نہیں کہ جو اسے پسند نہیں ہم وہ سب مان لیں۔''

''مان تو آپ رہے ہیں، یہ گھر آپ کو چھوڑنا پڑ رہا ہے، مجھے اس عمر میں یہ گھر چھوڑنا ہے۔'' نوردین بابا کی آواز میں رقت طاری ہو گئی۔ بڑے ابا کی آنکھوں میں بھی پانی تیرنے لگا۔ کمرے کی چھت، در و دیوار دیکھنے لگے۔

''نوردین! کیا کریں، سفر وسیلۂ ظفر ہے سبحان کے لیے۔''

''جی سرکار اللہ انہیں خوش رکھے۔''

''تم فکر نہ کرو تمہارا پاسپورٹ ویزا سب کا انتظام کر رکھا ہے سبحان نے۔''

''سچ سرکار!'' ان کی بوڑھی آنکھوں میں موتی جگمگائے۔

''ہاں! بالکل سچ مگر کاش ہم میں سے کسی کو بھی جانا نہ پڑتا۔'' وہ پھر بھی ناخوش سے ہو کر بولے اور کمرے سے باہر چل دیے۔

☆☆☆

تدفین کے بعد مرد حضرات قبرستان سے واپس آ گئے تھے۔ منہ کے رستے زندگی کی نمود و بقا کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا مگر رابعہ اپنے کمرے میں بیڈ کی پٹی سے سر ٹکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ تبھی نیناں ان کا موبائل فون لیے آ گئی۔

''مما! مما!''

''ہوں!''

''آپ کا فون ہے۔'' نیناں نے فون ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

''ہیلو!''

''ہیلو!''

''جی۔'' نمبر اور نام کی شناخت کے بعد وہ فقط اتنا بولیں...... نیناں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ فون سنتے ہوئے وہ کچھ بیزار سی تھیں...... وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ ایک دم بولیں۔

''وہاٹ! یو مین میں نے بوگس چیک دیا۔'' ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ نیناں فکرمند سی ہو گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ خیر میں بینک سے پتا کرتی ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو نیناں ان سے لپٹ گئی۔

''مما، کیا ہوا......؟''

''کچھ نہیں، کچھ نہیں......''

''کونسا چیک؟''

''لگتا ہے آپ کے بابا نے گھٹیا حرکت کی ہے، ہمارا جوائنٹ اکاؤنٹ ہے لیکن اس سے چیک کیش نہیں ہوا۔'' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

''لیکن آپ نے کس کو چیک دیا۔''

''بس ایک چھوٹا سا گھر خریدا ہے۔'' وہ چھپا نہ سکی۔

''وہاٹ؟'' نیناں چلا اٹھی۔

''کسی کی ضرورت تھی مگر دکھ یہ ہے کہ ریحان اختر نے میری عزت دو ٹکے کی کرا دی۔'' انہیں ایک دم ہی غصہ آ گیا۔

''آپ بابا سے پوچھیں۔''

''ہوں! کیا کیا پوچھوں... خیر آپ آرام کرو، میں ذرا باہر سے ہو کر آتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں...... وہ باہر نکل رہی تھیں، رمان ان کے فوراً بعد کمرے میں آ گیا۔

''رابی خالہ کہاں گئی ہیں؟'' اس نے نیناں سے پوچھا۔

''باہر شاید عارفہ خالہ کے پاس۔''

''دراصل سبحان انکل ان سے ملنا چاہ رہے تھے۔'' ٹانگیں پھیلاتے ہوئے تھکن سے چور آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

''رمان!''

''ہوں!'' اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ مما کو لے کر کہیں دور چلی جاؤں۔''

''کیا؟ اِدھر دیکھو، میرے بنا، مجھ سے دور۔'' وہ یکدم جذباتی ہوگیا تو وہ ٹپٹا گئی۔

''بابا کی وجہ سے مما ہرٹ ہوتی ہیں۔''

''نیناں! ان کی پرابلم ہم سولو نہیں کر سکتے مگر ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے، یہ عہد کرو۔'' وہ بے قرار ہوکر اس کے قریب ہوکر بیٹھ گیا۔ نگاہیں چار ہوئیں اور عہد ہوگیا۔

''نیناں! تمہارے بابا اتنی آسانی سے شاید تمہیں میرے حوالے نہ کریں مگر ہمیں اپنی جنگ لڑنی ہے۔'' غیر ارادی طور پر اس کا نرم ہاتھ تھام کر خدشہ ظاہر کیا تو خوف سے وہ زرد پڑ گئی۔

''پلیز! پلیز رمان مجھے طلال بھائی سے بچالینا۔''

''ارے دھت تیرے کی، وہ موچھل میرا مسئلہ نہیں ہے، مجھے تمہارے بابا کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔'' وہ ماتھا پیٹ کر بولا۔

''بابا! میری مرضی پوچھیں گے تو میں بتادوں گی۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' اس نے شرارت سے اس کی الجھی لٹ انگلی پر لپیٹی تو وہ سہم کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

☆☆☆

''سس، سس چٹا۔'' املی کی چٹنی میں دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی ڈبو کر چسکا لینے پر اماں کی اور زلفی کی توجہ بار بار مدیحہ کی طرف جاتی، اس کے سامنے کتاب کھلی تھی اور دائیں ہاتھ پر پلیٹ میں کھٹی میٹھی چٹنی رکھی تھی...... اپنی دنیا میں مگن وہ لطف لے رہی تھی۔ اماں زلفی کی شرٹ کے ٹوٹے ہوئے بٹن لگا رہی تھیں...... جبکہ زلفی چت چارپائی پر لیٹا آسمان گھور رہا تھا...... آپا کی یہ تسبیح کا وقت تھا۔

''یہ تو پڑھ رہی ہے یا چٹخارہ لے رہی ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''بس وقت گزار رہی ہے۔'' زلفی نے بھی بیزاری سے کہا۔

''بھائی! میں پیپر کی تیاری کر رہی ہوں۔'' مدیحہ نے جواب دیا۔

''اچھا، اچھا یہ اٹھا کر اندر جاؤ۔'' زلفی نے سخت جھنجلاہٹ سے کہا۔ اماں نے محسوس کیا کہ زلفی جب سے آیا ہے چپ چپ اور الجھا الجھا سا ہے۔

''زلفی!''

”زلفی!“ دوبارہ پکارا۔

”ہوں، ہاں......“

”کیابات ہے...... کچھ پریشان ہو؟“

”نہ، نہیں۔“

”نہیں...... کچھ تو ہے۔“

”کچھ نہیں بس پیسوں کا بندوبست نہیں ہوا، دوسری طرف مالک مکان نے جلدی کرنے کو کہا ہے۔“

”تو پھر......؟“ اماں کو تشویش ہوئی اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھیں۔

”ہاتھ تو پکا ڈالا تھا، اب دیکھیں کیا ہوتا ہے؟“

”ارے بچے لڑکی والوں کی طرف جانا ہے انہیں بلانا ہے سب اس نئے گھر کی وجہ سے لٹک رہا ہے۔“ اکبری بیگم بولیں۔

”تو لٹکنے دیں میں کوشش تو کر رہا ہوں۔“ وہ جھنجلا سا گیا۔

”چلو پھر فکر مند کیوں ہو؟“

”فکر کچھ بھی ہو سکتی ہے، مجھے سوچنے دیں۔“ وہ بیزار سا تھا۔

”سوچنے کی ضرورت کیا ہے؟ ساری عمر اس گھر میں رہے ہیں اب بھی رہ لیں گے۔“ اندر سے آتے ہوئے آپا بولیں۔

”ہونہہ! آپا! کیا کہہ رہی ہیں اس گھر میں یہاں گاڑی بھی نہیں آتی۔“ مدیحہ نے اچانک مداخلت کی۔

”تو نہ آئیں، تمہیں گاڑی کی فکر کیوں ہے؟“ آپا نے تعجب سے اسے دیکھا تو وہ بوکھلائی۔

”آپا! میری پیاری سہیلی نیناں اسی وجہ سے نہیں آتی۔“

”نیناں، نیناں زندگی اسی کے گرد گھوم رہی ہے کیا؟“

”میری ایک ہی سہیلی ہے اور آپ کو کیا معلوم سہیلی کیا ہوتی ہے؟“ مدیحہ اپنی ترنگ میں کہہ گئی۔

”بکو مت! مجھے اچھی طرح معلوم ہے سہیلی کیا ہوتی ہے؟“ آپا نے سختی سے کہا اور الٹے قدموں کمرے میں چلی گئیں۔ تب مدیحہ کو کچھ احساس ہوا۔

”زبان بے لگام ہو رہی ہے، نظروں سے حیا جا رہی ہے، کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“ اکبری بیگم تاؤ کھا گئیں۔

”ایسا کیا، کیا ہے میں نے؟“

”بس چپ رہو اور اندر جا کر پڑھائی کرو۔“ اکبری بیگم نے ٹھیک ٹھاک لتاڑا تو وہ پیر پٹختے ہوئے کتابیں لیے اندر چلی آئی...... آپا پرانے سے صندوق میں جانے کیا دیکھ رہی تھیں...... اس نے کتابیں میز پر رکھیں اور دھم سے بستر پر گر گئی۔ اسے طلال کو بھی سوچنا اور یاد کرنا تھا۔ وہ سرتاپا اس کے اعصاب پر چھا چکا تھا۔ نیناں کی عدم موجودگی میں ہونے والی ملاقات نے تو سحر پھونک دیا تھا۔ جب سے مل کر آئی تھی دل یہی چاہ رہا تھا کہ ایسی ملاقات روز ہوا کرے...... کتنا غیر متوقع اور حسبِ آرزو ہوا تھا۔

”مدیحہ!“ آپا نے صندوق بند کرتے ہوئے جانے اس کے چہرے پر کیا دیکھ لیا کہ پکارا۔

”ہوں! جی آپا۔“ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا اپنی اس آپا سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ نہ سمجھی۔

”کبھی اس طرح امنگ اور ترنگ میں بند آنکھوں کے ساتھ مسکراتے نہیں دیکھا۔“ آپا برابر آ کر لیٹ گئیں۔

”اللہ قسم آپا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”تم میرا سرمایہ ہو شاید اس لیے فکر مند رہتی ہوں۔“

”ہوا کیا ہے؟“

”کچھ نہیں، کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔“

”اچھا یہ بتائیں آپ صندوق کیوں کھولے رکھتی ہیں؟“ وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

”اس میں گزری زندگی کے نشانات ہیں، انہیں دیکھتی ہوں۔“

”کیوں، بھائی اور میں آپ کو کتنی بار سمجھا چکے ہیں، مت اداس ہوا کریں۔“

”سب کچھ بھلانا آسان نہیں ہوتا۔“

”جو کچھ ہے ہی نہیں اسے کیا یاد کرنا۔“

”ہاں! بچا تو کچھ نہیں۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”آپا! میری اچھی آپا آپ خوش رہا کریں۔“ وہ دلگیر ہو کر بولی تو وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دیں۔

”اچھا پہلے اٹھ کر عشا کی نماز پڑھو شاباش......“ عشا کی نماز کا انہیں خصوصاً یاد کرانا پڑتا تھا وہ بنا کچھ کہے اٹھ بیٹھی۔

☆☆☆

”وقت ظالم ایسے ہی سب کچھ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔“ صوفے کی پشت سے سر لگائے رابعہ یہی سوچ رہی تھیں۔ رسم قل کے بعد گھر خالی ہو چکا تھا...... ”یہ اتنا بڑا گھر جسے دادی نے کمال چابکدستی اور دانشمندی سے سنبھال رکھا تھا اب اسے کون سنبھالے گا؟“ یہ سوال بھی در و بام سے الجھتی نگاہیں کر رہی تھیں مگر فی الحال عارفہ نے جس تحمل و تدبر سے سب معاملات سنبھالے تھے ان سے یہ سوال وہ نہیں کر سکی تھیں...... البتہ سبحان، دعا کے بعد اندر ان سے ملنے چلے آئے تو ان سے دل کی بات کہہ دی۔

”رابعہ! یہ دنیا میں رہنے والے سوچتے ہیں، کسی کے ہونے نہ ہونے سے کب فرق پڑتا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”فرق پڑتا ہے دادی کے بعد یہ گھر ویرانہ لگ رہا ہے۔“

”تو اب تمہیں اپنے گھر جانا چاہیے، کچھ عرصے بعد یہ احساس ماند پڑ جائے گا۔“

”وہ تو پہلے ہی ویرانہ ہے۔“

”بہار، موسمِ گل تو تم خود ہو، پھر ایسے کیوں سوچتی ہو؟“

”دیکھا تم نے، وہ میرا شوہر اطلاع ملنے پر بھی نہیں آیا۔“

”صدمہ ہے یا افسوس؟“

”شاید کچھ بھی نہیں، سب نے محسوس کیا، میری نیناں نے بہت فیل کیا اور تو کچھ نہیں۔“

”چھوڑو سب روٹین کی باتیں ہیں، میں سمجھتا ہوں اس پر کڑھنے سے حاصل۔“ وہ بولے۔

”سبحان! تم نہیں سمجھ سکتے کہ حالات کیا ہیں؟ بس تم نہ جاؤ۔“ بے اختیار ہی وہ بولیں عین اسی لمحے ریحان اختر نے کمرے میں قدم رکھے اور ان کی بات کا مسکرا کر جواب سبحان کو دیا۔

”ہاں! مت جاؤ کیونکہ انہیں آپ کی ضرورت پڑنے والی ہے۔“ سبحان اچانک پیدا ہونے والی اس سچویشن پر کھڑے ہو گئے۔

”میرا جانا یا نہ جانا آپ کے مشورے سے مشروط نہیں۔“ سبحان یہ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل گئے...... تب وہ رابعہ کے قریب آ کر بولے۔

”سوری! میری وجہ سے سبحان صاحب چلے گئے۔“

”دوست ایسی باتوں کا برا نہیں مانتے۔“ رابعہ نے بھی برجستہ کہا۔

”ہونہہ! دوست ہی کڑے وقت میں کام بھی آتے ہیں۔“ انہوں نے ذومعنی نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ تشریف رکھیے گا یا......؟“

”میں سفر سے آ رہا ہوں محض افسوس کے لیے ورنہ ابھی میرا واپسی کا پروگرام نہیں تھا۔“

”کوئی مجبوری نہیں تھی۔“ وہ بولیں۔

”خیر نیناں کو بلاؤ اور اجازت دو۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی نیناں کو ساتھ لے جانا ہے، آپ تو یہاں رہیں گی، میری بیٹی کے بنا میں کیسے رہ سکتا ہوں۔“

”اسی لیے گھر سے باہر تھے؟“

”نیناں تو ساتھ تھی، آس پاس۔“ وہ بڑی ترنگ سے بولے۔

”نیناں کو ہلکا سا فیور ہے وہ کل میرے ساتھ آئے گی۔“

”فیور! یقیناً بے آرام ہو گی اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ بضد ہو گئے۔

”سو رہی ہے، اٹھے گی تو رمان چھوڑ آئے گا۔“

”نہیں، رمان میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا اس وقت تک کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر لے۔“

”کسی کی ذاتی سوچ اور فیصلے پر ہٹ دھرمی کا کوڑا لے کر مت بیٹھیں۔“

”رابعہ بیگم! رمان سے کہہ دو میری بیٹی سے دور رہے اگر مرضی اپنی کرنی ہے تو۔“ وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔

”خاموش ہو جائیں یہ موقع فضول باتوں کا نہیں ہے، فوتگی کا گھر ہے۔“ وہ دبے دبے غصے کے ساتھ بولیں۔

”افسوس ہی کرنے آیا ہوں، اب میری نیناں کو بلاؤ۔“

''کیا نیناں، نیناں کی تکرار لگا رکھی ہے، وہ غیروں میں نہیں ہے، میری بھی بیٹی ہے۔'' انہیں غصہ آ گیا۔

''اپنا بنانے کی شرط یہی ہے کہ رمان کو میری بات ماننی ہوگی، بہ صورتِ دیگر نیناں کا نام بھی زبان پر نہ لائے۔'' وہ دانستہ اونچی آواز میں بولے، باہر سے گزرتے رمان کے کانوں میں جملہ پہنچا تو وہ اندر گھس آیا۔

''ریحان انکل! نیناں پر بہت زعم ہے لے جائیں اسے، رمان احمر میں دم ہوگا، پیار میں طاقت ہوگی تو نیناں صرف رمان احمر کی ہی ہوگی۔''

''شٹ اپ!'' وہ دہاڑے۔

''چلانا مجھے بھی آتا ہے لیکن آپ کا احترام کرتا ہوں، آپ کے اشاروں پر ناچ نہیں سکتا۔'' بڑے مؤدب طریقے سے کہا گیا۔

''تو کبھی بھول کر بھی میرے گھر مت آنا۔'' انہوں نے وارننگ دی۔

''جانتا ہوں کہ مجھے راستے سے ہٹا کر آپ رابی خالہ کے لیے طلال کی فیور چاہتے ہیں۔'' وہ بولا اور واپس چلا گیا۔

''طلال میری نیناں کے لیے ہرگز نہیں۔'' رابعہ بولیں۔

''نیناں کو بلاؤ......'' وہ بولے تو وہ ماحول کی خرابی کا خیال کر کے باہر نکل گئیں۔ اس طرح کی خرابی کا رابعہ کو بخوبی اندازہ تھا اور اسی لیے شاید رمان کو جی جان سے چاہنے کے باوجود نیناں کے حوالے سے ہچکچاتی تھیں...... نیناں پر ان کا اختیار نہیں تھا، ریحان اختر کی شرائط ناممکن نہیں تھیں مگر وہ ان کی ذات سے دور رمان کو رکھنا چاہتی تھیں...... ریحان اختر اور طلال کے سائے سے بھی دور۔

☆☆☆

چوتھے روز رمان کو آفس جانا تھا۔ وہ گھر آیا...... گاڑی کی آواز پر دعا نے دبے قدموں گیٹ کا رخ کیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ گیٹ بند کرنے کے لیے پلٹا تو دعا اندر کا دروازہ کھول کے آ چکی تھی۔

''ہائے ڈیئر!'' وہ مسکرا کر بولا تو وہ خوش ہوگئی۔

''مامی نہیں آئیں۔''

''نہیں، چہلم تک تو وہیں رہیں گی پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے؟'' وہ اندر کے داخلی دروازے کو کھول کر آگے چلنے لگا۔

''کیا مطلب؟''

''سنو! لمبے لوگوں کا المیہ ہوتا ہے کہ ان کی عقل گھٹنوں سے کھسک جاتی ہے اس لیے یہ مطلب وطلب مت پوچھا کرو۔'' وہ شرارت سے باز نہ آیا۔

''رمان!'' وہ ٹھنکی۔

''چلو جاؤ، میں نے کچھ دیر سونا ہے پھر صبح آفس جانا ہے۔''

''فجر کی نماز ہوگئی، سونے کے بعد جاگو گے کب؟''

''تو......؟''

''تو یہ کہ تیار ہو جاؤ، میں ناشتا بنا دیتی ہوں۔''

''ہوں! کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، چلو پھر شرٹ استری کر دو، میں شاور لے کر آتا ہوں۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ متفق ہو کر ایڑیوں کے بل گھوم گیا...... وہ خوش ہوگئی۔

کچھ ہی دیر میں اپنی پسند سے سافٹ پنک وائٹ لائن والی شرٹ... استری کر کے ہینگ کی...... فریج کھولا، فریزر سے شامی کباب نکالے، دودھ، مکھن جام نکال کر ٹرے میں رکھا...... ٹوسٹر آن کیا...... جس وقت چائے کپ میں ڈال رہی تھی وہ گیلے بال تولیے سے خشک کرتا ہوں وہیں آ گیا۔ گیلے بدن سے صابن اور بالوں سے اٹھتی شیمپو کی مہک پر پلٹی تو وہ اس کی پشت پر کھڑا تھا...... ایک دم دل میں کھلبلی سی مچ گئی۔

''یار! خوش نصیب ہوگا وہ سالا جس کو تم جیسی بیوی ملے گی۔'' اس نے شرارت آمیز جملہ اچھالا تو اس کے چہرے کے گلاب مرجھا گئے۔

''خوش نصیب تو وہ ہوتا ہے جسے پیا چاہے۔''

''میری دعا ہے کہ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہے۔'' خلوصِ دل سے اس نے دعا دی۔

''اپنے پاس رکھو دعائیں، میرے غم کو خوشی مت کہو، میں کبھی تمہیں یہ دعا نہیں دوں گی کہ نیناں تمہیں ٹوٹ کر چاہے۔''

''پلیز! دعا کچھ اور مت کہنا۔'' فوری طور پر اس میں غیر متوقع تبدیلی آئی اور وہ تولیا وہیں کرسی پر پٹخ کر باہر نکل گیا۔ نیناں کے حوالے سے تو جو کچھ ریحان انکل نے کہہ دیا تھا اس وجہ سے سخت متفکر تھا گو کہ ابھی سوچنے کا وقت نہیں ملا تھا...... جاتی ہوئی نیناں کو بھی دائیں آنکھ دبا کر رخصت کیا تھا، یہ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا کہ اس کے بابا نے کیسا ظالمانہ، غیر مہذب فیصلہ سنایا ہے۔ وہ سنتی تو رونے لگتی کیونکہ وہ بھی تو اس کی محبت میں سر تا پا ڈوبی ہوئی تھی۔ ناشتا واشتا بھول کر بستر پر گر سا گیا۔ دماغ میں جیسے پن چکی چلنے لگی۔

''کیا ہوا؟ نیناں تمہارے لیے وجہ پریشانی تو نہیں......'' ناشتے کی ٹرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دعا نے کریدا۔

''نیناں تو میرے ہونے کا احساس ہے، پریشانی کس بات کی؟'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑی تو اسے یاد آیا۔

''امی کے کپڑے الماری سے نکال کر رکھنا، شام کو لے کر جانے ہیں۔''

''اچھا!'' وہ سپاٹ سے انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی اور وہ پھر نیناں کے بارے میں سوچنے لگا۔

''رمان احمر! ریحان انکل تمہیں آزما رہے ہیں یا ستا رہے ہیں؟'' خود سے پوچھا۔

''رابی خالہ ٹھیک کہتی ہیں، ریحان انکل کی سوچ سطحی ہے۔'' جواب اندر سے آیا تو ہونٹ چبانے لگا۔

''اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ریحان انکل کو نیناں کی پسند کا اندازہ ہے اور اس لیے اسے ٹف ٹائم دینے کی کوشش کی ہے، طلال کے ہوتے وہ بھلا میرے لیے کیسے چاہیں گے؟ کچھ بھی ہو اپنی ہستی کا احساس ضروری ہے، میں کیوں ان کا غلام بنوں......؟'' سختی سے خود کو جواب دے کر وہ مطمئن ہو گیا اور اٹھ کر ناشتا کرنے لگا تو نیناں ایک دم سامنے آ بیٹھی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، لبوں پر سوال تھا۔

”رمان! کیا تم صرف اپنی ہستی کا احساس ضروری سمجھتے ہو؟“ وہ مضطرب ہو کر ہونٹ چبانے لگا۔

”میں تمہاری ہستی کا جواب نہیں......؟“ اس نے گویا دوسرا سوال کر دیا۔ تب وہ تڑپ اٹھا۔

”نیناں! نیناں تم میری ذات کا احساس ہو مگر تمہارے بابا مجھے کیوں تم سے جدا کرنا چاہتے ہیں......؟“ وہ بولا...... لیکن جواب نہیں آیا تو سر کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر بیڈ پر ہی گر گیا...... محبت میں اضطراب کا دور تو شاید اب شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

”تمہاری توجہ کہاں ہے مائی ڈیئر......؟“ نیناں دیکھ رہی تھی کہ مدیحہ بے کل سی بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے، وہ پوچھ بیٹھی۔

”کہیں نہیں، کیوں؟“ مدیحہ شرمندہ سی ہوگئی۔

”طلال بھائی نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی۔“ نیناں نے لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے جمائے پوچھا۔

اسے فیضو نے گھر آتے ہی بتا دیا تھا کہ مدیحہ بی بی آئی تھیں اور طلال صاحب کے کمرے میں ہی بیٹھی تھیں۔

”وہ، نہ، نہیں تو، کیوں......؟“ مدیحہ کا رنگ فق ہوگیا۔

”کیونکہ وہ بدتمیزی کر سکتے ہیں۔“

”نہیں، میرا خیال ہے وہ بہت نائس ہیں۔“

”ویسے احتیاط کرنا، مجھے الزام نہ دینا۔“ نیناں نے انتہائی نرمی سے کہا۔

”نیناں! تمہیں اپنے کزن رمان سے محبت ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ طلال صاحب کو برا سمجھو۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو، میں نے پیدائش سے اب تک طلال بھائی کے ساتھ وقت گزارا ہے، ان میں ظاہری دلکشی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔“

”لیکن وہ تو شاید تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

”ہوں...شاید......“ وہ ٹال گئی۔

”اور تم رمان بھائی کو پسند کرتی ہو۔“

”یہ چھوٹا لفظ ہے، رمان کے لیے میرے جذبات تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

”آنٹی سے افسوس کرنا تھا۔“ مدیحہ کو یاد آیا۔

”ابھی آئی نہیں، آج آجائیں گی۔“

”نیناں! نیناں!“ بوا آواز دیتی اسی طرف آگئیں۔

”جی۔“

”ریحان میاں بلا رہے ہیں۔“

”خیریت......؟“

”پتا نہیں......“

”اچھا آپ چلیں میں آتی ہوں۔“

”بس جلدی مل لو......“ بوا یہ کہہ کر گئیں تو اس نے مدیحہ کو پریکٹس کے لیے کچھ کام دیا اور باہر چلی گئی......

چند لمحے گزرے تھے کہ اس کے کندھوں پر مضبوط ہاتھ رکھے گئے تو وہ ڈر کر اچھل پڑی۔

”ارے، آپ تو نیناں سے زیادہ ڈرپوک ہو۔“ طلال نے ہنس کر کہا۔ وہ طلال کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔

”آپ گھر میں تھے؟“

”کیوں، آپ نے مجھے تلاش کیا تھا؟“

”نہیں، نیناں کی موجودگی میں یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔“ وہ شرما کر بولی۔ وہ قریب ہو کر اس کا دوپٹا تھام کر پیار سے بولا۔

”نیناں سے ڈرنے کی ضرورت کیا ہے؟“ وہ اور شرمائی۔

”مجھے کام کرنا ہے، آپ پلیز جائیں۔“

”تو آپ دل سے کہہ رہی ہو۔“

”اچھا نہیں لگتا......“

”مجھ سے ملنا یا یہاں ملنا......“

”بس نیناں کو اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے نظریں چرائیں۔

”یہ لو، یہ میرا کارڈ ہے، جب ملنا چاہو تو میرے نمبر پر رابطہ کر لینا۔“ طلال نے اپنے والٹ سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیا جسے مدیحہ نے چیل کی طرح جھپٹ کر پرس میں رکھ لیا۔ طلال سیٹی بجاتا ہوا باہر چلا گیا تو اس نے اپنے حواس بحال کیے...... دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، پیشانی پر پسینہ آگیا تھا...... دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے نظریں نیناں کی خوب صورت فوٹو پر پڑیں تو وہ کھوسی گئی۔ نیناں کے حسن بے مثال کے سامنے بھلا اس کی کیا حیثیت تھی؟ طلال کا یوں دلچسپی لینا اسے خوش فہمی میں مبتلا کر گیا...... حالانکہ اسے طلال کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ حسین نیناں کی موجودگی کے باوجود وہ اس جیسی سانولی عام سی شکل صورت والی مدیحہ میں کیوں دلچسپی لے رہا تھا...... لیکن دل کے معاملات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔

☆☆☆

”پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں بڑی بڑی رقموں کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے؟“ واش روم سے چینج کر کے رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آئیں تو بیڈ پر لیٹے ریحان اختر نے پہلا سوال کیا...... انہوں نے کچھ توقف اختیار کیا۔

”رابعہ بیگم جوائنٹ اکاؤنٹ کا مطلب یہ نہیں ہوتا۔“ وہ سمجھ گئیں کہ وہ کیا کہنا اور پوچھنا چاہ رہے ہیں۔

”چلیں آپ نے مطلب سمجھا دیا، اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے؟“

”مرد کرنے پر آئے تو بہت کچھ کر سکتا ہے، مجھ سے مانگ لیا ہوتا۔“

”اپنا حصہ لینا جرم نہیں۔“

”وہ بتا کر لیا جاتا تو ٹھیک ہوتا۔“

”بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“

''اور کسی بھی ایرے غیرے کو چیک لکھ دیتی ہو، کون ہے وہ؟'' وہ خاصی درشتی سے بولے۔

''کوئی ایرا غیرا نہیں، میں نے اس سے مکان خریدا ہے۔'' نائٹ کریم چہرے پر لگاتے ہوئے جواب دیا...... ریحان اختر کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا، بستر سے اچھل کر اٹھ بیٹھے۔

''وہاٹ! مکان......''

''ہاں مکان اور اپنے حصے کی رقم سے جو چاہوں خریدوں۔''

''یعنی بنگلا چھوڑ کر مکان خرید لیا......'' انہوں نے تمسخر اڑایا۔

''ریحان! بیکار بحث کا فائدہ، جو آپ نے میری توہین بینک منیجر سے کرائی اس کے بعد پوچھنے کا حق نہیں ہے۔''

''بہر حال جو جی میں آئے کرو مگر جو مجھ سے ریلیٹڈ ہیں ان میں اپنی مرضی نہ کرنا۔''

''بے فکر رہیں، زمان یہاں نہیں آئے گا۔'' انہوں نے طنز کیا۔

''تم یہی کر سکتی تھیں۔'' وہ غصے اور افسوس کے ساتھ بولے تو وہ کچھ نہ سمجھیں۔

''کر کے تو آپ سب آئے ہیں، میں نے کیا کیا ہے؟''

''میرا منہ نہ کھلواؤ، وہ خود کو ہیرو سمجھتا ہے......'' وہ حقارت آمیز لہجے میں کہہ کر کروٹ لینے لگے تو وہ بولیں۔

''واہ! ریحان صاحب، وہ کچھ بھی نہیں تو پھر آپ کو اس سے ضد کیوں ہو گئی، آپ کی نیناں کی پسند ہے وہ۔''

''اسی لیے اسے زمین سے اٹھانا چاہتا تھا۔'' وہ چلائے۔

''وہ زمین پر نہیں، خوددار ہے، اپنے ساتھ ملاتے کیوں ہیں؟''

''اپنی نیناں کو بھکاری سے بچانا میرا فرض ہے۔''

''شٹ اپ! آپ کی سوچ کبھی نہیں بدلے گی، اچھا ہوا کہ آپ نے اپنا یہ روپ بھی دکھا دیا...... تا کہ نیناں بھی نفرت میں اضافہ کر لے۔''

''نیناں کو میں نے سمجھا دیا ہے، وہ میری بیٹی ہے میرا فیصلہ رد نہیں کر سکتی۔'' وہ فاخرانہ انداز میں گردن اکڑا کر بولے اور پھر کروٹ لے لی...... رابعہ کی طرف پشت تھی وہ بیٹی کا احساس کر کے رنجیدگی سے ان کی پشت کو گھورتی رہیں...... کر تو کچھ بھی نہیں سکتی تھیں...... زہر کا گھونٹ بھر کے اپنی جگہ پر دراز ہو گئیں...... آنکھیں موندیں ہی تھیں کہ باہر سے طلال اور بوا کی بلند آوازیں آنے لگیں...... وہ چند لمحے تو سنتی رہیں، ریحان تو سو گئے تھے مگر اُن سے رہا نہ گیا تو سلیپر پیروں میں ڈال کر دروازہ کھول کے باہر نکلیں۔

طلال اپنے کمرے میں جا چکا تھا...... بوا، نیناں کو سینے سے لگائے اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں...... رابعہ کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ان کے پیچھے ہی آ گئیں...... انہیں دیکھ کر نیناں ان سے لپٹ گئی۔ بوا آبدیدہ سی ہو کر دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا......؟'' وہ پریشانی سے بولیں۔

''مامی! مجھ سے پوچھیں......'' طلال جانے الٹے قدموں کیسے وہیں چلا آیا تھا...... رابعہ نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

ممتا

شمع خانم

ایک پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے نادیہ تھک گئی تھی۔ اس نے زرتار آنچل کو دوسری طرف کھینچنے کی کوشش کی تا کہ پہلو بدل سکے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ننھا یاسر پتا نہیں کب اس کے برابر آ کھڑا ہوا اور اپنی ننھی سی مٹھی میں وہ اس کا آنچل مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ نادیہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تو وہ معصوم آنکھوں میں دنیا جہاں کا پیار سمو کر آہستہ سے بولا۔



’’ممّا۔‘‘

نادیہ کے کانوں کے لیے یہ لفظ ابھی اجنبی تھا اور کچھ ناخوشگوار بھی کیونکہ اس کی بہر حال یہ پہلی شادی تھی اور نئی نویلی دلہن کے لیے چند گھنٹوں میں ممّا بن جانا کچھ ناپسندیدہ عمل نہیں تھا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے طاہر نے خجل ہو کر یاسر کو اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر وہ کسی طرح بھی نادیہ کا پلو چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

’’رہنے دیجیے!‘‘ نادیہ نے آہستہ سے کہا اور یاسر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ننھے یاسر نے اپنا سر اس کی مہکتی آغوش میں رکھ دیا۔ نادیہ کے دونوں ہاتھ کچھ دیر اس کے پہلو میں رکھے رہے پھر پتا نہیں کب اس کی نرم انگلیاں یاسر کے سر کے سنہرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ بے شمار آنکھیں اسٹیج کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ بعض آنکھوں میں تمسخر تھا۔

’’کیا چلتر ہے بھئی، آتے ہی میاں کے دل میں اترنے کی کوشش...... واہ!‘‘ بعض آنکھیں ترحم سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

’’دو چار دن کا دلہناپا بھی نصیب نہیں ہوا غریب کو، آتے ہی ممّا کی ذمے داری پڑ گئی۔‘‘

بعض آنکھوں میں فکر مندی تھی کیونکہ یاسر کے ساتھ خالہ نور جہاں کو برداشت کرنا بھی نادیہ کا ایک امتحان تھا۔ خاندان کے سب لوگ جانتے تھے کہ طاہر جتنا سیدھا اور صلح جو انسان تھا طاہر کی ماں خالہ نور جہاں اتنی ہی ٹیڑھی تھیں۔ سننے میں آیا تھا کہ یاسر کی ماں وردہ بھی خالہ نور جہاں سے تنگ آ کر گھر جا بیٹھی تھی۔ اس نے شرط رکھی تھی کہ طاہر اپنی والدہ کو الگ رکھے۔

طاہر ایک بینک میں اکاؤنٹنٹ تھا، بڑی اچھی تنخواہ اور ہر طرح کی سہولت ملی ہوئی تھی۔ بھائی وہ ایک ہی تھا البتہ دو بہنیں تھیں جو اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ خالہ نور جہاں خاندان کی تمام لڑکیوں میں عیب نکال چکی تھیں اس لیے لڑکی والے ہر گھرانے نے انہیں جواب دے رکھا تھا۔ ایسے میں وردہ اپنے والدین کے ساتھ پڑوس میں آ کر رہی اور خالہ نور جہاں کو ایک دم ہی پسند آ گئی۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ میں اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ ایک دوسرے کے عیب و ثواب پر غور کرتے۔

شادی کے بعد وردہ نے خوب پر پُرزے نکالے۔ آئے دن شاپنگ ہفتے وار پارٹیاں پھر میکے والے فرمائشوں پر فرمائشیں کرتے۔ آج ایک سالی کی سالگرہ ہے کل دوسری نے امتحان پاس کیا ہے۔ من پسند تحفے وصول کرتیں۔ طاہر نے مالی معاملات خالہ نور جہاں کے سپرد کر رکھے تھے اس لیے کوئی رقم خالہ کے علم کے بغیر خرچ نہیں ہو سکتی تھی۔ چند دنوں میں ہی چخ چخ شروع ہو گئی۔ یاسر کی پیدائش پر وردہ کی ماں نے ڈلیوری کی ذمّے داری لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

’’ہمارے ہاں پہلا بچہ سسرال ہی میں ہوتا ہے۔‘‘ پھر بڑے مہنگے اسپتال میں پرائیوٹ کمرا لے کر وردہ کے میکے والوں نے وہ پکنک منائی کہ طاہر بے چارے کا بجٹ بالکل ہی اپ سیٹ ہو گیا...... بہرحال خوشی کا موقع تھا۔ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ دل کھول کر خرچ کیا۔

یاسر کی پیدائش کے بعد تو وردہ کے پاؤں زمین پر ٹک ہی نہیں رہے تھے۔ صبح سے شام تک مہمانداری، صفائی اور برتن دھونے کے لیے جو ماسی آتی تھی وہ بھی تنگ آ کر جواب دے گئی۔ آخر خالہ نے اپنی بڑی بیٹی کو بلایا اور یہ مشکل وقت گزرا۔

دن گزرتے گئے، ہر وقت کی کِل کِل سے گھر کا سکون برباد ہو چکا تھا۔ خالہ نور جہاں کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ ایک بات کرتی تھیں تو دس سننی پڑتی تھیں اس لیے زیادہ تر خاموش رہنے لگیں۔ طاہر بے چارہ دن بھر بینک کے معاملات نمٹا کر گھر آتا تو وردہ منہ سجائے بیٹھی ہوتی۔

’’مجھ سے ایک ہی کام کروا لیں یا گھر کی ذمّے داری یا بچے کی دیکھ بھال۔‘‘

’’سب عورتیں گھر اور بچے دونوں کی ذمّے داری اٹھاتی ہیں پھر اماں بھی تو ہیں، تم یاسر کو ان کے حوالے کیا کرو اور خود گھر سنبھالا کرو۔‘‘ طاہر نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

’’اماں کی بھی ایک ہی کہی...... یاسر کو ہاتھ تو لگا نا وہ گناہ سمجھتی ہیں۔‘‘ وردہ جھوٹ بولنے میں ماہر تھی۔ طاہر چپ ہو جاتا کیونکہ اس نے اکثر یاسر کو ماں کی گود میں دیکھا تھا۔

☆☆☆

یاسر ڈیڑھ سال کا ہوا تو وردہ نے دوبارہ ماں بننے کی خوشخبری سنائی۔ طاہر بظاہر تو بہت خوش ہوا مگر اخراجات کے خیال سے دل ہی دل میں پریشان ہو گیا۔ ابھی تو پچھلے اخراجات کا بوجھ پوری طرح نہیں اترا تھا۔

ڈلیوری کا وقت آیا تو خالہ نور جہاں نے اپنی چھوٹی بیٹی کو کچھ دن کے لیے بلا لیا۔ طاہر نے بھی دبی زبان میں نسبتاً کم مہنگے میٹرنٹی ہوم کا ذکر کیا جس پر وردہ کی ماں نے ہنگامہ کر دیا۔

’’اس سے تو اچھا ہے کہ کسی خیراتی اسپتال میں بھجوا دو بیوی کو، ہلدی پھٹکری لگے بغیر ہی رنگ چوکھا آ جائے گا۔‘‘ انہوں نے تابڑ توڑ حملہ کیا۔

’’نہیں، ایسی بات نہیں ہے، ہمارے بینک کے افسران کی بیویاں اسی اسپتال میں جاتی ہیں، بڑا معقول انتظام ہے وہاں۔‘‘ طاہر اپنی بات پر قائم تھا۔

’’بہر حال، وردہ وہاں نہیں جائے گی۔‘‘ وردہ کی ماں نے فیصلہ سنایا۔

’’تو پھر اس دفعہ ڈلیوری کے اخراجات آپ اٹھائیں۔‘‘ طاہر نے دوٹوک جواب دیا تو وردہ کی ماں کی بولتی بند ہو گئی۔

’’ہمارا یہ دستور نہیں ہے۔‘‘ انہیں کوئی جواب نہ سوجھا۔

’’مگر ہمارا دستور ہے۔‘‘ خالہ نے دخل دیا۔ وردہ کی ماں بھلا قابو آنے والی تھیں۔

’’ٹھیک ہے بھئی، جہاں جی چاہے رکھو، ہمیں کیا، کل کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو تم ہی ذمّے دار ہو گے۔‘‘ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

وردہ ایک اور بیٹے کی ماں بن گئی مگر اس دفعہ وہ اسپتال سے سیدھی اپنے میکے چلی گئی۔ عذر یہ تھا کہ یاسر کے ساتھ ننھے رافع کی دیکھ بھال وہ اکیلے نہیں کر سکتی۔ ساتھ ہی اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم کا مطالبہ بھی کر دیا۔ طاہر اس بار بھی اڑ گیا۔

’’گھر آ کر رہو، ہر ضرورت پوری ہو گی اگر میکے میں رہنا ہے تو اخراجات بھی تمہارے والدین اٹھائیں گے آخر کو ننھیال ہے بچوں کا۔‘‘

طاہر گھر کے کشیدہ ماحول اور مالی بوجھ سے پہلے ہی چڑچڑا ہو رہا تھا ویسے بھی... وردہ ان عورتوں میں سے تھی جو خاوند کو صرف نوٹ چھاپنے کی مشین سمجھتی ہیں۔ بات بڑھتی گئی، وردہ گھر نہیں آئی۔ اسے خالہ نور جہاں سے پہلے ہی بہت شکایتیں تھیں، یاسر اکثر خالہ نور جہاں کے پاس ہوتا۔ طاہر اس کی دیکھ بھال میں خالہ کی مدد کرتا مگر وہ بینک سے اکثر دیر سے آتا۔ خالہ نور جہاں، یاسر کو وردہ کے گھر چھوڑ

آتیں تو وہ پھر اسے واپس بھیج دیتی۔ مقصد صرف ان کو ستانا تھا کیونکہ جوڑوں کے درد کی وجہ سے وہ کھانا ہی بہ مشکل بناتی تھیں اوپر سے یاسر کی ذمّے داری مگر وردہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس کے والدین پوری طرح بیٹی کا ساتھ دے رہے تھے۔ مسئلے کا حل نکلتا نظر نہیں آرہا تھا۔

آخر وردہ نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ یہ بڑی انہونی تھی۔ شریف گھرانوں میں طلاق گالی بن جاتی ہے مگر وردہ ضد پر اڑی رہی۔ خاندان کے لوگوں نے مصالحتی کوششیں کیں مگر وردہ کا ایک ہی مطالبہ تھا۔

''میں اس بڑھیا کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

آخر طلاق ہوگئی۔ وردہ نے یاسر کی ذمّے داری اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ننھا رافع جواب ایک سال کا تھا وردہ کے پاس رہا اور ایک دن پتا چلا کہ وردہ اپنے والدین کے ساتھ کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے رافع اپنی بے اولاد بہن کو گود دے دیا اور خود اپنی پسند کی شادی کر لی۔

☆☆☆

گھر کے دگرگوں حالات سے تنگ آکر طاہر نے جلد ہی عقدِ ثانی کا عندیہ ظاہر کیا اور یوں نادیہ یاسر کی مما بن کر اس کی زندگی میں آگئی۔

نادیہ متوسط گھرانے کی چوتھی لڑکی تھی۔ بڑی بہنوں کی شادی ہوتے ہوتے اس کی عمر تیس سال ہوچکی تھی۔ گھر کے حالات سنوارنے کے لیے بی اے، بی ایڈ کر کے فیڈرل بورڈ کے اسکول میں تقریباً آٹھ سال سے پڑھا رہی تھی اور بڑی اچھی مسٹریس تھی۔ واجبی شکل مگر لمبے گھنیرے بال اور ہمیشہ کچھ سوچتی آنکھیں اس کو جاذبِ نظر بنا دیتی تھیں۔ متوسط طبقے کی عام لڑکیوں کی طرح صابر، ملنسار اور ہنرمند لڑکی تھی۔ اس کے آتے ہی خالہ نور جہاں کا گھر پھر سے گھر کہلانے کے قابل ہوگیا۔

یاسر نے جو پلو ایک بار تھاما تو پھر نہیں چھوڑا۔ ہر وقت بلی کے بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا۔ اسکول سے واپس آتی تو اس کے کمرے کے دروازے پر بیٹھا ملتا۔ نادیہ بھی ساری تھکن بھول کر اس کی دیکھ بھال میں لگ جاتی۔

خالہ نور جہاں کے نخرے پھر سے جاگ گئے، توے کی گرم روٹی ان کے دانتوں سے چپتی۔ مرپڑ کے دوپہر کا سالن بنالیتیں اور ایسی تھکتیں کہ پھر ان سے اٹھا ہی نہ جاتا۔ یاسر کو نہلانا، کھانا کھلانا سب نادیہ کے آنے پر ملتوی ہوتا۔ نادیہ بھی چادر اتارتے ہی گھر کے کاموں میں جت جاتی۔ گرم روٹی ڈال کر انہیں کھلاتی۔ طاہر ذرا دیر سے آتا تھا۔ اس کے آنے پر تازہ روٹی پکا کر دیتی۔ تین چار گھنٹے بعد ذرا فرصت ملتی تو یاسر کوئی فرمائش کر دیتا۔

''مما آئس کریم کھانی ہے۔''

''جاؤ، اماں کے ساتھ جا کر ساتھ والے اسٹور سے لے آؤ۔'' مگر اماں کی کبھی ٹانگوں میں کبھی سر میں درد ہوتا اور وہ کہتیں۔

''جاؤ بھئی مما کے ساتھ چلے جاؤ اور ہاں میرے لیے بھی لے آنا۔'' آخر نادیہ ہی اٹھتی اور یاسر کی فرمائش پوری کرتی۔

☆☆☆

یاسر تین سال کا ہو رہا تھا۔ نادیہ اس کو کسی اچھی نرسری میں داخل کرانا چاہتی تھی تاکہ اس کی بنیاد مضبوط ہو اور بعد میں تو اسے نادیہ کے اسکول میں ہی جانا تھا۔ اسے ہر لمحے یاسر کی تعلیم و تربیت کی فکر رہتی۔ خالہ نور جہاں روایتی ساسوں کی طرح نادیہ پر تنقید جاری رکھتیں۔ طاہر حسبِ معمول اپنے کاموں

میں مصروف رہتا زیادہ پیار آیا تو یاسر کو بازار لے گیا۔ آئس کریم کا وہ رسیا تھا۔ ڈھیروں ذائقے لا کر فریج بھر دیا یا موسم کے پھل لے آیا۔ شروع شروع میں اس نے نادیہ کو بھی باہر لے جانا چاہا مگر یا تو خالہ نور جہاں نے اپنے تنہا رہ جانے کا عذر بنایا یا پھر اچانک ان کی ٹانگوں میں درد شروع ہوجاتا۔ نادیہ خاموشی سے بغیر کسی ردِّعمل کے ان کی خدمت میں لگ جاتی اس طرح طاہر کو بھی یقین ہوجاتا کہ وہ سیر و تفریح سے دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس نے رفتہ رفتہ یہ باب ہی بند کر دیا۔ نادیہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر ان آنکھوں سے کچھ کہنا بھی چاہا تو پتا چلا کہ وہ آنکھوں کی زبان سمجھتا ہی نہیں۔

یاسر نرسری سے فارغ ہو کر اسکول میں داخل ہوا تو نادیہ کی زندگی میں چپکے سے بغیر کسی خواہش یا چاہت کے رمان آگیا۔ اس کے نرم اور گداز لمس نے نادیہ کو احساس دلایا کہ اولاد کیا شے ہے۔ وہ ننھا منا سا نرم وجود اس کی آغوش میں کسمساتا تو نادیہ کے جسم میں سکون کی ایک لہر سی دوڑ جاتی اور وہ کیف سے آنکھیں بند کر لیتی۔ یاسر کو تو جیسے کھلونا مل گیا تھا وہ ہر دم اس کو دیکھنا اور چھونا چاہتا تھا۔ اکثر رومی کو اپنی گود میں لٹا کر بیٹھا رہتا۔ نادیہ کے لیے یاسر کا یہ رویہ خوش کُن تھا کیونکہ اکثر بچے چھوٹے بہن بھائیوں سے حسد کرتے ہیں، ماں کی توجہ کم ہونے کا بدلہ تو مولود سے لیتے ہیں مگر شاید نادیہ کی توجہ میں کمی آئی ہی نہیں یا پھر یاسر چھوٹے بچوں کا ترسا ہوا تھا اس نے رومی کو اپنی ذمّے داری بنالیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا یاسر کو بہت اچھا لگتا تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے پر نادیہ نے اسکول جانے سے پہلے رومی کے بارے میں بہت چاہا کہ اس دوران خالہ نور جہاں اس کی دیکھ بھال کر لیں مگر وہ کسی طرح بھی راضی نہیں ہوئیں۔ آخر نادیہ کی امی نے اور بھابی نے یہ ذمّے داری اٹھالی۔ نادیہ رکشا روک کر پہلے رومی کو امی کو تھما کر آتی اسی طرح واپسی پر پہلے رومی کو لیتی پھر گھر آتی۔ اس کا کام اور ذمّے داری بہت بڑھ گئی تھی۔ اِدھر خالہ نور جہاں شوگر کی مریضہ بھی ہوگئیں۔ انہیں مخصوص خوراک اور پھل دینا بھی نادیہ کی ذمّے داری تھی۔ پھر ان کے مزاج کی چڑچڑاہٹ بھی ترقی پر تھی۔ خاص طور پر یاسر کے حوالے سے وہ کچھ نہ کچھ سناتی ہی رہتی تھیں۔ رومی کو نہ کبھی انہوں نے پیار کیا نہ اس کی طرف توجہ کی۔ بس ایک نادیہ تھی جو پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رومی کو وہ توجہ نہ دے سکی جو ایک ماں کو دینی چاہیے۔

کسی تکلیف سے وہ رات کو روتا تو طاہر تنگ ہوتا۔ نادیہ اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاتی اور اس وقت تک واپس نہیں آتی جب تک وہ سو نہ جاتا۔ رات کو وہ کبھی پوری نیند نہ سو پاتی۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی جھنجلا جاتی کہ رومی کا وجود اسے اضافی بوجھ لگنے لگتا کیونکہ یاسر کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں اس نے بال برابر فرق نہیں آنے دیا تھا۔ اسے سبق یاد کرانا، ہوم ورک کروانا اچھے مینرز سکھانا نادیہ نے ہمیشہ اپنے ذمّے رکھا۔ وہ پڑھائی میں محنتی ضرور تھا مگر بہت ذہین نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اسے نمبر ون رکھنا خاصا مشکل کام تھا۔ جسے نادیہ نے بہ طریقِ احسن پورا کیا اور یاسر کبھی جماعت میں دوسرے نمبر پر نہیں آیا۔

رومی ابھی سال کا ہی ہوا تھا کہ نادیہ کو پتا چلا کہ وہ پھر ماں بننے والی ہے۔ اس دفعہ تو وہ بہت ہی گھبرا گئی۔ بہت چاہا کہ یہ خطرہ ٹل جائے مگر جن روحوں کو آنا ہوتا ہے وہ آکر رہتی ہیں۔ سیاہ بالوں اور بڑی

بڑی آنکھوں والی سونیا کو دیکھ کر نادیہ شرمندہ سی ہوگئی۔ وہ اتنی جاذب نظر تھی کہ جو ایک بار دیکھتا دوبارہ دیکھنا چاہتا۔ پھر صابر اتنی کہ کسی نے اس کے رونے کی آواز کبھی سنی ہی نہیں۔ خالہ نور جہاں جو کبھی رومی کو گود میں اٹھانا پسند نہیں کرتی تھیں سونیا کے لیے ہر وقت گود پھیلائے رکھتیں خود طاہر بھی سونیا کو اٹھانے اور بہلانے کو مستعد دکھائی دیتا۔ اس طرح نادیہ کا ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔ اِدھر یاسر، رومی کے ساتھ ساتھ سونیا کا بھی بڑا بھائی بن گیا۔

طاہر کی فیملی مکمل ہوگئی تھی۔ اس لیے نادیہ بھی محتاط ہوگئی اور زندگی کی گاڑی ایک نہج پر چل پڑی۔

☆☆☆

تین بچوں کی دیکھ بھال تعلیم و تربیت، آرام و آسائش، سب کاموں کو نادیہ نے اتنے سلیقے سے ترتیب دے رکھا تھا کہ کسی کو بھی کوئی شکایت یا دقت نہیں تھی۔ یاسر بڑی تیزی سے تعلیمی مراحل طے کررہا تھا۔ نادیہ کی رہنمائی اور کوچنگ میں وہ روز بروز نکھرتا گیا۔ رومی پر نادیہ نے بہت کم توجہ دی کیونکہ اسے توجہ کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کہاں سے ایسا ذہن لایا تھا کہ جماعت میں پڑھا ہوا سبق ہی اس کے لیے کافی ہوتا۔ اسکول سے آکر زیادہ وقت محلے کے بچوں کے ساتھ کھیل کر گزارتا۔ جس کی شکایتیں خالہ نور جہاں طاہر سے کرنا ضروری سمجھتیں۔

خالہ نور جہاں نے رفتہ رفتہ دونوں بچوں میں فرق کرنا شروع کردیا۔ ہر اچھی چیز یاسر کے لیے ہوتی۔ رومی اگر اسی چیز کے لیے ضد کرتا تو ڈانٹ کھاتا۔ نادیہ اس فرق کو اچھی طرح محسوس کررہی تھی مگر شکوہ شکایت اس کی سرشت میں تھے ہی نہیں۔ ویسے بھی رومی اکثر نافرمانی کرجاتا۔ باہر سے شکایتیں آتیں۔ سونیا کو تنگ کرتا تو وہ زچ ہوجاتی جبکہ یاسر اس کی ہر بات پر ”جی مما“ ہی کہنا جانتا تھا جبکہ رومی اس سے کئی دفعہ پٹ بھی جاتا۔ البتہ اسکول کے نتائج گھر بھر کے لیے حیران کن ہوتے۔ خالہ نور جہاں نے تو ایک بار یہاں تک کہہ دیا۔

”خدا جانے نقل کرتا ہے یا کتابیں کھول کر ٹیسٹ دیتا ہے، کبھی پڑھتے تو دیکھا نہیں تجھے۔“ رومی جو خوشی خوشی دادی کو اپنا ماہانہ رزلٹ دکھانے لایا تھا۔ رپورٹ وہیں پھینک کر باہر نکل گیا۔

”اماں ایسے نہ کہا کریں، رومی بہت ذہین ہے۔“ یاسر کو برا لگا اور اس نے دادی کو سمجھایا مگر وہ ہونہہ کہہ کر رہ گئیں۔

نادیہ کی غیر موجودگی میں وہ طاہر کے کان رومی کے خلاف بھرتی رہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طاہر جو بچوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ وہ بھی رومی کو موقع بے موقع سرزنش کرتا رہتا...... رومی رفتہ رفتہ ضدی اور سرکش ہوتا جارہا تھا۔ نادیہ کئی دفعہ اس کی حق تلفی پر کڑھتی مگر ماحول کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ کچھ کہہ نہ سکی۔ البتہ رومی کے لیے فکرمند رہنے لگی۔

☆☆☆

یاسر کو دیوانگی کی حد تک ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ نادیہ نے اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یاسر نے 999 نمبر لے کر اپنے کالج کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ نادیہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ہر طرف سے مبارک باد کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ یاسر کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا۔

”یہ سب میری مما کی وجہ سے ہے۔ یہ کامیابی میری نہیں میری مما کی ہے۔“

انٹری ٹیسٹ اور داخلے کے مراحل طے ہوئے۔ لسٹیں لگیں تو نادیہ خوشی سے پھولی نہ سمائی

کیونکہ یاسر کا نام لسٹ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا میڈیکل کالج تھا اور داخلہ صرف میرٹ پر ہوتا تھا۔ یاسر کا میڈیکل کالج میں پڑھنا گھر کے بجٹ پر بڑا بوجھ تھا مگر نادیہ بڑی کفایت شعاری سے چل رہی تھی۔ طاہر بھی جتنا کمارہا تھا وہ بھی اسے بتا تھا۔ اس نے بچوں کے مستقبل کے لیے جو رقم بچا رکھی تھی مہنگائی کے اس دور میں وہ صرف ایک بچے کا مستقبل بھی بڑی مشکل سے بنا سکتی تھی۔ یہاں تو بچے تین تھے اور تینوں کے بارے میں نادیہ کے ارادے بلند تھے۔

رومی اپنے منفی رویّے کی وجہ سے گھر میں مسئلہ بنا ہوا تھا مگر نادیہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اس کی وجہ وہ ناانصافیاں تھیں جو شروع سے ہی یاسر کے مقابلے میں اس کے ساتھ ہورہی تھیں۔ وہ ان کی تلافی کرنے کی کوشش کرتی تو اسے خالہ نور جہاں کی زبان کی تلخی اور تیزی بھگتنا پڑتی تھی۔ اپنے بچے کے لیے نادیہ بڑی بے بس تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ یاسر اس تضاد کا عادی ہونے کے باوجود دونوں بہن بھائیوں پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ دونوں بھی بڑے بھائی کے دیوانے تھے۔

میٹرک میں بڑے نمایاں نمبر لے کر رومی نے بڑی حد تک گھر بھر کی حمایت جیت لی تھی مگر ساتھ ہی اس نے اعلان کردیا کہ وہ بڑے بھائی کی طرح ڈاکٹر نہیں بلکہ سوفٹ ویئر انجینئر بننا چاہتا ہے۔ نادیہ نے لاکھ سمجھایا طاہر نے بھی سوفٹ ویئر انجینئر کے لیے اسکوپ کی کمی پر لیکچر دیے مگر وہ رومی ہی کیا جو کسی کی بات سمجھ لے۔ آخر اسے کمپیوٹر سائنس کے مضامین کے ساتھ ایف اے میں داخلہ دلوادیا گیا۔ سونیا بیگم تو شروع سے اسکالرشپ مارتی آرہی تھیں اور اُس نے بڑے بھائی کی طرح ڈاکٹر بننے کا عزم کر رکھا

تھا۔ نادیہ بچوں کے رجحانات سے مطمئن تھی مگر اس تھوڑی سی آمدنی میں اتنے بڑے بڑے عزائم کا پورا ہونا اسے پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ اسکول کے ساتھ ساتھ اس نے گھر میں ٹیوشنز بھی شروع کرلیں۔ مالی معاملات کے علاوہ رومی کا طرزِ زندگی بھی نادیہ کے لیے آزمائش بنا ہوا تھا۔ بات بے بات بحث، ضد کرنا، تلخ کلامی خصوصاً نادیہ کے ساتھ بے ادب گفتگو...... طاہر اور خالہ نور جہاں بھی موقع بے موقع ان تلخیوں کو بڑھانے کا سبب بنتے۔ اس کے نتائج میں ذرا کمی بیشی ہوئی اور ایک نیا محاذ کھل جاتا۔

اِدھر یاسر میدان پر میدان مار رہا تھا۔ ہر امتحان میں اول نمبر...... پتا نہیں کتنے اسکالرشپ اس کے کیرئیر میں جمع ہو رہے تھے ہر کانوکیشن پر خصوصی انعامات...... بار بار طاہر صاحب اور نادیہ کو بلایا جاتا۔ تعریفوں کے ڈونگرے برستے اور نادیہ زندگی کی تلخی کو بھول جاتی۔

''مسز نادیہ طاہر صاحبہ آپ بہت ہی خوش قسمت ہیں کہ یاسر جیسے ڈاکٹر کی ماں ہیں۔ نہ ایسے طالب علم اور نہ ہی ایسے ڈاکٹر بار بار پیدا ہوتے ہیں۔'' ایک بار یاسر کے پرنسپل نے ایک تقریب میں نادیہ کے لیے خصوصی پیغام دیا۔ نادیہ کا سر فخر سے اونچا ہوگیا۔ اسی تقریب میں یاسر نے نادیہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''میری تمام تر کامیابیوں کی وجہ صرف اور صرف میری مما ہیں۔'' سونیا بھی رومی کے پیچھے پیچھے آرہی تھی سونیا کو ڈاکٹر بنانا یاسر کا خواب تھا۔ اپنی اسٹڈی سے ٹائم نکال کر وہ سونیا کو پڑھاتا، اٹھتے بیٹھتے اس کو لیکچر دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سونیا نے پہلے ہی سال ایف ایس سی میں میرٹ لے لیا اور میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔

اب نادیہ کے تینوں بچے اپنے اپنے مستقبل کی سیڑھیوں پر قدم رکھ چکے تھے۔ ہر بچے کی ہر سمسٹر فیس نادیہ کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ پھر ہر ماہ کالج.... آنے جانے کے اخراجات...... اوپر سے خالہ نور جہاں کی مسلسل بیماری...... نادیہ کی اپنی تنخواہ چالیس ہزار سے اوپر تھی۔ وہ ایک بہت ہی اچھی ٹیچر تھی۔ کئی بار اسے اچھی ٹیچر کا ایوارڈ مل چکا تھا۔ اس کے پڑھائے ہوئے اسٹوڈنٹس پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ کئی بار پرانے طلبا نے فنکشن کیے اور نادیہ اور کئی دوسری ٹیچرز کو بہت پروٹوکول دے کر اعزازات دیے پھر اس کا ٹیوشنز کا سلسلہ بھی چل رہا تھا۔ اِدھر طاہر بھی کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ خوراک اور لباس میں انتہائی سادگی اختیار کی جا چکی تھی۔ اس طرح ابھی تک ہر خرچ مشکل آسان پورا ہو رہا تھا۔ یاسر کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ نادیہ منتظر تھی کہ یاسر فارغ ہو کر ہاؤس جاب شروع کر دے تو اس کا ہاتھ ذرا کھلے اور وہ گھر کی طرف توجہ دے کیونکہ ایک عرصے سے اس نے بس گزارہ کیا تھا نہ کچھ نیا بنایا نہ خریدا کہ اچانک خالہ نور جہاں نے آنکھیں موند لیں۔ کفن دفن، سوئم، دسواں اور چہلم نادیہ نے بھی کچھ رواج کے مطابق کیا۔

دوسرے مہینے طاہر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ بظاہر تو کوئی چوٹ نہیں تھی لیکن اس نے کمر کے ہلکے سے درد کی شکایت کی جو بعد میں شدت اختیار کر گیا۔ پتا چلا کہ مہرہ اپنی جگہ سے ہل کر دوسرے مہرے پر جھک گیا ہے۔ بہت علاج ہوا۔ ایک آپریشن بھی ہوا۔ اتنا ہوگیا کہ وہ چھڑی کے سہارے چند قدم چلنے لگا... ورنہ بستر سے اترنا ہی محال تھا۔ بینک سے لمبی چوڑی چھٹی لی۔ ظاہر ہے تنخواہ پوری تو نہیں مل سکتی تھی۔ گھر کا سارا معاشی نظام ہل کر رہ گیا۔

کچھ عرصے تو نادیہ نے تھوڑی بہت بچت کا سہارا لیا جو اس نے برے بھلے وقت کے لیے کر رکھی تھی مگر کب تک آخر اسے اپنے بھائیوں سے سہارا لینا پڑا۔ کمیٹیاں ڈال ڈال کر قرضہ اتار دیتی مگر اگلا سمسٹر سر پر کھڑا ہوتا۔ اسی دوران یاسر نے بہت ہی اعزازی نمبروں سے اپنا فائنل مکمل کرلیا تو نادیہ نے اطمینان کی سانس لی۔

''یاسر تمہارے ابو بتا رہے تھے کہ راؤ مختار صاحب تمہیں اسی شہر میں ہاؤس جاب دینے کو تیار ہیں پھر تو بڑی سہولت ہو جائے گی۔'' نادیہ نے ایک دم یاسر کو بتایا مگر یاسر نے جواب نہیں دیا۔

''جواب نہیں دیا تم نے؟''

''مما میں ہاؤس جاب نہیں کروں گا۔''

''کیا؟'' نادیہ کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔

''میں امریکا جا کر مزید اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔'' یاسر نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''مزید اسٹڈی...... مگر کیوں؟ تم ایک قابل ڈاکٹر ہوگے اور بہت اچھا کما رہے ہوگے تو تمہیں خود مزید کوالی فائی کرنے کے چانسز ملتے رہیں گے۔ آخر اتنا وقت اور پیسہ جو تم نے خرچ کیا ہے اس سے اپنے اور اپنے گھر کے لیے کچھ سہولت مہیا کرو۔''

''مما یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔'' یاسر نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ ''مجھے کلینک میں بیٹھ کر مریضوں کے ساتھ جھک جھک کرنے کے بجائے اپنے اسٹوڈنٹس کو پڑھانا اور لیکچر دینا اچھا لگتا ہے۔''

''مگر اس کے لیے تو بہت سرمائے کی ضرورت ہوگی بیٹا۔'' نادیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ رومی اور سونیا کو تو ابھی بہت پیسے چاہئیں۔''

''مما صرف پیسوں کے لیے آپ نے پہلے بھی کبھی ہماری پڑھائی کو داؤ پر نہیں لگایا۔'' یاسر نے یاد دلایا۔

''ہاں، مگر...... مگر اس وقت اور بات تھی، تمہارے ابو اس وقت تندرست تھے اخراجات بھی کم تھے۔ میں بھی خاصی مقروض ہوگئی ہوں اور مزید قرض کی متحمل نہیں ہوسکتی۔''

''قرض کی کیا ضرورت ہے مما۔ ہم یہ گھر بیچ دیں گے۔ پیسے ہوں گے تو پھر بن جائے گا۔'' نادیہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے ہر برا بھلا وقت اس لیے کاٹ لیا تھا کہ پانچ مرلے کا یہ گھر اس کی پناہ گاہ تھا۔ گرمی سردی سے بچانے والی یہ چھت ان کی اپنی تھی۔ انہیں یہ خطرہ تو نہیں تھا کہ کوئی آ کر کہے گا کہ گھر خالی کریں۔

وہ ایک دم چپ ہوگئی اور چند دن کے بعد جب گاہک آنے لگے تو نادیہ نے طاہر سے بات کرنے کی کوشش کی تو طاہر نے یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا کہ بچے اچھی ملازمت پر ہوں گے تو تم زیادہ بڑے گھر میں رہ سکو گی۔ یاسر امتیازی سلوک کا عادی تھا۔ اسے اس وقت صرف اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ سات سال بعد جب وہ وطن لوٹتا تو دولت اس کے

ڈینگی ہو جانے کے بعد بچاؤ

ایک گلاس گنے کے رس میں ایک چمچ چقندر کا جوس ایک چمچ لیموں کا رس ملا کر صبح شام پی لیں۔ اگر آپ کو ڈینگی فیور ہو چکا ہے تو اس علاج سے بخار اتر جائے گا اور آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

از مسز نزہت اشفاق، نارتھ کراچی

گھر کی لونڈی ہوتی۔ اس کا ایک پاؤں اپنے وطن میں ہوتا تو دوسرا ملک سے باہر...... بڑے بڑے اسپتال اس کے منتظر رہتے...... مگر یہ درمیان کے سات سال...... بار بار امریکا کا سفر...... انٹری ٹیسٹ...... رہائش...... اس کے لیے اس نے گھر بکوانے کا پروگرام بنالیا۔ یہ سوچے بنا کہ جس آمدنی میں اب گزارہ مشکل ہورہا ہے گھر کا کرایہ کہاں سے ادا ہوگا۔

بہرحال گھر بک گیا۔ یاسر ٹیسٹ دینے امریکا چلا گیا۔ نادیہ مناسب گھر کی تلاش میں گھر گھر کی ٹھوکریں کھارہی تھی۔ کہیں سہولتیں تھیں تو کرایہ زیادہ تھا، کوئی شہر سے باہر تھا تو کوئی بہت ہی تنگ گلیوں میں...... کوئی بہت گرم تھا تو کوئی بہت تاریک...... آخر ایک بے آرام سے گھر میں ٹک کر اس نے اعلان کردیا کہ وہ مزید سامان پیک اور ان پیک کرنے سے قاصر ہے اور اب اور کہیں نہیں جائے گی۔ گھر سے ملی ہوئی رقم سے طاہر نے کچھ قرضہ اتارا اور باقی کی رقم یاسر کے نام مختص کردی، اللہ اللہ خیر سلا...... رومی اور سونیا باپ کے ترکے سے زندگی میں محروم ہوگئے۔

☆☆☆

رومی کا آخری سال تھا یاسر امریکا سیٹل ہوگیا تھا۔ اسے امریکی شہریت مل گئی تھی اور بڑی تندہی سے اسٹڈی میں لگا ہوا تھا۔ ایک دن اس کا فون آیا۔

''مما میں بہت جلد پاکستان آرہا ہوں، آپ کو خوش خبری سنانے کے لیے۔''

''کیسی خوش خبری؟'' نادیہ اشتیاق سے بولی کیونکہ امریکا جاکر یاسر سب کو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ ہفتوں بعد کوئی فون آتا تو مختصر سا سلام دعا اور بس...... اور پھر ایک دن وہ اچانک آگیا۔

''بھائی آپ، ایسے اچانک؟'' سونیا اس سے چمٹ کر بولی۔

''سرپرائز بھئی، سرپرائز......'' یاسر ہنس کر بولا۔

''کہو بھی...... کیا سرپرائز ہے یا یونہی پہیلیاں بجھواتے رہو گے؟'' نادیہ یاسر کو گلے لگا کر بولی۔

''مما...... مما میں شادی کرنے آیا ہوں۔'' یاسر ذرا رک کر بولا۔ خوشی اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

''شادی...... مگر کس سے؟'' نادیہ حیران ہوکر بولی۔

''رمنا...... رمنا ہے آپ کی بہو کا نام......''

''وہ رمنا تو راؤ مختار کی بیٹی کا نام ہے۔''

''رمنا پاکستان میں میری کلاس فیلو تھی۔ ہم اکٹھے ہی امریکا گئے تھے وہاں ہم ساتھ ہی پڑھ رہے ہیں۔'' یاسر نے بغیر کسی جھجک کے بتایا۔ نادیہ خاموش ہوگئی۔

''راؤ صاحب کا خیال ہے کہ اس طرح رہنا ٹھیک نہیں...... اس لیے ہمیں شادی کرلینی چاہیے، امریکی قانون کے مطابق میں ابھی تین سال تک شادی نہیں کرسکتا۔ اس دوران کوئی بے بی وغیرہ پیدا ہوگیا تو شرعی لحاظ سے درست نہیں ہوگا۔ اس لیے ہم نے پاکستان میں شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' یاسر نے اس طرح بتایا جیسے کوئی بیماری یا اس کا علاج بتارہا ہو، اس کی آواز میں نہ کوئی جھجک تھی نہ شرمندگی' نادیہ کے کان سلگنے لگے۔ سونیا اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''آج راؤ صاحب آئیں گے، آپ ان سے طے کرلیجیے گا کیونکہ ہم صرف ایک ہفتے کے لیے آئے ہیں۔'' یاسر باتھ روم جاتے ہوئے بولا۔ طاہر دوسرے کمرے میں تھے نادیہ ان کے پاس چلی گئی۔ رومی بھی آیا ہوا تھا مگر اس وقت باہر تھا۔

شام کو راؤ مختار صاحب، ان کی بیگم صاحبہ، بھائی اور کئی رشتے دار اکٹھے ہوکر آئے۔ یاسر نے نادیہ کے مشورے کے بغیر ان لوگوں کا کھانا ہوٹل سے منگوایا، دو دن بعد نکاح اور تیسرے دن ولیمہ ٹھہرا۔ نادیہ کو نہیں پتا کب کارڈ بٹے، کب شاپنگ ہوئی، ولیمے کا انتظام کس نے کیا، کیا مینو تھا۔ اس نے ایک آدھ بار یاسر سے پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

''مما یہ آپ کا ہیڈک نہیں ہے۔ سب ہوجائے گا۔'' وہ پریشان سی ہوکر چپ رہی۔ رشتے دار باتیں بنارہے تھے، بہن بھائی طعنے دے رہے تھے مگر وہ کیا کرتی۔ کوئی اسے پوچھے تو وہ بھی کسی کو کچھ بتائے...... یاسر کا رویہ بالکل عجیب ہوگیا تھا۔ ہر کام بغیر پوچھے کررہا تھا۔ آخر ہفتہ گزر گیا۔ یاسر اور رمنا اپنا سامان باندھے جانے کو تیار ہورہے تھے کہ راؤ صاحب بھی آگئے۔ نادیہ نے انہیں بٹھایا اور خاطر تواضع میں لگ گئی۔

''بھابی جی رہنے دیں...... آپ بہت تھک گئی ہیں...... اب کچھ ذمے داریاں ہمیں بھی دے دیں۔ آخر کو سمدھی ہیں ہم اب۔'' راؤ صاحب خوش دلی سے بولے۔

''کیسی ذمے داریاں؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''یہی بچوں کی ذمے داریاں...... آپ نے یاسر کو سگی ماؤں سے بڑھ کر پالا۔ محبت دی اسے اس منزل پر پہنچایا......'' راؤ صاحب سانس لینے کو رکے، نادیہ خاموش تھی۔

''اب آپ کی ذمے داری ختم...... آج سے یاسر میاں میری ذمے داری ہیں، کیونکہ خیر سے اب یہ میرے داماد ہیں۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ بچوں کا مستقبل ہے، ان کا شوق ہے تو کیوں نہ انہیں امریکا میں ہی سیٹل کردوں۔ یہ پڑھ کر فارغ ہوں گے تو پاکستان میں دھکے کھانے کے بجائے امریکا میں ہی رہائش اختیار کریں گے، اب آپ یاسر کی فکر چھوڑ کر اپنے بچوں کی فکر کریں۔ انہیں بھی آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔'' نادیہ سن ہوکر رہ گئی۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

''یاسر کس کا بچہ تھا......؟ میں نے کسی سے پوچھا کیوں نہیں؟ اگر یہ میرا بچہ ہوتا تو اس شخص کا منہ نوچ لیتا...... یہ میری ماں ہیں...... یہی میری مما ہیں مگر وہ تو چپ چاپ بیوی کو کندھوں سے تھامے باہر نکل گیا۔ شاید وہ پلٹے اور پلٹ کر یہی بات مجھ سے کہے۔'' نادیہ آس بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

''یہ کون سا یاسر تھا؟'' آنسوؤں کے موٹے موٹے پردے اس کی نگاہوں کو دھندلائے دے رہے تھے۔ وہ کب پلٹا کب آیا اسے پتا ہی نہیں چلا۔

''مما......'' اس نے نادیہ کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ نادیہ چونک کر پلٹی۔

''یاسر......؟''

''نہیں رومی......'' کسی نے آہستہ سے کہا۔

نادیہ اس کے گرم وجود سے چمٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ سونیا نے پانی کا گلاس نادیہ کے ہونٹوں سے لگا دیا اور بہت مہربان ہاتھوں سے ماں کے سر کو سہلانے لگی۔ نادیہ نے آنکھیں کھول کر دونوں بچوں کو دیکھا اور دونوں کے سروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

ناولٹ

کانچ سی لڑکی

انجم انصار

ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے
ہر لڑکی نازک ہوتی ہے
ہر لڑکی کانچ سی ہوتی ہے
ہر لڑکی حساس ہوتی ہے

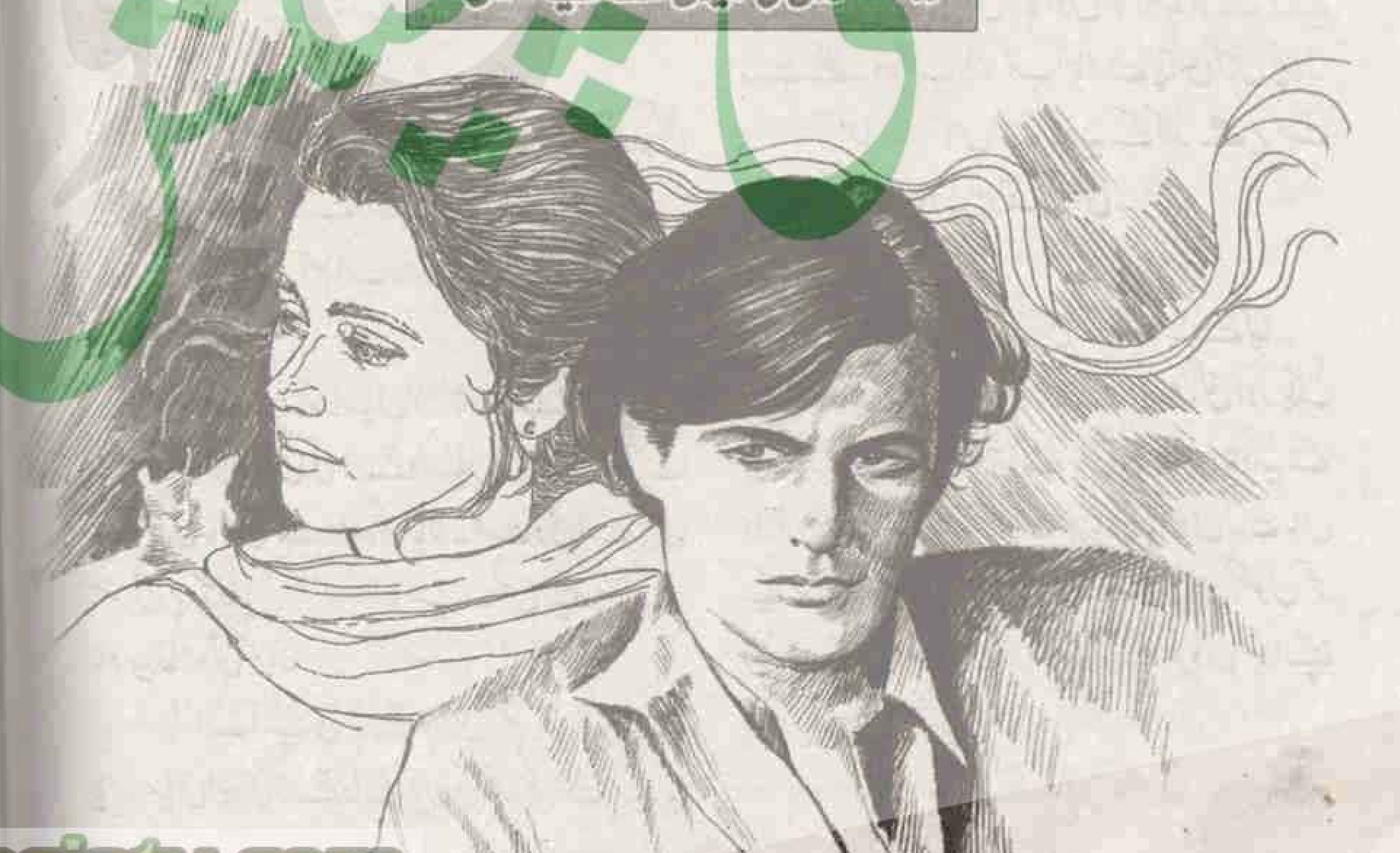
اور

ہر لڑکی اپنے والدین کے دل کا ٹکڑا ہوتی ہے۔
کیا ہمارے یہ احساسات صرف اپنی بیٹیوں کے لیے ہوتے ہیں؟

دوسروں کی بیٹیوں کے لیے نہیں؟

جاڑے کی چاندنی میں ہر شے جیسے روشنی میں نہائی ہوئی سی تھی۔ وہ اپنے وسیع و عریض لان میں بیٹھی چاند کو یوں تکے جا رہی تھی...... جیسے یہ خوب صورت منظر وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ موسم میں خنکی رچی ہوئی تھی...... اور اول شب بارش ہونے کی وجہ سے پتوں سے موتی...... تیز ہوا کے ساتھ اس کو بھگوتے ہوئے جلترنگ سا بجا رہے تھے۔

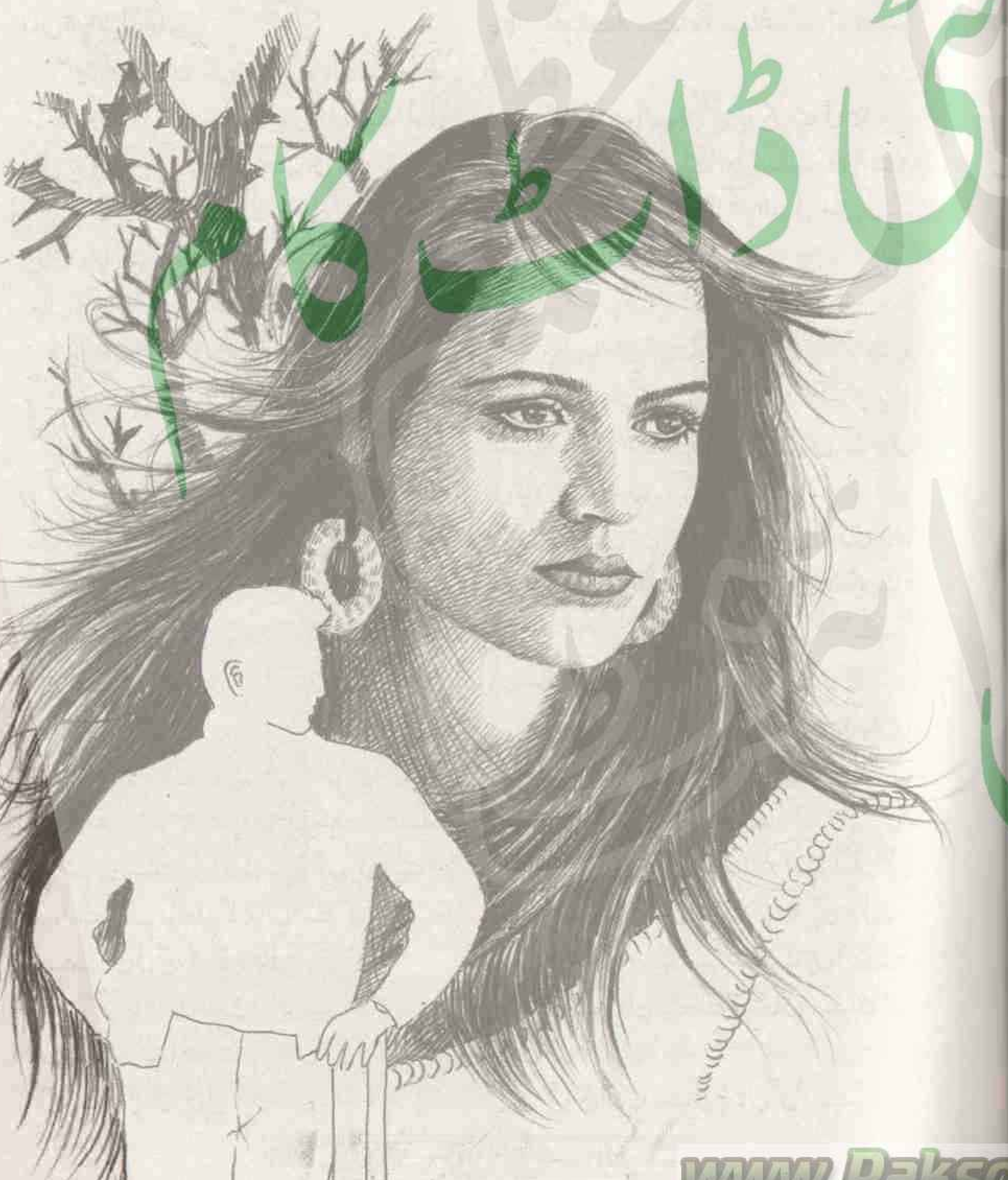
''مینا اب اندر آ جاؤ...... اتنی دیر لان میں بیٹھو گی تو بیمار ہو جاؤ گی۔'' ماما نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ کر اسے تیسری مرتبہ آواز لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا...... بارش کی بوندیں کھڑکی کے شیشے سے یوں پھسل رہی تھیں جیسے آنسو بہا رہی ہوں۔



''کیا بارش رویا کرتی ہے......؟'' یکبارگی اس نے سوچا۔ ''نہیں بارش تو ہنستی ہے...... اور اسی شہزادی کی طرح ہنستی ہے جن کے سینے پر موتی جڑا ہوتا ہے۔'' اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دی۔

کپڑے جھاڑ کر جب وہ اندر جانے کے لیے اٹھی تو یکبارگی کانپ سی گئی...... اس کے گیلے کپڑوں نے تیز ہوا کے جھکڑ کو سہا تو اسے سردی کی شدت کا اندازہ ہوا...... جب وہ اندر اپنے کمرے میں پہنچی...... تو اس کے دانت بج رہے تھے۔

''بوا...... گرما گرم کافی میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' اپنے کمرے کے انٹر کام سے وہ ملازمہ سے کہہ رہی تھی۔



"بیٹا اس وقت، آدھی رات کو کافی پیوگی؟" بوا جمائی لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"ہاں...... اسی وقت...... ایک کپ نہیں، ایک کیتلی بھر کر۔" اس نے جیسے حکم دیا۔ وہ ایسی ہی تھی اپنی مرضی کے تحت چلنے والی۔ گھر والوں نے تو عاجز آکر اسے اس کے حال پر چھوڑ ہی دیا تھا مگر دادی اماں کا پکا خیال تھا۔

"مینا کو بگاڑنے میں پورا ہاتھ ماں کے ساتھ ساتھ باوا کا بھی ہے...... لڑکیاں کوئی ایسے اٹھائی جاتی ہیں کہ ان پر کوئی روک ٹوک ہی نہ ہو، درخت بھی ٹیڑھا میڑھا بڑھنے لگے تو مالی اس کی کاٹ چھانٹ کیا کرتا ہے کہ وہ سیدھا سیدھا بڑھے...... مگر یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔"

"اماں...... ابھی مینا بچی ہے، نا سمجھ ہے، اس پر کیسے سختی کروں؟" سرفراز صاحب مسکرا کر ماں سے کہتے۔

"کوئی بچی وچی نہیں ہے، یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے مگر تم لوگوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا ہے۔ کوئی روکا ٹوکی ہے ہی نہیں۔ وہ جو دل چاہے کرے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ جب سسرال جائے گی تو پھر وہاں کی کڑوی کسیلی کیسے سہہ پائے گی۔"

"اماں...... میری بیٹی کوئی معمولی بیٹی نہیں ہے، ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیٹی ہے...... سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہے، میں کسی ایسے گھر میں اسے کیوں بیاہوں گا جہاں اسے کسی کا حکم سہنا پڑے۔" ان کی تیوری چڑھ جاتی۔

"تو کیا ساری زندگی اسے اپنے گھر میں رکھ کر اس کے ناز نخرے اٹھاؤ گے؟" اماں اپنی بات بیٹے کو سمجھانے کی پوری سعی کیا کرتی تھیں۔

"اماں...... میری بیٹی جہاں جائے گی...... اس کے سسرال کے لوگ اس کے نخرے اٹھا کر سرخرو ہوا کریں گے۔" سرفراز صاحب کا لہجہ زعم بھرا ہوتا۔

"چاہے کتنی ہی ترقی ہو جائے اور چاہے کسی کے پاس کتنا ہی پیسہ آجائے، ابھی تک بہو کو صرف بہو ہی سمجھا جاتا ہے۔ بیٹی کے برابر کا درجہ تو دیا نہیں جاتا...... تم بات کر رہے ہو نخرے اٹھا کر سرخرو ہونے والوں کی......"

"اماں...... آپ دیکھتی جائیں میری مینا کے لیے چاہنے والے کیسے ہوں گے۔" وہ بات کو ہنسی میں اڑا کر اٹھ جاتے مگر ان کی اماں کی...... بڑبڑاہٹیں رکنے کا نام نہیں لیا کرتیں۔

☆☆☆

نہاں بالوں میں برش کر رہی تھی اور کتاب پر بھی نظر ڈال رہی تھی۔ آج اس کا انٹر کا آخری پرچا تھا۔ اپنا بیگ سرعت سے سیٹ کر کے اس نے بڑی سی چادر اوڑھی اور ماں کے پاس آکر کہا۔

"ابو کہاں ہیں؟ ان سے کہیں ناں جلدی سے اپنی بائیک نکالیں اور مجھے امتحانی سینٹر چھوڑ آئیں۔"

"مگر تم نے تو کل کہا تھا کہ امتحان ختم ہو گئے۔" ماں نے سر تھام کر کہا۔

"ہاں کہا تھا، آج کا پرچہ تو آسان سا ہے کل تک کے پرچے مشکل تھے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں امتحان دینے ہی نہ جاؤں۔"

"مگر نہاں...... تمہارے ابو تو اپنے آفس نکل گئے۔" ان کے لہجے میں پریشانی جیسے مزین ہو گئی۔

"مگر ابو تو نو بجے کے بعد جاتے ہیں آج آٹھ بجے سے پہلے کیوں چلے گئے؟" نہاں کے لہجے میں حیرانی گھلی ہوئی تھی۔

"آج ٹرانسپورٹ کی ہڑتال بھی تو ہے۔"

"کیا کہا...... آج ہڑتال ہے۔" پانی کا گھونٹ بھرتی نہاں کے منہ سے پانی باہر نکل گیا اور وہ سرعت سے باہر کی جانب لپکی۔

"ارے...... آج عبایا نہیں پہنا...... ایسے ہی چادر اوڑھ کر کیوں جا رہی ہو؟" ماں کو اس وقت بھی امتحان سے زیادہ اس کا عبایا یاد تھا۔

"استری کرتے ہوئے جل گیا۔" وہ بھاگتے ہوئے بولی۔

اب وہ اپنے گھر سے نکل کر باہر کی جانب بھاگ رہی تھی۔ راہ چلتے لوگ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ راستے میں بھری ہوئی ٹیکسیوں تک کو اس نے ہاتھ دے ڈالا تھا...... مگر سب اپنی اپنی منزلوں کی جانب گامزن تھے۔ نہاں کی بڑی سی چادر اب سر سے اتر گئی تھی...... اس کے بال اس کے منہ پر آ رہے تھے مگر اس کی رفتار ایسی تھی کہ اگر وہ کہیں رک گئی تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔

اُدھر گھر میں نہاں کی امی پریشان ہو کر اپنے شوہر کو فون کر کے یہ ساری پریشانی بتا رہی تھیں کہ کس طرح نہاں کو امتحان سینٹر خود جانا پڑا ہے اور اسے شاید پیدل ہی جانا پڑے گا کہ ٹرانسپورٹ کی تو آج ہڑتال ہے۔

"مگر میں تو آفس پہنچ چکا ہوں...... یہاں سے اگر واپس بھی پلٹوں تو نہاں کو اس کے سینٹر وقت پر نہیں پہنچا سکتا۔"

"غلطی تو نہاں ہی کی ہے ناں...... کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی کہ آج امتحان ختم ہو گیا...... میں تو یہی سمجھوں گی ناں کہ کل اس کے پیپرز ختم ہو گئے۔" نسرین بیگم نے شکایتی لہجے میں میاں سے کہا۔

"میری بیٹی کی کوئی غلطی نہیں ہے، آپ کو اس کا ٹائم ٹیبل یاد ہونا چاہیے تھا...... ایک ہی ہماری بچی ہے...... آپ کو اس سے وابستہ ہر بات اچھی طرح سے معلوم ہونی چاہیے۔"

"ہاں، یہ غلطی تو مجھ سے ہو گئی۔" نسرین بیگم تاسف بھرے لہجے میں اعتراف کر رہی تھیں۔

☆☆☆

"ارے...... ارے...... یہ کس غلط سڑک پر تم نے گاڑی لے لی۔" ریحان نے ڈرائیور سے کہا۔

"سر میں نے شارٹ کٹ لیا ہے، آج آپ کو آفس میٹنگ میں جلدی بھی تو پہنچنا ہے، ہے ناں......"

"ٹھیک ہے، دیکھ کر نکالو...... ہڑتال کے

باعث آج پیدل چلنے والوں کا رش کچھ زیادہ ہی نظر آرہا ہے۔“

”گاڑی روکو...... گاڑی روکو۔“ حواس باختہ نہاں نے جب اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی...... تو صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے...... اس کا پیپر شروع ہونے میں اسی لیے اب وہ ہر اس گاڑی کو ہاتھ دے رہی تھی جس کا رخ اس کے امتحانی سینٹر کی جانب تھا۔ گاڑیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ ریحان کے ڈرائیور نے بھی نہاں کو بے پروائی سے دیکھتے ہوئے گاڑی نکال لی تھی۔

”ارے رکو تو سہی...... بیچ سڑک پر کھڑی وہ لڑکی نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔“ ریحان...... نے شاید اسے ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا تھا۔

”آپ کو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”تم پوچھو تو سہی...... ایک پریشان لڑکی کو اس طرح نظر انداز کرتے ہوئے سب گزر جائیں...... یہ کوئی اچھی بات نہیں۔“ ریحان کے لہجے میں سرزنش تھی ڈرائیور نے ریسورس میں گاڑی لی اپنی جانب کا شیشہ اتار کر منہ باہر کر کے روکھے لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے، گاڑی کو ہاتھ کیوں دیا تھا؟“

”میرا پیپر ہے...... پرچہ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں ہڑتال کی وجہ سے ٹرانسپورٹ سڑک سے غائب ہے۔“

”کتنی دور ہے تمہارا سینٹر......؟“ ڈرائیور نے سوچا پتا نہیں...... اسے کہاں جانا ہو۔

”اسی روڈ کے آخر میں بائیں جانب کالج ہے وہیں پر...... آپ کو اپنی گاڑی کہیں توڑنی موڑنی نہیں ہوگی۔“

”بٹھا لیں......“ ریحان جو پیچھے بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا ڈرائیور سے بولا۔

نہاں نے ریحان کی بات سنتے ہی پیچھے کا دروازہ کھولا اور بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے بولی۔

”تیز چلاؤ...... اور دو منٹ میں مجھے سینٹر پہنچا دو۔“ ڈرائیور نے سرشار ہو کر گاڑی... جہاز کی رفتار پر چلا دی۔ نہاں اپنی فائل پر جھکی ہوئی تھی اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ اس کے برابر بیٹھا ریحان پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کالج کی عمارت کے پاس گاڑی ایک جھٹکے سے رکی...... اور نہاں نے اپنی فائل لے کر عمارت کی جانب دوڑ لگا دی۔ جاتے سمے نہ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور نہ ہی شکریے کے جملے ادا کیے۔ وہ تو کسی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے عمارت کے اندر کہیں غائب ہو گئی تھی اور ریحان اس کا رومال ہاتھ میں لیے مستقل اسی جانب دیکھ رہا تھا جہاں سے وہ غروب ہوئی تھی۔

”سر چلیں......؟“ ڈرائیور نے اسے یوں خاموش سا پا کر پوچھا۔

”ہاں، ہاں...... چلو ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“

”میں نے سوچا شاید ان صاحب کو پرچہ ختم کرنے کے بعد گھر پہنچانا بھی ہمیں ہی ہوگا۔“

”پاگل ہو گئے ہو کیا تم؟“ ریحان کی تیوری چڑھ گئی۔

”سر، آج ہڑتال ہے ناں!“ گلاب خان نے زیرِلب مسکرا کر کہا کہ صاحب کی بلاوجہ کی ہمدردی کی اس عادت سے وہ بیزار تھا۔

☆☆☆

”بینا کیا آج کلاس نہیں لو گی؟“ رمشا نے گھڑی دیکھ کر کینٹےٹیریا سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر واسع کا پیریڈ بڑی مشکلوں سے گزرتا ہے آج جانے کا موڈ نہیں ہے۔“

”ہم تو کلاس لینے جا رہے ہیں، تم یہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کرو گی؟“ شہلا نے بیگ سے برش نکال کر اپنے بالوں پر مارتے ہوئے کہا۔

”بینا! آج ہم سب کو ٹریٹ دیں گی۔“ شہزاد اپنے دوستوں کے ساتھ بینا کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کس خوشی میں؟“ بینا نے پوچھا۔

”آج کی تمہاری ڈریسنگ اے ون ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر کہا۔

”کب نہیں ہوتی ہے؟“ بینا کا لہجہ تو فخر لیے ہوئے تھا۔

”مگر آج تو آفت ہے قیامت ہے۔“ اس نے اس کے بلیک کیپری پر سرخ شرٹ کو دیکھتے ہوئے لہک کر کہا۔

”جو بات تم مجھے بتا رہے ہو، وہ میں پہلے ہی سے جانتی ہوں۔“ بینا مسکرائی اور پھر اپنے بیگ سے پانچ سو کا نوٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

”جو کھانا ہے...... کھا لو مگر میری تعریف بغیر ٹپ لیے کرنا سیکھو۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔

”پاگل کہیں کی۔“ اس کے جانے کے بعد سب سے بلند قہقہہ شہزاد کا ہی تھا۔

☆☆☆

”تمہارے امتحان ختم ہو گئے ناں؟ کل تو کوئی پیپر نہیں ہے۔“ نسرین بیگم نہاں سے پوچھ رہی تھیں۔

”ہاں امی...... امتحان ختم...... اب دل بھر کر سوؤں گی میں۔“

”ایسا تو نہیں کوئی آسان سا پیپر ابھی باقی ہو؟“

”نہیں امی...... آج کا آخری تھا شکر ہے...... ایک ڈرائیور نے لفٹ دے دی ورنہ تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔“

”تم نے کسی سے لفٹ لی تھی؟“ ماں کا دل دہل سا گیا۔

”مجبوری تھی...... ورنہ کیا کرتی۔“

”اگر کوئی ایسا ویسا ہوتا تو......؟“ اس سوچ نے ہی اُن کا چہرہ پیلا سا کر دیا تھا۔

”تو میں گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دیتی۔“ نہاں نے ماں کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کرتے ہوئے کہا اور انہوں نے نہاں کو اپنے سینے سے یوں لگا لیا جیسے کوئی مرغی اپنے پروں میں اپنے بچے کو چھپا رہی ہو۔

☆☆☆

”اے ہے، یہ ہوا کیا ہے؟ ہاتھ میں پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟“ دادی نے بینا کے بازو پر چڑھی پٹی دیکھ کر پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

”بس ایسے ہی۔“ اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔

”بیٹا......! ابھی پٹی بندھوانے کا فیشن تو شروع نہیں ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر طرف لڑکیاں پٹیاں باندھے مجھے بھی نظر آ جاتیں۔ بتاؤ تو سہی، کیسے لگی تمہارے یہ چوٹ۔“ اب وہ اپنے تخت سے اٹھ کر بینا کے پاس کھڑی اس کا ہاتھ ہلا جلا کر دیکھ رہی تھیں۔

”بائک ریس میں...... میں گر گئی تھی تو بس یہ ذرا سی چوٹ لگ گئی۔“

”اے لو...... تم بائک کب سے چلانے لگیں...... اتنی اچھی، اتنی مہنگی تو تمہاری گاڑی ہے تو

پھر تم غریب غربا کی طرح پھٹ پھٹی پر کیوں اتر آئیں۔"

"اُفوہ...... آپ کی سمجھ میں تو بات ہی نہیں آتی ہے۔" مینا نے جھنجلا کر کہا۔

"یہی تو پوچھ رہی ہوں...... کہ بائک چلانے کی ایسی افتاد کیا آ گئی تھی؟"

"یونیورسٹی میں شرط لگی تھی، اس لیے چلالی۔"

"مگر تمہیں تو بائک چلانی نہیں آتی؟"

"جبھی تو گر گئی۔"

"جو کام تمہیں آتا ہی نہیں تھا تو اس میں ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تا کہ ہر کام مجھے آجائے اور کوئی یہ نہ کہہ پائے کہ مینا کو یہ نہیں آتا۔"

"ایسے لوگوں کو پاگل کہا جاتا ہے۔" دادی کو غصہ ہی تو آگیا تھا۔

"پاگل تو میں ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تم سے زیادہ تمہاری ماما اور پاپا پاگل ہیں جو تمہیں صحیح، غلط کا بتاتے ہی نہیں ہیں۔"

"دادی...... اگر وہ بتا بھی دیں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"کیوں فائدہ نہیں ہوگا؟" دادی نے تیوری چڑھا کر ہنستی مسکراتی اپنی پوتی کو غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ جو انہیں صحیح نظر آتا ہے، وہ ہمارے لیے غلط ہو جاتا ہے اور جو غلط دکھائی دیتا ہے وہ ہمارے لیے پرفیکٹ ثابت ہوتا ہے تو پھر ماما، پاپا ...... کیوں اس معاملے میں پریشان ہوں۔"

"نہیں میرا بچہ...... غلط، غلط ہی ہوتا ہے اور اس سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے جیسے تم بائک چلانا نہیں جانتی تھیں...... اس کے باوجود لوگوں کی دیکھا دیکھی تم نے بائک چلا کر غلط قدم اٹھایا اور اسی وجہ سے تمہارے بازو پر یہ چوٹ بھی لگ گئی اگر تم ایسا نہ کرتیں، تو کبھی نقصان نہیں اٹھاتیں۔"

"نو...... دادی...... نو زندگی سے اگر اپنی خوشی اور تھرل کو نکال دیا جائے تو کچھ باقی نہیں بچتا اور یہ نقصان اور پریشانیاں تو ہر انسان کے پیچھے لپکا کرتی ہیں۔ میرے یہ چوٹ کسی دوسری وجہ سے بھی لگ سکتی تھی۔ اب جیسے میری اسپورٹس کار گیراج میں کھڑے کھڑے ہی خراب ہوگئی۔ کہیں جائے بنا ہی اس کا ٹائر برسٹ ہوگیا۔" مینا کی تقریر جاری تھی مگر دادی بیزار ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ کوئی فائدہ نہیں...... اسے کچھ سمجھانے کا۔ ان کی... بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

☆☆☆

"نہاں بیٹا رزلٹ آنے کے بعد تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"امی...... میری سہیلیوں کا پورا گروپ بی بی اے کرنا چاہتا ہے، فائنانس میں۔"

"مگر وہ سب تو یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہ رہی ہیں......" نسرین بیگم نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں امی...... ہم سب اچھے نمبروں سے پاس ہوں گے تو کراچی یونیورسٹی میں بہ آسانی داخلہ مل جائے گا۔"

"مگر بیٹا...... وہ تو مخلوط تعلیمی ادارہ ہے ناں؟"

"ہاں وہ تو ہے۔"

"تمہارے ابو کو پسند نہیں ہوگا کہ تم لڑکوں کے ساتھ پڑھو۔"

"تو پھر میں کسی گرلز کالج میں داخلہ لے لوں؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

"مگر امی ...... میری سہیلیوں کا گروپ جو اسکول کے زمانے سے ہے، وہ تو چھوٹ جائے گا۔"

"تو کیا ہوا، نئی سہیلیاں بن جائیں گی۔" ماں نے حوصلہ دیا تو وہ مسکرادی مگر اس کی مسکراہٹ کتنی پھیکی سی تھی یہ اس کی ماں بخوبی جان گئی تھی۔

☆☆☆

ریحان ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر کام کرتا تھا۔ اس کمپنی میں بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں جو اپنی ذہانت اور خوب صورتی میں بھی یکتا تھیں مگر ریحان نے کبھی ان کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔ جیسا وہ کئی دنوں سے اس بے پروا سی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی ضرور تھی مگر اس نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ریشمی، دراز بال...... اڑ، اڑ کر اس پر آرہے تھے مگر وہ بے نیاز سی اپنی فائل پر جھکی ہوئی تھی۔ گاڑی سے اترتے سمے اس کا آنچل اس کی کھڑکی سے اٹکا تھا مگر اس نے اس پر نظر ڈالے بغیر زور سے کھینچ لیا تھا اور ان بھاگتے دوڑتے لمحات میں اس کا گلابی رومال وہیں سیٹ پر رہ گیا تھا جو ریحان نے بلا سوچے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

"پتا نہیں کون تھی وہ؟ کیوں ٹکرائی تھی مجھ سے۔" یہ سوال وہ کئی بار اپنے آپ سے پوچھ چکا تھا مگر کوئی جواب...... نہیں ملا تھا۔ اپنے آفس جاتے ہوئے از خود...... اس نے ڈرائیور سے وہی شارٹ کٹ اختیار کرنے کو کہا تھا مگر اس سڑک پر وہ اسے دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ "پتا نہیں اب ہڑتال کب ہوگی؟" اسے اپنی اس سوچ پر خود ہی ہنسی آگئی تھی۔

☆☆☆

بیٹوں کی بات سن کر سرفراز صاحب بے اختیار ہنس دیے۔

"آپ ہنس رہے ہیں پاپا......" شاہد نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا...... آپ مینا کو زبردست سی ڈانٹ پلائیں گے۔" دانش نے بھی اپنے بڑے بھائی کی وکالت کی۔

"حیرت ہے تم لوگ مڈل کلاس ذہنیت کا شکار کیوں ہوگئے ہو؟"

"پاپا یہ اچھی بات نہیں ہے ہماری بہن لڑکوں کے ساتھ گھومے پھرے۔" شاہد کے لہجے کی آنچ خاصی تیز تھی۔

"اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ گھومنا پھرنا کوئی بری بات تو نہیں...... اس کی پڑھائی کے ساتھی اتنا تو حق رکھتے ہیں ناں کہ اس کے ساتھ جا کر کہیں چائے یا کافی پی لیں۔"

"مگر میں جانتا ہوں شہزاد کو اچھی طرح...... اس کا بڑا بھائی بہزاد بھی لفنگا تھا اور یہ بھی ہے اور ان بد قماش لڑکوں کا ہماری بہن پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔"

"میں مینا کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو کسی کو بھی ضرورت سے زیادہ لفٹ کرائے۔ اس لیے تم دونوں کو خوامخواہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔"

"پاپا...... آپ شہزاد کو نہیں جانتے کہ وہ کیسا لڑکا ہے؟"

"کیسا لڑکا ہے؟" سرفراز صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

"وہ اور اس کے تمام دوست بدنامِ زمانہ ہیں...... خاص طور پر اس کے نئے دوست منور نے تو اسے بہت بگاڑ دیا ہے۔"

"اور آج منور نے ہی میرے زناٹے دار تھپڑ کا مزہ چکھ لیا ہے۔" بینا گھر میں داخل ہوئی تو جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"منور سے تمہارا آمنا سامنا کیسے ہوا؟" بڑا بھائی پریشان سے لہجے میں بولا۔

"وہ شہزاد کے پاس یونیورسٹی آیا تھا اور لڑکیوں کی موجودگی میں شہزاد کو غلیظ جوک سنا رہا تھا، میں نے اس کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ منہ سہلاتا سیدھا نکل گیا۔"

"تم اٹھ کر چلی جاتیں...... تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی کسی لڑکے پر ہاتھ اٹھانے کی۔" بھائی نے کہا۔

"آئندہ اس کی ہمت تو نہیں پڑے گی، وہ کچھ بولنے سے پہلے آس پاس نظر تو ڈالے گا ناں...... بھیا یہ خوراک تو اس کے لیے ضروری تھی۔" بینا نے زعم بھرے لہجے میں کہا۔ تب سرفراز صاحب نے تو فکی بھرے لہجے میں کہا۔

"میری بیٹی نے بالکل صحیح کیا۔" اور ہنس دیے۔ "ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، شاباش بینا شاباش۔" وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے۔

"پاپا...... میں نے سوچ لیا ہے آئندہ تو اس کے جوتا کھینچ کر ماروں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کے منہ لگنے کی۔" شاہد کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ساتھ پڑھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر جگہ ان کے ساتھ گھوما پھرا بھی جائے...... لڑکیوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔" دانش بہن سے کہہ رہا تھا اور بینا ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی اپنے پاپا کی باتوں میں محو تھی...... جو وہ کسی کو سبق سکھانے کے حوالے سے سنا رہے تھے اور بینا تائید میں سر ہلا رہی تھی اور دونوں بھائی تاسف بھری نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھ رہے تھے اور ان کے دکھ نے دل کو بھاری سا کر دیا تھا۔

☆☆☆

دل سے ایک انجانے سے دکھ کا بوجھ خود ہی ہلکا ہو گیا یکبارگی تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اسے یوں دوبارہ دکھائی دے گی۔

"شاید یہ وہی ہے...... نہیں...... وہ یہ تو نہیں، اس کے لب کے اوپر ایک چھوٹا سا تل تھا اور اس کے بھی ہے...... ہاں، ہاں یہ وہی ہے۔" ریحان اس وقت ایک لیڈیز بوتیک میں تھا اور اپنی ماں کے لیے شال دیکھ رہا تھا۔ تب اسے عبایا اور حجاب پہنے وہی لڑکی نظر آئی۔ وہ شاید اپنے لیے اسکارف پسند کر رہی تھی۔

"امی، میں یہ دو اسکارف لے لوں؟" اس نے قریب کھڑی اپنی ماں سے کہا۔

"بالکل وہی آواز...... سو فیصد وہی لڑکی ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"نہاں تم اپنے لیے اسکارف دیکھو...... میں اپنے لیے اتنے شال دیکھتی ہوں کوئی۔" ماں دوسرے کاؤنٹر پر جاتے ہوئے بولیں۔ ریحان...... اب اسکارف کے کاؤنٹر پر پہنچ گیا تھا...... وہ گلابی اور میرون اسکارف لینے میں تذبذب کا شکار تھی...... اس کے ساتھ وہ دیگر اسکارف بھی دیکھ رہی تھی۔

"آپ کا پیپر کیسا ہوا تھا؟" وہ اس کے بالکل قریب پہنچ کر بولا۔ لہجہ بہت دھیما تھا مگر نہاں اچھل ہی تو پڑی اور اس کو دیکھتے ہوئے بے اعتنائی سے بولی۔

"آپ سے مطلب...... آپ ہوتے کون ہیں یہ پوچھنے والے؟"

”آپ کو سینٹر تک گاڑی میں لفٹ دی تھی۔ آپ پریشان سی تھیں ناں تو بس۔“

”اوہ...... وہ آپ کی گاڑی تھی؟“ اس کے لہجے کی تلخی نرمی میں گھل گئی۔

”جی ہاں۔“

”شکریہ......“ وہ نظریں نیچی کیے کیے بولی۔

”اور آپ کا پرچہ کیسا ہوا؟“

”ٹھیک......“ اس سے مختصر جواب کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ ریحان کا دل چاہا کہ وہ اس سے مزید باتیں پوچھے اور اسے بتائے کہ اس کا نام نہاں بے حد خوب صورت ہے مگر وہ تو کچھ کہے بغیر اپنی ماں کے پاس چلی گئی اور پھر وہ فوراً ہی بوتیک سے باہر جارہی تھیں، نہ نہاں نے اپنے لیے اسکارف لیے تھے اور نہ ہی اس کی ماں نے اپنے لیے شال۔

”میں نے ناحق اس سے بات کی، اس نے اپنے پسند کیے ہوئے اسکارف تک نہیں لیے۔“ اور پھر ماں کے لیے شال لینے کے بعد وہ ڈھیر سارے اسکارف خریدتا چلا گیا۔ جس جس اسکارف کو نہاں نے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا۔ وہ سارے کے سارے اسکارف ریحان نے خرید لیے تھے۔

☆☆☆

”وہ سائیکی بھی ہے اور پاگل بھی...... سچ کہہ رہا ہوں یار...... وہ لڑکوں پر تو کیا کئی بار لڑکیوں تک پر ہاتھ اٹھا چکی ہے اس لیے اس پگلو کی بات کا کیا برا ماننا۔“ شہزاد اپنے دوست منور کو سمجھا رہا تھا۔

”اگر وہ ایسی ہی پاگل ہے تو تم لوگ اس کے ساتھ کیوں گھومتے پھرتے ہو؟“ منور نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”وہ ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیٹی ہے یار...... دوستوں پر پیسہ لٹانے والی۔ کنجوسی تو اس میں دور دور تک نہیں ہے تو ہم اپنے خیال رکھنے والی کو کس طرح ناراض کرسکتے ہیں۔“

”تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اس کے پیچھے ہو۔“

”اب تو کچھ کہہ مگر ہم اس کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہماری پارٹیز کی رونق اسی کے دم سے تو ہے۔ بینا کی وجہ سے ہی اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں ہماری پارٹی میں آجاتی ہیں۔ بینا ہی کی وجہ سے ہمیں مہنگے مہنگے پرفیومز، برانڈڈ شرٹس ملتی ہیں۔ وہ تو ادھار دے کر بھی واپس نہیں مانگتی۔“ شہزاد نے قہقہہ لگایا تو منور کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

☆☆☆

دادی کو اپنی پوتی بینا سے محبت بھی بہت تھی اور اس کا خیال بھی بہت زیادہ تھا۔ جب ہی تو وہ کسی کی شادی میں سے شرکت کرکے واپس آئیں تو اپنے بیٹے سرفراز سے کہنے لگیں۔

”تمہاری اکلوتی بیٹی ہے، اس کی شادی تک کی تمہیں فکر نہیں ہے۔“

”اماں...... ابھی میں اپنی بچی کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا۔ آپ تو جانتی ہی ہیں ناکہ بینا میری جان ہے، میں تو ابھی یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا کہ اس کی شادی ہوگی اور وہ مجھے چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر چلی جائے گی اور بینا بھی میرے بغیر کہاں رہ سکتی ہے۔“

”اب تم اس کے ساتھ رخصت ہوکر اس کی سسرال میں تو جانے سے رہے کہ لاڈ کرنے والے بادا ساتھ آئے ہیں۔“ بیٹے کی بات سن کر انہیں غصہ ہی تو آگیا تھا۔

”میری بیٹی کانچ سی نازک ہے، آپ اس کو نہیں جانتیں...... ذرا سی بات پر کتنی ہرٹ ہوجاتی

ہے وہ۔‘‘

’’ہر لڑکی ہی کانچ سی ہوتی ہے مگر وقت پڑنے پر فولاد بن جاتی ہے اور میری مینا تو بڑی مضبوط لڑکی ثابت ہوگی۔‘‘ وہ محبت بھرے لہجے میں کہتیں۔

’’وحید صاحب ہمارے گھر مینا کے سلسلے میں آنا چاہ رہے تھے اور میں ہی آنا کانی کر رہا تھا آپ کہتی ہیں تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ اپنی فیملی کو ہمارے ہاں بھیج دیجیے۔‘‘

ایک شام سرفراز صاحب نے ماں کے روز، روز کے فضیحتے سن کر ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور دادی کے چہرے پر بہار سی آ گئی۔

’’کون ہمارے ہاں آ رہا ہے؟‘‘ مینا سر پر پٹی باندھے باپ کے سامنے چلی آئی۔

’’کیا ہوا میری مینا کو؟‘‘ سرفراز صاحب بیٹی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر تڑپ ہی تو اٹھے۔

’’بس سر میں درد ہو رہا ہے۔‘‘ مینا باپ کے برابر صوفے پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر رخسار کو چھوا تو وہ بری طرح تپ رہی تھی۔

’’مینا بیٹا...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔‘‘ وہ یکدم پریشان ہو گئے۔

’’پاپا شاور لینے سے پہلے تو میں بالکل ٹھیک تھی بس سر میں درد تھا...... بوا نے کہا...... نہا لو...... طبیعت ٹھیک ہو جائے گی مگر میری تو مزید بھاری ہو گئی۔‘‘

’’بوا جی......!‘‘ سرفراز صاحب بری طرح دہاڑ اٹھے۔ بوا توے پر جلتی روٹی چھوڑ کر بھاگی چلی آئیں...... ان کے غصے سے تمام ملازمین کانپا کرتے تھے۔

’’آپ جانتی ہیں کہ مینا کمزور لڑکی ہے پھر بھی آپ نے اس موسم میں اسے نہانے کو کہہ دیا۔‘‘

’’صاحب چھوٹی بی بی کے بالوں میں تیل لگایا تھا تو اس لیے کہا تھا۔‘‘ وہ لرزتے لہجے میں بولیں۔

’’اگر مینا کا بخار تیز ہو گیا تو......؟‘‘

’’کیوں ہوگا تیز...... ڈاکٹر کو فون کر دو...... وہ آ کر دوا دے دے گا۔‘‘ دادی نے بیٹے کو سمجھایا۔

’’اماں...... اس سیزن میں مینا کو پہلے ہی دو بار بخار ہو چکا ہے اب بار بار بخار چڑھے گا تو وہ کمزور ہو جائے گی۔ پہلے ہی وہ دھان پان سی تو ہے۔‘‘ سرفراز صاحب کے لہجے میں جیسے پریشانیاں سی گھلی ہوئی تھیں۔

’’آپ کو اپنی جانب سے خود فیصلے کرنے کی ضرورت نہیں ہیں...... خاص طور پر مینا کے معاملے میں۔‘‘ سرفراز صاحب کا لہجہ ہنوز کٹھور تھا۔

’’تم جاؤ...... باورچی خانے میں۔‘‘ دادی نے بیٹے کی نظر بچا کر بوا سے کہا جو نیچی نظریں کیے سراسیمہ سی کھڑی تھیں۔

ڈاکٹر آ کر دوا دے کر...... تسلی بھی دے گیا تھا...... مگر سرفراز صاحب بیٹی کے کمرے میں یوں گھوم رہے تھے جیسے وہ کسی اسپتال کے آئی سی یو میں ہو۔

☆☆☆

جس کے بارے میں وہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا، اپنے آپ کو خود...... سمجھا رہا تھا کہ یہ غلط بات ہے راہ چلتی کسی لڑکی کے بارے میں اتنا نہیں سوچنا چاہیے اور اسے وہ پھر نظر آ گئی کہ اس کے سارے ارادے ریت کی طرح بکھر گئے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ سڑک تیزی سے پار...... کر رہی تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگا کر گاڑی روکی۔

’’نظر نہیں آتا کیا؟‘‘ ڈرائیور شیشے سے منہ نکال کر چلا رہا تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر اخبار کی ورق

گردانی کرتے ریحان نے دیکھا...... یہ تو وہی لڑکی تھی جس نے اسے پریشان سا کر رکھا تھا۔

''نظر تو تمہیں نہیں آتا...... جو زیبرا کراسنگ پر جہاز کی طرح گاڑی اڑاتے جا رہے ہو۔'' وہ ڈرائیور سے قدرے بلند آواز میں مگر تلخ لہجے میں بولی۔

''گلاب خان...... غلطی تمہاری ہے......''

ریحان نے ڈرائیور سے کہا۔ نہاں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ اگر برا نہ مانیں تو ہم آپ کو گھر تک چھوڑ دیں۔'' ریحان نے اس کی ماں سے مخاطب ہو کر کہا مگر نظریں اسی پر تھیں۔

''جی نہیں...... ہمیں، کسی کی گاڑی میں بیٹھنے کا شوق نہیں ہے۔'' لہجے میں بیزاری تھی۔ ''چلیں امی......'' وہ سڑک کراس کرتے ہوئے آگے نکل گئیں اور ریحان اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

نہ ان کے قہقہے رک رہے تھے...... اور نہ ہی ان کی باتیں...... دادی جان، وحید صاحب کی بیگم اور ان کی بیٹیوں کے مسلسل گُن گا رہی تھیں۔

''بہت اچھی خاتون ہیں، سیدھی سادی سی اور محبت کرنے والی۔ مجھے اپنی پوتی کے لیے ایسا ہی سسرال چاہیے، ان کا بیٹا بھی اچھا ہے...... اس کی اپنی الگ فیکٹری بھی ہے میری پیسے والی پوتی کو پیسوں والوں کے ہاں ہی جانا چاہیے۔''

''مگر مجھے مسز وحید بالکل پسند نہیں آئیں...... ذرا بھی متاثر کُن پرسنالٹی نہیں ہے ان کی۔'' بینا نے کہا۔

''اے ہے کیا خرابی نظر آئی تمہیں ان میں ایسی شاندار تو ساڑی پہن کر آئی تھیں وہ اور جو لاکٹ کا سیٹ انہوں نے پہن رکھا تھا وہ ڈائمنڈ کا تھا......'' ماما نے مسکرا کر بیٹی سے کہا۔

''شکل سے وہ فلکوں کے خاندان کی لگ رہی تھیں۔''

''پاگل ہو گئی ہو کیا، بہت پیسے والا خاندان ہے، ہر بڑے شہر میں ان کا بزنس پھیلا ہوا ہے۔ پوتڑوں کی رئیس فیملی ہے وہ۔'' ماما نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہو گی، مجھے اس سے کیا...... مگر ان کی شکل تو ایسی تھی جیسے ہمارے گھر آنے میں وہ چار بسیں تبدیل کر کے آئی تھیں۔''

''پاگل تو نہیں ہو گئی ہو...... نئے ماڈل کی گاڑی میں آئی تھیں...... ان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ بسوں کے پیچھے بھاگیں۔ وہ تو بتا رہی تھیں ان کا اپنا ہیلی کاپٹر بھی ہے۔''

''مگر مجھے ان کی پرسنالٹی بالکل نہیں بھائی۔ میں اپنی سہیلیوں سے متعارف کرانے سے پہلے ان کے اثاثوں کا گوشوارہ تو بانٹنے سے رہی۔'' بینا نے کندھے اچکا کر کہا۔

''تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے آخر؟'' دادی قریبی ٹیبل سے چشمہ آنکھوں پر جما کر گردن موڑ کر بولیں تو بینا کب کی جا چکی تھی اور سرفراز صاحب مسکرا کر کہہ رہے تھے۔

''یہی مطلب ہے اماں...... یہ رشتہ نامنظور ہے۔''

☆☆☆

''امی! قریبی گرلز کالج میں بی اے میں داخلہ لے لوں......'' نہاں نے ایک شام ماں سے کہا۔ رزلٹ بس آنے ہی والا تھا...... اور اس کی سب سہیلیاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن ٹیسٹ دینے میں مشغول ہو چکی تھیں۔

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں...... گورنمنٹ کالج کی فیس بھی کم ہو گی اور بس سیدھی کالج تک جاتی ہو گی۔ صبح تو ابو اپنی بائیک پر ہی چھوڑ دیا کریں گے...... صرف واپسی پر بس سے آنا ہو گا مگر پھر بھی تمہارے ابو سے پوچھنا تو ہو گا۔''

''امی...... ابو تو منع کر دیں گے......'' نہاں کے چہرے پر ملال کے سائے چھا گئے۔

''نہیں بیٹا وہ کیوں منع کریں گے؟''

''میٹرک کے بعد انٹر کرنے کی اجازت بھی تو انہوں نے خاصی مشکلوں سے دی تھی۔''

''ڈرتے ہیں وہ اور بس ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تعلیم حاصل کرنے سے بھلا کون ڈرا کرتا ہے جو ابو ڈرتے ہیں۔'' نہاں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''میری گڑیا...... وہ تمہاری خوب صورتی سے ڈرتے ہیں۔ ایسی پری جیسی ہماری بیٹی ہے، وہ نہیں چاہتے کہ کسی کی میلی یا گرم، نرم نظریں ہماری بیٹی کو چھوئیں۔''

''مگر میں تو عبایا اور حجاب لے کر گھر سے باہر نکلا کرتی ہوں۔''

''بیٹا...... چاند بدلیوں میں بھی چھپ جائے تو بھی وہ چاند ہی رہتا ہے...... اس پر بادل چھا جائیں مگر چاند...... چاند ہی نظر آتا ہے۔''

''ہر والدین کو اپنی اولاد...... چاند جیسی اور پری جیسی ہی لگتی ہے۔ آج کل کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ برقع والیوں کو کھوجتا پھرے...... سڑکوں پر نظارے عام ہیں۔'' نہاں نے برا سا منہ بنایا تو ماں اس کی خفگی کی وجہ جان کر سوچ میں پڑ گئیں۔

☆☆☆

''نہیں...... بالکل نہیں، جب میں منع کر چکا ہوں تو آپ بار بار یہ بات کیوں کر رہی ہیں۔''

ریاض صاحب کا لہجہ حتمی سا تھا۔

''نہاں کے ساتھ کی سب لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ پڑھنے دیجیے...... منع کیوں کر رہے ہیں...... آپ؟'' ماں نے پوچھا۔

''نسرین! آپ نہاں کی شادی کی فکر کیجیے اور بس...... لڑکیاں وقت پر اپنے گھر کی ہو جائیں تو ٹھیک رہتا ہے۔''

''خاندان میں تو سب کو پتا ہے کہ ہم چند دن کی یہ بچی ایدھی کے جھولے سے لے کر آئے تھے کتنی مشکلوں سے یہ بچی ہمیں ملی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں نا، کس قدر لکھا پڑھی ہوئی تھی اگر یہ گریجویشن کرے گی تو اچھا ہی رہے گا۔ لڑکیوں کی اتنی تعلیم تو ہر حالت میں ہونی چاہیے۔'' نسرین بیگم نے شوہر کی بات کے جواب میں کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ نہاں کی شادی جلدی ہو جانی چاہیے۔'' انہیں نہ جانے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ویسے بھی ہولنے اور ہولانے کی عادت تو ان کی سدا کی تھی۔

''ہمارا خاندان کتنا بڑا ہے اور ہر ایک کو خوب صورت بہو لانے کا ارمان بھی ہے مگر کسی نے بھی ہماری نہاں کے لیے نہیں کہا ہے حتیٰ کہ نہ میرے بہن بھائیوں نے اور نہ ہی تمہارے بہن بھائیوں نے ایسی کوئی بات کی۔''

''اس بچی کے اصل والدین کون تھے، آیا ان میں میاں بیوی کا رشتہ بھی تھا یا نہیں...... ایسے خدشات تو میری آپا ہمیشہ ظاہر کیا کرتی ہیں۔'' نسرین نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کی یہ آپا...... اس قسم کی باتیں دیگر لوگوں کے ساتھ بھی کیا کرتی ہیں...... جن لوگوں کو یہ

بات نہیں معلوم تھی اب ان کو بھی معلوم ہوگئی ہے کہ نہاں ہماری سگی اولاد نہیں ہے۔'' ریاض صاحب کا لہجہ شکایتی سا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ نہاں یہ سب نہیں جانتی اگر اس کو یہ سب پتا چل جاتا تو اس کا نازک سا دل ٹوٹ جاتا۔''

مگر نہاں کو بہت عرصے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کے والدین کے بارے میں کسی کو پتا نہیں تھا۔ ایدھی کے جھولے میں کون اسے راتوں رات ڈال گیا تھا یہ بات ادارے کے لوگ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس کی گلابی رنگت اور تیکھے نقوش کے باعث کوئی اسے کشمیری سمجھا کرتا اور کوئی افغانی...... مگر اس نے آنکھ کھول کر جنہیں دیکھا تھا انہیں ہی اپنا اصلی ماں باپ سمجھتی تھی۔ اس کے دل میں کبھی ایسی کوئی کسک نہیں ہوئی تھی جو وہ یہ کبھی سوچتی کہ اگر اس کے اصلی والدین ہوتے تو اس کے لیے یہ کرتے، وہ کرتے......

ریاض صاحب اور نسرین بیگم اپنی کم آمدنی کے باوجود نہاں کو اپنی ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھتے تھے اور اب بی اے میں داخلہ نہ دلوانے کی وجہ وہ پیسوں کی کمی سمجھ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیا کام کرے جس سے اس کی فیس، کتابوں کا خرچ بہ آسانی نکل آیا کرے۔ وہ سوچ کے نہ جانے کتنے تانے بانے بنتی کہ اس کی یہ پریشانی ان کی پڑوسن نے حل کر دی۔

ایک شام اسے اپنے گھر میں فارغ بیٹھے دیکھا تو اس سے کہا۔

''نہاں میرے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرو...... ان کے ماسٹر اتنی چھٹی کیا کرتے ہیں کہ ہم عاجز آچکے ہیں...... اسکول کی چھٹیوں سے زیادہ وہ چھٹیاں کرتے ہیں۔''

''آنٹی ...... میں آپ کے گھر تو نہیں آسکتی......'' اس نے فوراً ہی انکار کر دیا کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ریاض صاحب کو لڑکیوں کا محلے میں یوں گھومنا پھرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

''یہ میں نے کب کہا ہے کہ تم میرے گھر آؤ...... میں اپنی دونوں بیٹیوں کو روزانہ تمہارے گھر بھیج دوں گی، تم انہیں پڑھا دیا کرنا...... جتنے پیسے میں ماسٹر کو دیتی تھی تمہیں دے دیا کروں گی۔''

''ٹھیک ہے آنٹی......'' اس نے فوراً ہی رضامندی دے دی جس طرح دیوار پر ایک کوا آکر بیٹھے تو دوسرا کوا بھی اس کو دیکھ کر آجاتا ہے اور پھر تیسرا اور چوتھا بھی...... ٹیوشن پر جانے والے بچوں کا بھی احوال ہے، محلے کا کوئی بچہ یا بچی کہیں جا کر ٹیوشن پڑھنے لگے تو محلے کے دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کو وہیں بھیجنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ حرص کی بیماری متعدی ہے جو ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے۔ نہاں کے پاس صرف دو مہینے میں ٹیوشن کے چھ سات بچے ہو گئے تھے اور اب اسے یہ بالکل پریشانی نہیں تھی کہ کالج میں ایڈمیشن کا خرچ کیسے ہوگا۔

☆☆☆

اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان...... یہ سب تو وہ نہیں جانتا تھا اسے تو بس یہ معلوم تھا نہاں اسے نہ تو کسی شاپنگ پلازہ میں نظر آئی تھی اور نہ کسی اسٹاپ پر...... حد تو یہ تھی کہ وہ اسے شادی بیاہ کی تقریب میں بھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں جانے سے کترایا کرتا تھا...... نہاں کی تلاش میں...... وہ اب از خود پوچھنے لگا تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ساجدہ بیگم کو بیٹے کا یہ سبھاؤ اچھا لگا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار ہو

ہے۔ اکلوتے بیٹے کی ماں ہمہ وقت اپنے بیٹے کی جانب سے فکر مند رہتی ہے اور بیٹا اس کی نظروں کے سامنے رہے تو اسے طمانیت رہتی ہے۔ یہی حال ریحان کی ماں کا تھا...... انہیں کہیں بھی جانا ہوتا وہ ریحان کو اپنے ساتھ لے جاتیں...... اور ریحان خوشی خوشی ان کے ساتھ جاتا اور پھر مسز منیر کے ہاں ایک بڑی تقریب میں ان کی ملاقات دادی جان کے ساتھ آئی مینا سے بھی ہوگئی۔ جو اپنی دادی کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

''مینا بیٹا تم لڑکیوں میں جا کر بیٹھو...... ان کے ساتھ ہنسو، گاؤ......'' دادی اس سے بار بار کہہ رہی تھیں۔ یہ ایک مہندی کی تقریب تھی جس میں ہر لڑکی ضرورت سے زیادہ سج سنور کر اٹھلاتی پھر رہی تھی مگر مینا...... مسکرا کر نفی میں گردن ہلاتی دادی کے پہلو سے ہی جڑی بیٹھی تھی۔ پھر انہوں نے مینا کو بغور دیکھا...... تو وہ انہیں سمپل سی لڑکی بہت اچھی لگی۔ ساجدہ بیگم نے مینا سے کرید کر باتیں کرنا شروع کیں تو دادی جان اسی لمحے سمجھ گئیں کہ وہ یقیناً اپنی بہو ڈھونڈ رہی ہیں۔ تب انہوں نے ان سے کچھ پوچھے بنا ہی اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی، جو انہوں نے خوشی خوشی قبول کرلی مگر مینا یونہی بور سی بیٹھی رہی...... اسے کسی کے آنے، جانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ دادی کے ساتھ آکر پچھتا رہی تھی کہ ایسی تقریب جس میں وہ کسی کو جانتی تک نہیں ہے، کیوں چلی آئی۔

☆☆☆

آج یونیورسٹی کے اس گروپ میں کار ریس کا مقابلہ تھا...... وقت صبح سات بجے کا تھا...... سڑکوں پر رش نہ ہو اور دن اتوار کا رکھا گیا تھا...... کہ جاب پر جانے والے بھی چھٹی ہونے کے باعث سڑکوں پر آنے کے بجائے اپنے اپنے گھروں پر ہی آرام کریں۔ سی ویو جانے والی سڑک کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مینا اپنی نئی اسپورٹس کار میں تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ وہ یہ ریس ضرور جیت جائے گی مگر بغلی سڑک سے آنے والی ایک کار نے اس کے آگے آکر اس کے تمام عزائم ملیا میٹ کردیے تھے...... حد تو یہ کہ سگنل پر ریڈ لائٹ دیکھ کر رک بھی گئی تھی اس کے پیچھے آنے والی کاریں سگنل توڑتی ہوئی آگے نکل گئیں...... تب وہ غصے سے باہر نکل کر آئی اور اپنی شکست کا سبب بننے والی کار کے پاس آکر بولی۔

''جب سڑک خالی ہو تو پھر سگنل پر رکنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟'' اس کے لہجے میں برہمی رچی ہوئی تھی، ریحان نے شیشے سے منہ باہر نکال کر کہا۔

''قانون تو قانون ہوتا ہے...... جب ہم رش کے اوقات میں سگنل کے رولز فالو کرتے ہیں تو دیگر اوقات میں بھی کرنے چاہئیں۔''

''مگر آپ کی وجہ سے میں یہ کار ریس ہار گئی ہوں، کچھ اندازہ بھی ہے آپ کو۔'' مارے غصے کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''سوری مس، آئی ایم رئیلی سوری...... میں تو اپنے بیمار دوست کو دیکھنے نکلا تھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔'' ریحان، سر جھکائے نادم سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مینا نے سر اٹھا کر ریحان کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی، چھ فٹ سے نکلتا قد، مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ، خواب آلود سی آواز...... اس کے پسندیدہ کلر کے لباس میں...... وہ اسے شہزادوں جیسی آن بان والا لگا۔

''کوئی بات نہیں...... اس میں آپ کی تھوڑی ناں کوئی غلطی ہے۔'' مینا کھسیا کر بولی۔

''پھر تو آپ ہی کی غلطی ہوئی...... آپ کو چاہیے تھا میری گاڑی کو ٹکر مارتے ہوئے نکل جاتیں جیسے جلد باز لوگ...... عموماً سڑکوں پر مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔'' ریحان کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی یا تمسخر کی آمیزش...... اس کا تو مینا کو نہیں پتا تھا۔ بس اسے ریحان کا مسکرانا اچھا لگا تھا۔

''اگر آپ کو مجھ پر کوئی جرمانہ عائد نہ کرنا ہو تو مجھے بتا دیں...... تاکہ میں جاسکوں۔''

''جرمانہ تو عائد ہوگا آپ پر۔'' مینا مسکرائی۔

''کیسا جرمانہ......؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''ایک گرما گرم چائے تو آپ کو پلانی پڑے گی...... کیونکہ میں اب یہاں سے واپس اپنے گھر لوٹنا چاہتی ہوں۔ اپنے فرینڈز کے گروپ میں جاؤں گی تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔''

''یہ سودا مہنگا نہیں رہا...... آئیں...... چلیں۔'' ریحان اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے فالو کرنے کا اشارہ کرکے بولا اور مینا نے مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی ریحان کی گاڑی کے پیچھے لگادی۔

☆☆☆

''ریحان، ریحان، ریحان...... میرے تو کان پک گئے ہیں یہ نام سنتے ہوئے۔ سڑکوں پر گھومنے والے لوگوں سے بھی کوئی بھلا متاثر ہوا جاتا ہے، جو تم ہوگئیں۔'' مینا کی اوائی توائی سن کر ماما اسے ڈانٹ پلا رہی تھیں۔

''اس کی ہائٹ چھ فٹ دو انچ ہوگی۔ اسے بھی میری طرح بلیو بلیک اور براؤن کلرز پسند ہیں، موسم سردی کا، دن میں چائے اور رات میں کافی پیتا ہے، اس کی گاڑی کا ماڈل بھی میرا فیورٹ ہے تو پھر وہ مجھے کیوں نہیں اچھا لگے گا۔''

''بے شمار لوگوں کی یہی پسند ہوگی...... تو کیا ہم ان سب کو اپنے گھر پر انوائٹ کرسکتے ہیں۔'' ماما کو بے تکی باتیں سن کر ہمیشہ ہی غصہ آیا کرتا تھا۔

''خوب صورت لڑکیوں کے پیچھے...... غنڈے اسی طرح لگا کرتے ہیں۔'' دادی جان بھی دور کی کوڑی لائی تھیں۔

''وہ میرے پیچھے نہیں لگا تھا بلکہ میری گاڑی اس کی گاڑی کے پیچھے تھی۔'' مینا بھی بڑے اطمینان سے وضاحتیں دے رہی تھی۔

''تمہارا باپ اس شہر کا ایک بہت بڑا صنعت کار ہے، تمہارے دونوں بھائی بھی گمنام نہیں ہیں، ان کے نام سن کر سب کو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ کون ہیں اور ان کا کیا خاندان ہے......؟ اب اگر تم سڑک پر گھومنے والے لونڈے لپاڑوں کو اپنے گھر مدعو کرو گی تو ہماری عزت کیا رہ جائے گی۔ سرفراز احمد کو جو آج سب نظریں اٹھا کر تکریم سے دیکھا کرتے ہیں کل کو کیا وہ سب ہنس نہیں سکتے......'' دادی جان نے اسے پاس بٹھا کر رسان سے سمجھایا۔

''دادی جان، میں آپ ہی کی پوتی ہوں، میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں ہیں۔ لوگوں کو پہچاننے کا سلیقہ رکھتی ہوں، چائے پینے ہم جس ہوٹل میں گئے تو وہ میرے ساتھ گھس کر نہیں بیٹھا، وہ میرے مقابل بیٹھا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ نہ تو وہ چھچھورا ہے اور نہ ہی بیہودہ......'' نہاں کے لہجے میں تو فکی مزین تھی۔

''ارے میری بچی...... تیری عمر کہاں سے اتنی آگئی جو لوگوں کو پہچاننے گی آج کل عام لوگ بھی اتنے بڑے اداکار ہیں کہ انہوں نے اپنی اصلی شکل چھپائی ہوئی ہوتی ہے اب تو لوئر مڈل کلاس کے لوگوں کے ڈرائنگ روم بھی ان کی اوقات سے زیادہ سجے ہوتے ہیں۔ ان میں داخل ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے جدی پشتی رئیس ہوں، دوسرے کمرے میں بے شک

پھٹا ہوا لحاف اوڑھ کر سو رہے ہوں مگر ڈرائنگ روم امیرانہ لک دیتا ہے۔ اب لوگوں کو پہچاننا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔'' دادی جان نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مگر میں ریحان کو پہچان گئی ہوں، بہت نائس لڑکا ہے وہ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، گورنمنٹ کے آفس میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز......'' مینا کی آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے۔

''اچھی شکل کیا جاہلوں کی نہیں ہوا کرتی...... میری بچی اب تو جاہل لوگوں کے چہروں سے جہالت تک نہیں ٹپکتی بلکہ اب تو جنہیں ہم عالم سمجھتے ہیں وہ جاہل نکل آتے ہیں اور تمہیں کیسے پتا چل گیا وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے اور اچھی پوسٹ پر فائز بھی......''

''یہ رہا اس کا کارڈ...... ریحان ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آپریشن مینجر ہے اور اس نے مارکیٹنگ میں ایم بی اے کیا ہے۔'' مینا فخریہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''کیا ہوگا...... اب غریب غربا بھی اپنے بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ تعلیم کی اہمیت سب کو معلوم ہوگئی ہے اور کسی کے پڑھ جانے سے اس کے گھرانے کے ماتھے پر اچھی فیملی کا کوئی ایوارڈ نہیں مل جایا کرتا اب تو سب بھی تعلیم کی ڈگریوں سے مالا مال ہوتے ہیں مگر تعلیم ان کا بال بیکا تک نہیں سنوار پاتی۔'' دادی کی تقریر جاری تھی اور مینا ان کی باتوں سے بور ہو کر اپنے کمرے میں جانے کا سوچ رہی تھی' دادی نے پلٹ کر مینا کو دیکھنا چاہا کہ ان کی باتوں کا اس پر کتنا اثر ہوا ہے تو وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

''یہ ساری غلطی بہو بیگم کی ہے۔ بیٹی کو اچھی بری بات سمجھاتی ہی نہیں ہیں۔ ماؤں کو تو بیٹی کا دوست بن کر رہنا چاہیے مگر یہاں نہ ماں کو فرصت ہے اور نہ ہی بیٹی کو ضرورت......'' اب دادی...... بڑبڑا رہی تھیں۔

☆☆☆

''توجہ فرمائیں بیوٹی فل گائز...... یونیورسٹی سے واپسی پر ہوٹل میں لنچ کرنا ہے اسی ہوٹل میں جہاں کا تھائی سوپ اے ون تھا۔ وہاں سے فیشن شو کی تقریب میں جانا ہے اور پھر شاپنگ......'' فری پیریڈ میں کیفے میں بیٹھے ہوئے شہزاد نے پروگرام بنایا۔

''ٹھیک ہے، آج موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔ صبح سے ہلکی ہلکی رم جھم ہو رہی ہے۔'' شہلا نے اسے فوراً ہی او کے کر دیا۔

''ٹی شرٹس ختم ہو رہی ہیں، مجھے فوری طور پر دس سے پندرہ شرٹس لینی ہیں۔'' حماد نے کہا۔

''اور مجھے اچھے قسم کے ٹاپ...... اور مینا کی پسند کے لینے ہیں کہ مینا کے ٹاپ تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور اس کے تو کبھی ختم ہی ہونے میں نہیں آتے۔'' زویا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''مگر میں تو گھر جا رہی ہوں۔'' مینا کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

''تو کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟'' شہزاد نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''گھر میں کوئی ضروری کام ہے کیا......؟'' زویا نے پوچھا۔

''ہاں......'' مینا نے جیسے اقرار کر لیا۔

''تو ٹھیک ہے آج کے بنائے ہوئے اس پروگرام پر کل عمل ہوگا...... ہمارا گروپ کل موج مستی کرے گا۔'' شہزاد نے مسکرا کر کہا اور گروپ کے تمام

لوگوں نے تالیاں بجا کر تائید کی۔ مینا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''اب تو تم خوش ہو ناں......؟'' زویا نے اس کا چہرہ اونچا کر کے ہولے سے کہا۔

''پتا نہیں'' وہ اکتائے لہجے میں بولی اور کسی کو خدا حافظ کہے بغیر پارکنگ لاٹ کی جانب چل دی۔ اس وقت اس کا یونیورسٹی میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فوراً اپنے گھر پہنچ جائے اور وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر جا رہی تھی اور اس کے گروپ کے ساتھی ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے کہ آج مینا کو ہوا کیا ہے......؟

☆☆☆

''بات کیا ہے چندا......؟'' تم اتنی پریشان سی کیوں ہو......؟'' نہاں کو مستقل کسی سوچ میں غرق دیکھ کر ماں نے دلار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پاس دس ہزار جمع ہوئے ہیں، کیا ان پیسوں میں اچھی کوالٹی والا روم کولر آ جائے گا یا ابھی اور پیسے جمع کرنے ہوں گے۔''

''روم کولر لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تمہیں، تمہارا کمرا تو سب سے زیادہ ہوادار ہے؟'' ماں نے پیار سے سمجھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں روم کولر اپنے لیے تھوڑی ناں لینا چاہ رہی ہوں۔''

تو پھر کس کے لیے لینا ہے؟'' اب وہ حیرت سے نہاں کو دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کے اور ابو جی کے لیے...... آپ کے کمرے میں نہ ہوا آتی ہے اور نہ ہی کمرا ٹھنڈا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو اور ابو کو گرمی بہت زیادہ لگتی ہے...... دن میں کتنی بار تو آپ نہاتی ہیں، رات میں بستر پر پانی علیحدہ چھڑکا کرتی ہیں۔''

''تمہیں ہمارا خیال آیا تو اپنا خیال کیوں نہیں آیا۔'' ماں نے بیٹی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی مجھے تو گرمی لگتی ہی نہیں ہے...... جون جولائی میں بھی...... میں تو کھیس اوڑھ کر سونے کی عادی ہوں اور دوسری بات کہ گھر کا سب سے ہوادار اور ٹھنڈا کمرا آپ نے مجھے دے رکھا ہے۔''

''نہیں میری بیٹی، ہمیں روم کولر کی بالکل ضرورت نہیں ہے ان پیسوں سے تم اپنے لیے کپڑے بنالو...... کالج میں تقریبات کسی نہ کسی حوالے سے ہوتی رہتی ہیں اور میں یہ چاہوں گی کہ میری نہاں کے پاس خوب اچھے اچھے کپڑے ہوں۔''

''بہت کپڑے ہیں میرے پاس مگر میں تو کولر لینا چاہتی ہوں۔'' نہاں کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''اس سال کی گرمی تو بس ختم ہوگئی...... اب تو ٹھنڈ شروع ہو چکی ہے...... کولر خرید لیں گے تو خوامخواہ رکھے رکھے ہی خراب ہو جائے گا۔ اس لیے ہم کولر کے بجائے تمہارے لیے کپڑے خریدیں گے......'' ماں نے اس کی روشن پیشانی چوم کر کہا تو نہاں کی آنکھوں میں جہاں آنسو آ گئے وہاں ماں کی آنکھیں بھی برسنے کو بے تاب ہوگئیں۔

☆☆☆

''نہیں ماما، میں نہیں جاؤں گی۔'' مینا نے تیسری مرتبہ انکار کیا۔ وحید انکل کی تقاریب میں ہمیشہ بور ہوا کرتی ہوں۔'' مینا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''بیٹا...... جب کوئی محبت سے بلائے تو کبھی

انکار نہیں کرنا چاہیے۔''

''مجھے غزلوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو میں کیوں جا کر اپنے سر میں درد کروں؟'' مینا نے ابرو چڑھا کر کہا۔

''اچھا...... تم تھوڑی سی دیر بیٹھ کر بھیا کے ساتھ واپس آجانا۔''

''منی بیگم کی غزلیں مجھے بہت پسند ہیں...... میں تو پورا پروگرام ڈٹ کر سنوں گا۔'' دانش نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''ماما...... میں پھر نہیں جارہی...... آپ سب لوگ جائیں اور شوق سے سنیں، ایسے پروگرام...... میں تو پاپ میوزک کے سوا سر میں درد کرنے والے پروگرام گھر میں ٹی وی پر بھی نہیں دیکھوں۔''

''ارے مجھ سے کہاں زیادہ بیٹھا جاتا ہے میں تو بس آدھے گھنٹے میں ہی اٹھ جاؤں گی...... تم میرے ساتھ ہی آجانا......'' دادی جان نے مینا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ تب وہ بے دلی سے تیار ہونے لگی کہ دادی کو خفا کرنے کا اب وہ رسک نہیں لے سکتی تھی اور ماما کو اس کے آف موڈ کو دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔

☆☆☆

مسز وحید کے وسیع و عریض لان میں فرشی نشست کا اہتمام تھا...... گلوکاروں کے لیے بنائے گئے اسٹیج پر روشنی کا زبردست اہتمام تھا اور فرش پر جگہ جگہ کینڈل لائٹ ایک خوابناک سا منظر پیش کررہی تھی...... کوری مٹی کی صراحیاں...... موتیے کی بیلوں سے لپٹی ہوئی جگہ جگہ رکھی تھیں...... جس میں بادام کا شربت رکھا گیا تھا۔

غزل سننے والے ہر غزل پر اپنا سر دُھن رہے تھے مستعد بیرے وقفے وقفے سے چائے اور کافی کے ساتھ بادام کا ٹھنڈا شربت بھی سرو کررہے تھے...... چاندنی رات تھی اور مسحور کُن ماحول اچھا لگ رہا تھا مگر مینا...... کو شدید بوریت ہورہی تھی...... گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے دادی جان اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ انہیں ہر غزل پہلے والی سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

''پلیز دادی چلیں ناں......'' مینا ان کے پاس منمنائی۔

''چندا...... بس ایک غزل اور......'' مزید دو غزلیں سننے کے بعد بھی جب انہوں نے ایک غزل اور...... کے لیے کہا تو مینا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ صبح تک بیٹھیں...... اور ہر گلوکار کی غزل سنیں......'' وہ تنک کر بولی۔

''تم بھی سنو نا......!'' دادی کا لہجہ لجاجت آمیز تھا۔

''نہیں، میں گھر جارہی ہوں۔''

''کیسے جاؤ گی؟'' وہ روہانسی ہوگئیں۔

''باہر ڈرائیور ہے۔''

''اچھا چلو، میں چلتی ہوں۔'' دادی بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

''نہیں، آپ بیٹھیں میں چلی جاؤں گی آپ کے تو اٹھنے میں بھی دو گھنٹے لگتے ہیں۔''

''افوہ...... چل تو رہی ہوں ناں......'' وہ اپنا بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ روانہ ہوگئیں اور جب لمبی راہداری طے کرتے ہوئے وہ گیٹ تک پہنچی تو ریحان اپنی ماں کے ساتھ اندر داخل ہورہا تھا۔

''ارے آپ......؟'' وہ ریحان کو دیکھ کر کھل ہی تو گئی۔ ساجدہ بیگم نے جب دادی کو دیکھا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ سی آگئی۔

''ہم تو آپ کے گھر آنے کا سوچ رہے تھے...... چلیں، آج آپ سے یہاں ہی ملاقات ہوگئی۔''

''کاش آپ جلدی آتیں تو خوب گپ شپ ہوتی۔'' دادی جان نے مینا کو دیکھ کر کہا۔

''تو کیا آپ واپس جارہی ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں آنٹی...... دادی جان کی فرشی نشست کی وجہ سے ٹانگیں شل ہوگئیں تھیں نا...... اسی لیے میں انہیں ٹہلانے کے لیے نکلی تھی۔'' مینا مسکرائی۔

''یہاں بیٹھنے کا انتظام صوفوں کا بھی ہے جو لوگ نیچے نہیں بیٹھ سکتے وہ سائڈ پر لگے ہوئے صوفوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' ریحان نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں دادی، ہم لوگ صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔'' مینا نے دادی سے کہا۔

''تو کیا گھر نہیں چلنا...... تم تو یہاں بور ہورہی تھیں؟'' ان کا جملہ...... منہ میں ہی دبا رہا۔ وہ حیرت سے مینا کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کے چہرے کی بوریت، اکتاہٹ دور ہوچکی تھی۔

''ارے دادی...... اتنے مایہ ناز گلوکار یہاں موجود ہیں، ایسی محفل کو چھوڑ کر جانا کہاں اچھا لگے گا اور جو بات غزلیں سننے کی ہوتی ہے، وہ پاپ میوزک میں تھوڑی ناں ہوتی ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' ریحان نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''میری کوئی بات بھی غلط نہیں ہوتی۔ ہمیشہ صحیح بات کرتی ہوں۔'' مینا نے مسکرا کر مگر باوثوق لہجے میں کہا۔ تب ریحان نے چونک کر اسے دیکھا اور ساجدہ بیگم جو آگے کی جانب قدم بڑھا چکی تھیں پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔ جو اپنی دادی کے ساتھ کھڑی نیچی نظریں کیے مسکرا رہی تھی۔

''کتنی پیاری لڑکی ہے یہ۔'' بے اختیار انہوں نے سوچا اور اب وہ اس کے برابر کھڑی اسے پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

بعض دفعہ وہ اپنی ہی دُھن میں ایسی مست ہوا کرتی تھی کہ اردگرد آس پاس کا کچھ پتا ہی نہیں چلا

انٹرنیٹ

میری تمام بہنوں سے اپیل ہے جتنا ہوسکتا ہے اپنے بچوں کو انٹرنیٹ جیسے موذی مرض سے دور رکھیں کیونکہ انٹرنیٹ کا زیادہ استعمال بچوں کے لیے جسمانی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر بہت زیادہ نقصان کا باعث بن رہا ہے۔

(1) انٹرنیٹ کے استعمال سے آنکھوں پر منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ چھوٹی عمر میں عینک کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

(2) انٹرنیٹ پر ایسی ویب سائٹس بھی ہیں جو بچوں کی اخلاقی تباہی کا باعث بن رہی ہیں۔ جہاں پر ایسی فحش تصاویر اور وڈیوز ہیں جو بچوں کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔

(3) انٹرنیٹ کا بے جا استعمال بچوں کے تعلیمی گراف پر بری طرح اثر انداز ہورہا ہے۔

(4) انٹرنیٹ کے استعمال سے بچے والدین، بہن، بھائیوں یہاں تک کہ مذہب سے بھی دور ہوگئے ہیں۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

کرتا...... آج کالج میں ہونے والے پہلے ماہانہ ٹیسٹ میں اس کے سب سے زیادہ نمبر آئے تھے۔ امی اور ابو اس کی رپورٹ کارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کی یہ خوشی اسے از خود سرشار کیے دے رہی تھی کہ کالج سے واپسی پر ابو کی پسند کی بالوشاہی اور امی کی پسند کے بیسن کے لڈو...... اس نے خرید لیے تھے۔

''ابو کہیں گے...... نہاں کی کامیابی کے لیے تو مٹھائی منگوانی چاہیے تب امی بولیں گی منگواؤ گے کس سے، جاؤ خود جا کر لے کر آؤ...... تب ابو اپنی بائک نکالیں گے اور کہیں گے ارے...... یہ تو پنکچر کھڑی ہے اور پھر بیگ سے مٹھائی نکال کر میں کہوں گی یہ لیجیے مٹھائی کھائیں...... آپ کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔'' نہاں اپنی دھن میں مست...... کب فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر چلنا شروع ہو گئی تھی اسے پتا ہی نہیں چلا تھا اور جب ایک زبردست بریک کے ساتھ اس کے سامنے گاڑی کے بریک چیخے اور ڈرائیور نے چیختے ہوئے کہا۔

''یہ سڑک اپنی سمجھ لی ہے کیا جو آنکھیں بند کر کے بیچ سڑک پر ٹہل رہی ہیں اگر کچھ ہو جاتا تو...... لوگ تو گاڑی والے پر ہی چڑھائی کرتے ہیں نا'' اور نہاں...... آنکھیں پھاڑے گاڑی کو یوں دیکھ رہی تھی کہ وہ کیسے اور کس طرح اس کے سامنے آ گئی ہے۔ ریحان پچھلی سیٹ سے نیچے اتر آیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا آج بھی امتحان تھا آپ کا؟'' اس نے حواس باختہ سی نہاں کو دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں نہیں تو......'' وہ گھبرا کر بولی۔

''ارے واہ...... لوگوں کی زندگی میں ہر روز امتحان ہوا کرتے ہیں۔'' ڈرائیور بدتمیزی سے ہنس کر بولا۔

''نہیں، نہیں آج تو کالج میں پہلا رزلٹ تھا...... ٹیسٹ کا......'' نہ جانے کیسے یہ سچ اس کے لبوں پر آ گیا اور وہ خود ہی شرمندہ سی بھی ہو گئی۔

''ظاہر ہے...... پاس ہونے کی خوشی میں۔'' کچھ پتا ہی نہیں چلتا......'' ریحان کے لبوں پر پھول سے کھل گئے۔

''جی۔'' وہ ہاتھ سے گری فائل نیچے سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

''بی بی...... تو ایسی خوش تھیں جیسے ٹاپ کر لیا ہو۔'' ڈرائیور...... اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ہنسا۔ اس کے لہجے میں تمسخر اور طنز کی کاٹ تھی۔

''ہاں کیا ہے ٹاپ...... اور سارے سیکشنز میں ٹاپ کیا ہے۔'' نہاں زچ ہو کر بولی اور تیزی سے فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے لوگوں کے غول میں کھو سی گئی۔ ریحان...... کی نظریں کتنی ہی دیر تک اسے ڈھونڈتی رہیں۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں کے جب ہارن نے ایک شور سا مچایا تو وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور چند ساعتوں کا یہ منظر...... اس کی آنکھوں میں ایک دنیا سا بسا گیا۔ نہ جانے کیوں...... اس معصوم سی لڑکی کا پورا وجود اس کے دل پر دستک سی دیتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ کواڑ کھولو...... ہم اندر آنا چاہتے ہیں اور اس نے...... درِ دل وا بھی کر دیا تھا مگر...... وہ تو جب بھی نظر آئی واپس پلٹ کر چلی جاتی تھی۔ کوئی بھلا اس طرح بھی کیا کرتا ہے کہ دستک بھی دے اور جب دروازہ کھلے تو واپس لوٹ جائے...... ریحان سوچ رہا تھا اور چند لمحوں بعد وہ اس سوچ پر مسکرا رہا تھا...... جیسے اسے کوئی کارنامہ دکھانا ہو۔

(باقی آئندہ ماہ)



یہ زندگی ہے

عاشفہ مسعود

یوں تو کافی عرصے سے مجھے گھٹنوں کے درد کا عارضہ لاحق ہے اور برسات کے موسم میں تو یہ بیماری کچھ زیادہ ہی تنگ کرتی ہے۔ آج صبح سے یہ درد کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا، میں نے اپنی بیشتر تسبیحات جو روزانہ میں عشا کی نماز کے بعد پڑھتی تھی آج عصر اور مغرب کے ساتھ ہی نمٹا لیں تاکہ تھوڑی دیر لیٹ کر ٹانگوں کو کچھ آرام ہی دے لوں۔

دراصل آج ہفتہ ہے اور بچے کافی دنوں سے

باہر جانے کا کہہ رہے تھے۔ میرا بیٹا عبداللہ صبح جاتے ہوئے انہیں یہ خوش خبری سنا گیا تھا تیار رہنا رات کا کھانا باہر کھائیں گے مگر میرے گھٹنوں کا درد مجھے چین نہیں لینے دے رہا۔ اوپر سے کسی ٹھنڈے یخ ہوٹل میں دو گھنٹے تک ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنا مجھے عذاب دکھائی دے رہا تھا لیکن میں انکار کرکے بچوں کی خوشی میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی۔ میرا یہ مسئلہ تو تقریباً سارا سال ہی رہتا ہے اور بچے ہفتے میں ایک دو مرتبہ ضرور باہر جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں انکار کیوں نہیں کردیتی۔

"آپ جاؤ میں گھر میں آرام کروں گی۔" یہ کہنا اتنا معیوب تو نہیں مگر اس ایک نہ کو نہ کرنے کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔

میں آج سے تقریباً چالیس سال پہلے قصور جیسے چھوٹے شہر سے بیاہ کر لاہور آئی۔ چھوٹا سا خاندان جو ماں بیٹے پر مشتمل تھا اس میں شامل ہونے والی میں تیسری فرد تھی۔ ان دنوں پنجاب کے چھوٹے شہروں میں خواتین کا بے مقصد باہر جانا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

جبکہ لاہور تو ہمیشہ سے ہی لاہور ہے اور پھر نئی نئی شادی۔ ہر کوئی گھومنا پھرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے نہ تو لاہور دیکھا تھا نہ ہی فلم وغیرہ۔ ان کے پاس اپنی سائیکل تھی۔ میرا تو ہر روز دل چاہتا ہم باہر جائیں، گھومیں پھریں۔ ان دنوں نہ تو اتنی مہنگائی تھی اور نہ ہی باہر جاکر کسی بڑے ہوٹل میں کچھ کھانے کی خواہش۔ بس تھوڑی سی سیر اور قلفی چاٹ بوتل یا پھر صرف میٹھا پان یہی بہت بڑی تفریح تھی۔

میری ساس مرحومہ بہت نیک اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ جب سے میری وجہ سے گھر کے کام کاج سے فراغت ملی۔ صبح ناشتے کے بعد محلے میں یا ملنے جلنے والوں کے ہاں نکل پڑتیں اور شام کو جب ہم باہر جانے کا پروگرام بناتے وہ تھکی ہوئی ہوتیں۔ ایک آدھ مرتبہ کے بعد وہ گھر میں رہنے کو ترجیح دیتیں۔

"تم لوگ جاؤ میں جاکر کیا کروں گی۔" وغیرہ وغیرہ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اب کیا کریں۔ اماں کو اکیلا گھر چھوڑیں یا پھر کبھی چلے جائیں۔

ایک دو مرتبہ جب کبھی باہر گئے ظاہر ہے واپسی پر دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے محلے کی کوئی ماسی، چاچی، اماں کے پاس ہوتی اور ہمیں گھر میں اماں کو اکیلا چھوڑنے پر باتیں سننا پڑتیں۔ یوں رفتہ رفتہ ہمارا باہر جانا ختم ہوتا گیا۔ میں نے اسی وقت یہ سوچ لیا کہ جب میں ساس بنی اپنی بہو کی خوشی میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔

عبداللہ میرا ابھی اکلوتا بیٹا ہے۔ اب خیر سے خود بچوں والا ہے مگر میں ہمیشہ ان کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ ایک اور سبق بھی میں نے اپنی ساس سے سیکھا وہ یہ تھا۔ اماں جی ہمیشہ سے سادگی پسند تھیں۔ شاید نوجوانی کی بیوگی کی وجہ سے پرانی ہندوانہ سوچ کی مالک تھیں۔ کبھی اچھی طرح تیار نہ ہوئیں۔ اگر کبھی صاف کپڑے پہن لیے تو دوپٹا پرانا نئے کپڑے پہنے تو دوپٹا دوسرے رنگ کا۔

شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی اللہ نے کاروبار میں خوب ترقی دی۔ پرانا محلہ چھوڑ کر اچھے علاقے میں گھر بنالیا۔ اچھے لوگوں سے میل جول شروع ہوا۔ اماں جی البتہ اسی پرانے حلیے میں

رہیں۔ بیٹے کے بار بار کہنے پر نئے کپڑے نہ سلواتیں۔ پھر بیٹے نے کپڑے سلوا کر لانے شروع کیے مگر وہ ہمیشہ بکسوں کی زینت بنے۔ جب وفات پائی تو بہت سے کپڑے اسی طرح نئے کے نئے بکسوں میں پڑے تھے۔ جب کبھی آئے گئے پر ان کو کپڑے بدلنے کا کہا، وہ کہتیں۔

"ان کپڑوں کو کیا ہوا ہے۔ اچھے بھلے تو ہیں۔ لوگ مجھ سے ملیں گے یا میرے کپڑوں کو دیکھنے آرہے ہیں۔" ایک دو مرتبہ میں نے خود اپنی ہمسائیوں کو کہتے سنا۔

"نسیمہ خود تو ٹھیک ٹھاک رہتی ہے... مگر ساس کو کیسے رکھا ہوا ہے۔ کپڑے تک بنوا کر نہیں دیتی۔" اس لیے میں اب تک اپنے کپڑوں کا بہت خیال رکھتی ہوں تاکہ اپنے بچوں کے لیے شرمندگی کی وجہ نہ بنوں۔ آج بھی نیا شفون کا کڑھائی والا سوٹ نکال کر حمید کو استری کے لیے دیا۔ بہو کے کمرے کے پاس سے گزری۔ بہو فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

"ہاں ہاں جا رہی ہیں ہمارے ساتھ۔ ان کے بغیر بھلا ہم کہیں جاسکتے ہیں۔ ان کو تو اس عمر میں بھی چین نہیں۔ سارا دن درد سے ہائے ہائے کریں گی مگر باہر جانے کے لیے ہر وقت تیار۔ مجال ہے کبھی انکار کردیں۔ ان کے تو اس عمر میں بھی فیشن ختم نہیں ہوتے۔ میرے نئے شیفون کے سوٹ جیسا سوٹ پہن رہی ہیں صرف رنگ کا فرق ہے۔ بھلا ایسے میں نئے سوٹ کا کیا مزہ آئے گا میں نہیں پہن رہی آج۔ پہلے یہ پہن لیں۔" اس سے آگے سننے کی مجھ میں تاب نہیں رہی۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں آج میں جاؤں یا گھر میں آرام کروں۔

جدوں عشق رُس جاوے تے

سلمیٰ یونس

جنیاں تن میرے تے لگیاں
تینوں اِک لگے تے تو جانے
غلام فریدا دل اوتھے دیے
جتھے اگلا قدر وی جانے

''نجو، نی نجو، چل ھن اٹھ جا سورج وی نکل آیا اے!'' سکھاں حسبِ معمول نجمہ کی چارپائی کے قریب کھڑی اسے زور زور سے آواز دینے کے ساتھ ساتھ مسلسل ہاتھ سے اس کا شانہ بھی ہلا رہی تھیں مگر وہ اپنے نام کی ایک تھی مجال ہے جو ذرا ٹس سے مس بھی ہوتی ہو۔

''اٹھ جا میری رانی، میری لاڈو۔'' وہ پیار سے اس کی پیشانی پر بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولیں، وہ اکثر لاڈ سے اسے اسی طرح کے ناموں سے پکارتی تھیں۔

''کیا ماسی...... سویرے سویرے تو سر تے سوار ہو جاندی اے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''ہائے میرے ربا کیسی کڑی اے، ناں میں نے گل کی ہے کہ تلوار ماری اے۔'' وہ گال پر انگلی رکھ کر اپنی حیرت ظاہر کرتے بولیں۔

''ماسی! تیرے میرے تے اتے سان (احسان) نوں کہ تو یہ بھی کر کے دیکھ لے رب دی سو میں نے اِک لفظ نہیں بولنا۔'' وہ سعادت مندی سے بولی۔

''اچھا چل، زیادہ گلاں ناں کر ھن منجی چھڈ اور ذرا چا بنا دے، فجر دی اٹھی آں پر تیرے انتظار میں پُھپی بیٹھی آں۔'' سکھاں سامنے والی چارپائی پر ٹک گئیں۔

''قیوم دے نال ناشتا نہیں کیتا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تیرے بغیر کدی کچھ کھادا اے۔'' انہوں نے گویا یاد دلایا۔

''ماسی ایسی عادتاں نہ ڈال، میں مر مرا گئی تاں تے......'' اور اس سے قبل وہ اپنی بات مکمل کرتی سکھاں نے اسے ٹوک دیا۔

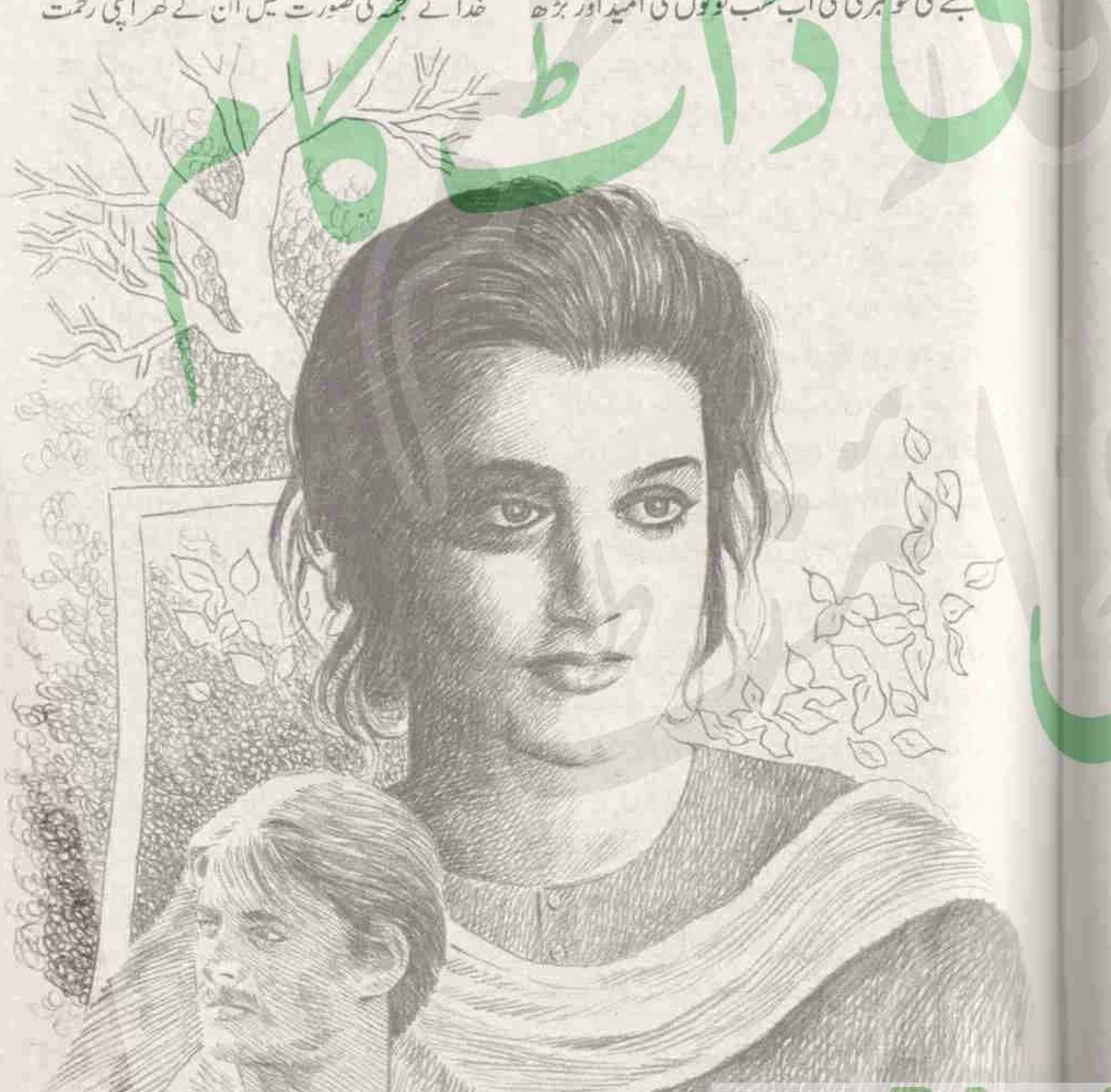
''چپ کر، خبردار جے اینده ایسی گل منہ سے نکالی، تیرے سے پہلے رب مجھے ناں اٹھالے۔'' ان کے لہجے میں محبت تھی۔

''ہائے ماسی میں تے مذاق کر رہی سی۔'' اس نے جلدی سے اپنی چارپائی سے اٹھ کر اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اینده میرے نال مذاق کیتا تے میں نے رُس جانا اے۔'' انہوں نے دھمکی دی نجمہ نے جلدی سے کان پکڑ لیے سکھاں بے اختیار ہنس دیں۔

نجو جس کا اصل نام نجمہ تھا ان کی سگی بہن ناصرہ کی اولاد تھی۔ ناصرہ کی شادی گاؤں کے ایک شریف کسان سے ہوئی تھی اس کے گھر میں آمدنی کم اور کھانے والے زیادہ تھے۔ ناصرہ کی سات نندوں اور ساس نے مل کر ناصرہ کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔ اکبر اس لیے کچھ نہیں بولتے تھے کہ انہیں جورو کا غلام ہونے کے طعنے ملتے تھے۔ ناصرہ ایک تو صابر تھیں اور دوسرے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہت کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ تین سال ہو چکے تھے اب تو اُن کی ساس نندیں ان پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں اکبر خاموش تھے ناصرہ اکثر آسمان کی جانب دیکھتیں انہیں خدا کی رحمت کا انتظار تھا مجبور و بے بس انسان کا پہلا اور آخری سہارا دعا اور انتظار ہوتا ہے اور ناصرہ بھی اسی سہارے جی رہی تھیں اور پھر خدا نے ان کی سن لی۔ انہیں ماں بننے کی خوشخبری ملی اب سب لوگوں کی امید اور بڑھ گئی پہلے سب کو صرف اولاد کی تمنا تھی اب سب کی پہلی خواہش بیٹا تھا۔ ناصرہ کی خوشی فکر میں بدلنے لگی انہیں ہر وقت یہی خوف رہتا کہ اگر وہ اس گھرانے کو بیٹا نہ دے سکیں تو جانے یہ لوگ ان کا کیا حشر کریں، ناصرہ کی ساس نے تو صاف کہہ دیا۔

''اگر بیٹی ہوئی تو میں اکبر کی شادی کرا دوں گی، زندگی کا کیا پتا ہم اکبر کا بیٹا دیکھنے کو زندہ رہیں گے یا نہیں۔'' اور پھر وہی ہوا جو اُن لوگوں کی خواہش نہ تھی خدا نے نجمہ کی صورت میں ان کے گھر اپنی رحمت



اتاری جو اُن لوگوں کی نظر میں فقط زحمت تھی، ساس، نندیں اٹھتے بیٹھتے بیٹی ہونے پر سو سو طعنے دیتی رہتیں۔ اکبر کی خاموشی نے ان کی روح تک کو زخمی کردیا ایسے وقت میں شوہر بیوی کا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے مگر اکبر کی خاموشی چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ وہ ان کے خوابوں کی تکمیل کرنے کے لائق نہیں، ناصرہ کی وجہ سے ان کی امید ٹوٹ گئی ہے ناصرہ اس غم میں گھلنے لگیں۔

نجمہ کی پیدائش کے بعد ناصرہ بے حد بیمار رہنے لگیں لیکن کسی کو پروا نہ تھی سکھاں ہی تھیں جنہیں ان کی فکر تھی وہ کبھی انہیں حکیموں کے پاس لے کر جاتیں تو کبھی پیروں فقیروں سے دم درود کرواتیں مگر ناصرہ کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے ہر کوشش رائگاں گئی، ان کی حالت بگڑتی جارہی تھی، ناصرہ کو یہ غم ادھ موا کررہا تھا کہ وہ اس گھر میں فالتو اور بیکار شے ہیں، آخر سکھاں ہی ایک دن ہمت کر کے انہیں شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں، ڈاکٹر نے ایکسرے کیا تو پتا چلا کہ اُن کے دماغ میں رسولی ہے، ڈاکٹر نے جلد ہی آپریشن کروانے کا مشورہ دیا۔ سکھاں خود بیوہ ہوچکی تھی، بہ مشکل سلائی کڑھائی کر کے بہ مشکل گزارہ کررہی تھیں اس پر قیوم کی پڑھائی کا خرچ، وہ مدد کرنے کی حالت میں نہیں تھیں پھر آپریشن کے لیے کیا کرتیں، ان کے سسرال والوں نے تو صاف منع کردیا تھا ناصرہ نے خود کو قسمت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا، سکھاں ان کی حالت دیکھ کر روتیں تو ناصرہ کہتیں۔

''نہ رو سکھاں میرا ابلاوا آگیا اے بس وعدہ کر میرے بعد میری دھی دا خیال رکھے گی۔'' وہ ملتجی تھیں سکھاں نے وعدہ کرلیا پھر مجبوری، بے بسی اور حالات نے ان کی جان لے لی اکبر اور سکھاں کچھ نہیں کر پائے ناصرہ کے سسرال والوں کو ننھی سی تین ماہ کی بچی بوجھ لگنے لگی تو اکبر نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ سکھاں تو وعدہ کر ہی چکی تھیں اس لیے وہ اللہ کا نام لے کر اسے اپنے گھر لے آئیں پھر کچھ دنوں بعد شہر جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہوا اور اکبر موقع پر ہی ہلاک ہوگئے اُن کے گھر والے یہ گاؤں چھوڑ کر کہاں گئے سکھاں نہیں جانتی تھیں۔

سکھاں نے نجمہ کی اپنی حیثیت کے مطابق بڑے لاڈ پیار سے پرورش کی قیوم ذرا بڑا ہوا تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کردیا۔ وہ پڑھ لکھ کر اچھی نوکری کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت صرف ماں کا... بوجھ بانٹنے کے لیے کام کررہا تھا اس لیے ماں اور نجمہ کی خوشیوں سے مقدم اور کچھ نہیں تھا۔ ملک جی کی سفارش سے وہ گاؤں کے واحد اسپتال میں کمپاؤڈر کی نوکری کرنے لگا شام کو فارغ ہو کر وہ دودھ کی دکان پر چلا جاتا، اسلم دلدار کا سارا حساب کتاب وہی دیکھتا تھا۔ وہ اس گاؤں کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور کماؤ لڑکا تھا جن گھروں میں بیٹیاں تھیں سب قیوم کو داماد بنانے کے خواہشمند تھے مگر قیوم کا دل تو صرف نجمہ کے لیے دھڑکتا تھا، قیوم کے لیے اس کے منہ سے نکلی چھوٹی سے چھوٹی بات خواہش کا درجہ رکھتی اور اس کو پوری کرنے کے لیے وہ ہر جتن کر ڈالتا مگر اس کے باوجود وہ خوش نہیں تھی، وہ لوگوں سے اپنی ماں کے مرنے کی داستان سنتی تو اسے اپنی غربت محسوس ہونے لگتی وہ قیوم کی قدر کرنے کے بجائے اس رشتے میں گھٹن محسوس کرتی تھی۔ جس کا اظہار وہ جانے انجانے کئی مرتبہ کرچکی تھی لیکن دونوں ماں، بیٹا اس کی سوچ کو اس کا بچپنا سمجھ کر نظر انداز کردیتے۔

☆☆☆

رضیہ اور نجمہ دونوں شام کے وقت کھیتوں میں ٹہل رہی تھیں۔ کافی دور میلے کچیلے بچے کھیل رہے تھے وہ بھی مختلف کھیل کھیلتے ہوئے بے حد شور مچا رہے تھے۔ ایک بچہ شاید بتائے بغیر کھیلنے آگیا تھا اس لیے اس وقت اپنی ماں سے پٹ رہا تھا پڑوسن بچے کو چھڑانے کی کوشش کررہی تھی تبھی نجمہ بڑی حسرت سے بولی۔

''رضیہ بڑی تقدیر والے لوگ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی گڈیوں میں پھردے نوں دیکھ نا نہ گرمی دا پتا تے نہ سردی دا! اور دیکھ ہماری زندگیاں ٹوٹے شوٹے مکاناں نل شروع ہوندی اے اور اسی میں ختم ہوجاندی اے۔ پیر بابا کہندا اے کہ بندہ اپنے مرنے تے جینے واسطے رب دا محتاج ہوندا اے......

پر میری تقدیر دیکھ ساری حیاتی متاجی میں گزری اے۔'' وہ حسرت سے بولی۔

''تو کیا چاہتی اے؟'' رضیہ نے اس سے سوال کیا۔

''اس غوربت (غربت) دی زندگی توں نجات، میں اپنی ماں جیسی موت نئیں مرنا اے۔'' وہ جیسے خوفزدہ تھی۔

''کملی (پگلی) نہ ہوتے، بھئی اے تے تقدیر اے اور بندہ سب توں لڑسکتا اے پر تقدیر توں نئیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''پر رضیہ میری تقدیر چنگی ہے یقین نہ آئے تے او گلی تے نکڑ والا دین محمد ہے نا اس سے پوچھ لے۔'' وہ پُر یقین تھی۔

''او تے آپے سٹھیایا اے۔'' (خبطی ہے) رضیہ ہنس کر بولی۔

''پر رضیہ میں آپے وی کئی بار اپنے آپ کی محل دی رانی دے روپ وچ ویکھیا اے اور پیر بابا کہندا اے کہ اِک خواب باری باری دیکھو تے سچ ہوندا اے۔'' وہ اسے یقین دلانے کو بولی، رضیہ خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

''نجو! اے نجو، پتر قیوم آگیا اے کھانا لے آ۔'' سکھاں نے برآمدے سے ہی اسے آواز لگائی وہ اس وقت مونگ کی دال کو بگھار لگا رہی تھی جس کی خوشبو سارے گھر میں پھیل رہی تھی۔

''ہونہہ، قیوم نہ ہوا کوئی گورنر ہوگیا راہ وچ پھل پتیاں نا بچھاؤں نہ بھلا کوئی اسمان سے ٹپکا اے کہ آتے ہی غلامی کروں۔'' اے جانے کیوں قیوم سے چڑ تھی۔ اس نے انگیٹھی سے پتیلی آماری اور دال اسٹیل کی پلیٹوں میں ڈالی اور پھر کپڑے میں لپٹی گرم گرم روٹیاں نکالیں اور ٹرے میں اٹھا کر باورچی خانے سے باہر نکلی، باورچی خانہ کیا تھا ذرا سی دیوار اٹھا کر اس کے پیچھے انگیٹھی برتن اور بقیہ ضرورت کا سامان رکھا ہوا تھا اسے باورچی خانے کا نام دے دیا گیا تھا۔ برآمدے میں دسترخوان بچھا تھا۔ سکھاں نے ٹرے تھام لی اور نجمہ ایک طرف بیٹھ گئی۔

''تو کھانا نہیں کھائے گی؟'' قیوم نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں مجھے!'' وہ روٹھی روٹھی سی بولی۔

''اماں تو نے اسے کچھ کہا ہے؟'' قیوم نے سکھاں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''آج سے پہلے کدی کہا اے؟'' انہوں نے الٹا سوال کیا۔

''او تو ہی بتا دے، پہیلی بن کے نہ بیٹھ۔'' قیوم نے نرمی سے کہا۔

''روز، روز دال میرے کول نئیں کھائی جاندی اے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

شگفتہ کنول کی یاد میں

آجا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آجا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے اک تیری کمی ہے

شگفتہ کنول ہماری فیملی کی سب سے زیادہ ہر دل عزیز، بااخلاق، تعلیم یافتہ اور ٹیلنٹڈ لڑکی تھیں۔ وہ حقیقتاً ہمارے گروپ کی لیڈر، بزرگوں میں پسندیدہ ہستی اور نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید تھیں۔ وہ بے انتہا خوب صورت، معصوم اور فرشتہ صفت انسان تھیں۔ وہ جب بھی ہمارے درمیان موجود ہوتیں تو گویا مسکراہٹیں، ہنسی اور خوشیاں اردگرد بکھر جاتیں۔ وہ اسم بامسمیٰ تھیں اپنے نام کے مانند ہمیشہ شگفتہ...... ڈی جی خان کے پسماندہ اور دور افتادہ قصبہ شیر وجدید میں وہ پہلی لڑکی تھیں جنہوں نے گھر میں رہ کر پرائیویٹ ماسٹر کی ڈگری لی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ محفلِ میلاد، نعت خوانی اور ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ پاکیزہ انہیں ہمیشہ سے پسند تھا، وہ اس کے مختلف سلسلوں میں شامل ہوتی رہتی تھیں ان کا ایک افسانہ ''چاندی بھابی'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ آنٹی انجم انصار سے وہ بے حد محبت رکھتی تھیں۔ ان کے کراچی میں قیام کے دوران انجم انصار نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ 18 اپریل کو ان کی شادی ہوئی اور وہ ڈی جی خان چلی گئیں اور کچھ ہی عرصے بعد اپنے شوہر افتخار ذیشان چشتی کے ہمراہ کراچی چلی گئیں۔ ذیشان بھائی، شگفتہ باجی کے چچازاد ہیں جو بے حد خوب صورت ذہین، تعلیم یافتہ اور شریف انسان ہیں۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کنٹری چیف کے عہدے پر فائز ہیں۔ پاکیزہ کی مشہور و معروف مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے بے انتہا عقیدت رکھتی تھیں۔ دوبار اپنے شوہر کے ہمراہ ڈاکٹر صاحبہ کے گھر ان سے ملاقات کی اور ڈاکٹر صاحبہ سے متاثر ہو کر قرآن پاک ہاتھ سے لکھنا شروع کیا جو اس رمضان المبارک کے پچیسویں روزے کو مکمل ہوا۔ 24 شوال 23 ستمبر 2011ء کا دن ہمارے لیے عظیم دکھ لے کر آیا۔ باجی کے ہاں پہلے بچے کی ولادت...... متوقع تھی۔ صبح پانچ بجے اچانک ان کی طبیعت خراب ہوئی اور ان کا مس کیرج ہو گیا جس کا انہیں بے حد صدمہ ہوا، انہیں فوراً اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا گیا۔ تقریباً نو بجے ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور ان کا بی پی شوٹ کر گیا۔ ڈاکٹرز نے انہیں ملتان ریفر کر دیا۔ دس بجے ایمبولینس پر ملتان کے لیے روانہ ہوئیں مگر راستے میں ہی نازی گھاٹ پل سے ذرا آگے ان کی روح خالقِ حقیقی کی طرف پرواز کر گئی۔ آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ ''آپ ہمارے دلوں میں ہمیشہ ایک روشن ستارے کے مانند تابندہ رہیں گی اور آپ کی یاد میں ہماری آنکھیں ہمیشہ نم رہیں گی''۔ اللہ تعالیٰ ان کے والدین کو صبرِ جمیل عطا کرے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین) مرسلہ: جمیرا یاسمین، شیر وجدید

ماموں نے شہر میں کسی بہت امیر لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اب ان لوگوں کا بزنس سنبھال رہے تھے۔ شروع شروع میں تو ماموں محمود کے گھر والوں نے کتنے عرصے اس شادی کو قبول نہیں کیا، اب بات الگ تھی رانو کے نانا کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے انہیں بلایا تھا۔ پتا نہیں یہی بات تھی یا کچھ اور بھی، اسے ان باتوں سے بالکل دلچسپی نہیں تھی اسے تو بس شہر کے پڑھے لکھے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے وہ دوبار ان لوگوں کے گھر آئی تھی۔

ماموں محمود کے بیٹے توقیر کی نگاہ نجو پر پڑی تو دل میں اسے اپنانے کی خواہش پیدا ہوئی، دوسری طرف نجو کے لیے تو وہ خوابوں کے شہزادے جیسا تھا شاندار پرسنالٹی کا مالک ایک دولت مند شخص!

نجو نے جب سے اسے دیکھا تھا آنکھوں میں جانے کیسے کیسے خواب اترنے لگے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے فقط توقیر حواسوں پر سوار ہو گئے تھے۔ اسی لیے کبھی اس کی ہنڈیا جل جاتی تو کبھی کوئی اور کام بگڑ جاتا ہر وقت وہ قیوم اور توقیر کا موازنہ کرتی رہتی کبھی رنگت، کبھی قد و قامت، کبھی پڑھائی تو کبھی دولت اگر کسی چیز کو موازنے کے لائق نہیں سمجھا تو وہ تھی قیوم کی محبت۔

☆☆☆

آج رانو کے گھر کوئی دعوت تھی تبھی نجو صبح سے اس کے گھر آئی ہوئی تھی وہ کچن میں سالن پکانے میں مصروف تھی تبھی توقیر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

''میں اتنی دیر سے سوچ رہا تھا کہ کیا آسمان کا چاند زمین پر اتر سکتا ہے یا نہیں اور تمہاری موجودگی نے یقین دلا دیا کہ چاند گھروں میں بھی اترتا ہے۔'' انہوں نے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ تھپڑ دے مارتی مگر توقیر تو بابو ساتھا وہ۔ بندہ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی وہ شرم سے سرخ ہونے لگی تو توقیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں نجو اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولے نجو کے تو دل کی مراد بر آئی اس نے ایک لمحے کو محبت بھری نگاہوں سے توقیر کو دیکھا اور پھر شرماتے ہوئے بولی۔

''مینوں انتظار رہے گا۔'' اس نے چہرہ دوپٹے سے ڈھانپتے ہوئے کہا اور پھر جب توقیر کا اس کے لیے رشتہ آیا تو سارا گاؤں اس کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ نجو تو ہواؤں میں اڑنے لگی اس نے سکھاں کے فیصلے اور جذبات کا لحاظ کیے بنا بڑی خود غرضی سے کہا کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف اور صرف توقیر سے۔

''میں تو چاہتی تھی کہ تیری شادی قیوم دے نال ہو۔'' وہ حسرت سے بولیں۔

''ماسی میرے دل وچ اس دی جگہ نئیں، میں اس دے نال خوش نہیں رہ سکدی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی سکھاں کا دل دکھ کر رہ گیا انہیں زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ قیوم جو اس کی خاطر در بدر ٹھوکریں کھا رہا تھا اور موسم کے سرد و گرم جھیل رہا تھا وہ نجو کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ سکھاں سے برداشت نہیں ہوا تو قیوم کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔

ملک جی کے گھر قیوم کا فون آیا تو ملک کی بیوی نے فوراً سکھاں کو اطلاع کروائی سکھاں دوڑی چلی آئیں انہوں نے ریسیور کان سے لگایا۔

''ہالو، قیوم پتر کیسا اے تو؟'' وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھیں۔

''اماں بس ٹھیک ہوں تو اور نجو کیسی ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''بیٹا تو واز (آواز) سے بڑا تھکا لگ رہا اے۔'' انہیں فکر ہوئی۔

''اماں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''قیوم تو واپس آجا پتر۔'' انہوں نے بے اختیار کہا۔

''اماں سب ٹھیک ہے نا نجو تو...... اماں تیری طبیعت؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''بس یوں سمجھ کہ تیری یہاں بڑی ضرورت ہے۔'' وہ منت بھرے انداز میں بولیں۔

''ٹھیک ہے اماں میں جلدی آوں گا۔'' اس نے تسلی دی۔

☆☆☆

کج اونج وی راہوں اوکھیاں سن
کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوگ وی ظالم سن
کج مینوں مرن دا شوق وی سی

قیوم واپس لوٹ آیا تھا سکھاں بہت خوش تھیں پر نجو خوش نہ تھی، قیوم کی نگاہ جیسے ہی نجو پر پڑی وہ تیزی سے اس کے پاس چلا آیا۔

''دیکھ نجو تجھے غریبی سے نفرت تھی نا، اب دیکھ آج میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ میں دنیا جہاں کی خوشیاں تیرے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہوں۔'' وہ فخر سے بولا۔

''پر مینوں ہن تیری ضرورت اے نہ تیریاں چیزاں دی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی، قیوم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''نہ نجو ایسا نہ کہہ، بتا تو دے میرے سے کی غلطی ہو گئی۔'' وہ پریشان ہو گیا۔

''ماسی تو ہی بتا دے ناں کہ میری شادی تو قیر صاحب نال ہو رہی ہے اور اس وچ میری خوشی اے۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''نہیں تو میرے نال ایسے نہیں کر سکدی تو، تو مجھ سے محبت کردی اے ناں اور میں جانتا ہوں تو میرے بغیر نہیں رہ سکدی۔'' وہ پُریقین تھا۔

''اے تیر ابلیکھا (غلط فہمی) اے تو اپنی صورت دیکھ، تیرا میرا کوئی جوڑ نہیں۔'' وہ حقارت سے بولی۔

''نجو میرے نال ایسا نہ کر تجھے رب کا واسطہ!'' اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

عشق کا مقام ایسا ہوتا ہے کہ مرد و عورت کی تخصیص مٹا کر کبھی انسان کو سوالی اور کبھی سودائی بنا دیتا ہے، عشق کرنے والے وفا کا مطلب جانتے ہیں انا کے معنی نہیں۔

''گل اے نہیں قیوم او میرا عشق اے۔'' اس نے منہ پھاڑ کر کہہ دیا۔ قیوم کے دل کے ہزار ٹکڑے ہو گئے آنکھوں میں آنسو آٹھہرے۔

''جسے تو عشق سمجھ رہی اے ناں وہ دھوکا ہے، میں نے تجھ سے کہا تھا نا عشق وہ کرتے ہیں جو کچے گھڑے کی قدر جانتے ہیں اور بانسری کی دُھن سے دل کی پکار سنتے ہیں، یہ بڑے لوگ بڑے بڑے دعوے کر سکتے ہیں پر عشق کرنا ان کے بس کی بات نہیں...... او کملی باتیں کرنے اور کر دکھانے میں بڑا فرق ہے۔'' وہ پھر بولا سکھاں ان دونوں کی بے وجہ کی بحث سے تنگ آکر اندر چلی گئیں انہیں نجو کی باتیں اور اپنے بیٹے کی بے بسی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''تو یہ بولنا چاہتا ہے کہ وہ جھوٹا اور تو سچا ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے قیوم کو دیکھا۔

''تجھے شک ہو تو آزمالے میں تیرے لیے کج وی کر سکدا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''اچھی طرح سوچ لے جو میں چاہندی آں او تو نہیں کر سکدا۔'' وہ پُریقین تھی۔

"تو کیا چاہتی اے؟"

"اپنی خوشیاں دی سلامتی واسطے تیری جان چاہندی آں۔" (چاہتی ہوں) قیوم سناٹے میں آگیا اسے نجو سے اتنی سفاکی کی امید نہ تھی وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تو سچ مچ چاہتی اے کہ میں مرجاؤں؟" بے یقینی اس کی آنکھوں کی نمی سے عیاں تھی۔

"تو مرجائے گا تے میری زندگی سکھی ہوجائے گی۔" اس پر قیوم کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہ تھا۔

"نجو میں تو ساری عمر تیرے لیے جیا ہوں تیرے لیے مر بھی جاؤں گا پر یاد رکھ میرے بعد تو کسی اور سے محبت نہیں کرسکے گی، تجھے ہر دھڑکن میں میرے عشق کی پکار سنائی دے گی میں دنیا سے جاکر بھی تیری روح کا حصہ رہوں گا تو مجھے اپنے اندر سے نکال نہیں پائے گی، میں تیری خوشیوں کے لیے دعائیں مانگوں گا مگر میں جانتا ہوں میری دعائیں تجھے نہیں لگیں گی اور وہ اس لیے کہ خوشی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے نہیں ملتی، عشق کے قدموں میں ملتی ہے پر تو نہیں سمجھے گی...... تو نہیں سمجھے گی۔" آنسو بہنے لگے تو وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"اماں! نجو جو چاہتی ہے اسے دے دے۔" رات کو قیوم نے سکھاں کے پاؤں دباتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھیں۔

"قیوم یہ کیا کہہ رہا اے پتر، تو تو اسے بچپن توں چاہندیں ناں؟" انہوں نے یاد دلایا۔

"پر اومینوں نئیں چاہندی اماں اس دی خوشی کوئی اور اے۔" وہ دکھ سے بولا۔

"پر میں، کیویں اس نوں، غیراں دے حوالے کردیاں۔" وہ تڑپ رہی تھیں۔

"اب یہی بہتر ہے اماں۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا سکھاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، رو تو قیوم بھی رہا تھا بس اتنا تھا کہ ماں کی آنکھیں برس رہی تھیں اور اس کا دل بین کررہا تھا۔

☆☆☆

سکھاں نے دل پر پتھر رکھ کر ہاں تو کردی مگر وہ دل سے وہ خوش نہیں تھیں تو قیر کے گھر والوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کرنے کی سوچی اور آج وہ دن بھی آگیا جب نجو دلہن بن گئی' سرخ جوڑے میں نجو بہت خوب صورت لگ رہی تھی برات آئی تو لڑکیاں باہر کو دوڑیں نجو کمرے میں تنہا تھی تبھی قیوم اس کے پاس چلا آیا، نجو نے اسے دیکھ کر حقارت سے کہا۔

"قیوم تو یہاں کیا کررہا ہے؟"

"آخری بار.. تجھ سے ملنے آیا ہوں پتا نئیں پھر ملاقات ہوسکے گی کہ نئیں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"دیکھ قیوم حسن میری شادی ہورہی ہے ہوسکے تے کدی میرے سامنے نہ آنا، میرے گھر والے کو اگر پتا لگ گیا کہ تو میرے نال محبت کردا سا تے میری زندگی برباد ہوجاوے گی۔" اسے اب بھی اپنی فکر تھی۔

"میں جب تک زندہ رہوں گا میرا عشق کیسے مر سکدا اے؟ اور عشق بتایا تو نہیں جاتا، وہ خاموش رہ کر اپنی پہچان کرادیتا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"تو پھر تو مرجا تاکہ میرے سر تے اے تلوار ہٹے، میں ڈر ڈر کر نئیں جینا چاہندی۔" وہ اس گھڑی خود غرضی کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی اور اس گھڑی قیوم کا دل چاہا کہ وہ واقعی اپنی جان دے دے ابھی اور اسی لمحے!

☆☆☆

نجو اس آنگن سے رخصت ہوگئی مگر اس بات سے بے خبر کہ وہ اپنے سنگ کسی کی روح لیے جارہی ہے کسی کے خوابوں کو اپنے قدموں تلے روند کر اپنے خواب کی تعبیر پانے جارہی تھی۔ اس رات ٹوٹ کر بارش برسی تھی جیسے آسمان بھی قیوم کا دل، اس کا یقین ٹوٹنے پر رورہا ہو، قیوم نے اب تک بڑے صبر سے کام لیا تھا مگر اب دل پھٹ رہا تھا اس نے آنگن میں کھڑے ہوکر ہاتھ اٹھائے اور آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔

"اے میرے مالک تو، تو دلوں کا حال جانتا ہے، تجھے تو پتا ہے کہ میرے دل میں نجو کی محبت ہے جو کبھی کم نہیں ہوسکتی پر میں نہیں چاہتا کہ اس محبت میرے عشق کی خبر کسی کو ہو لیکن زندہ رہ کر اپنے عشق کو ماردینے کی مجھ میں ہمت نہیں...... میرے مالک تو مجھے اپنے پاس بلالے اپنی پوری زندگی میں اگر میں نے کوئی نیکی کی ہے تو مجھے اس بے بسی سے نجات دلادے، میں نجو کو کسی دے نال نئیں دیکھ سکدا۔ میری بے بسی ختم کردے تجھے اپنے حبیب محمد ﷺ کا واسطہ ہے اپنی رحمتوں کا واسطہ ہے۔" اس نے بڑی شدت سے اپنے رب کو پکارا تھا اس یقین کے ساتھ کہ انسان دوسرے انسان کو مایوس کرسکتا ہے پر اللہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔

☆☆☆

نجو کا استقبال اس کی توقع سے زیادہ اچھا ہوا تھا تو قیر نے بڑی محبت سے اپنی چاہتوں کا یقین دلایا تھا وہ بے حد خوش تھی۔ اس نے واقعی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا صبح وہ رسم کے مطابق ماسی کے گھر آئی تھی مگر وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اسے ماسی کی فکر ہونے لگی وہ ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھی تو زمین نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پڑی لاش کو دیکھ رہی تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا

کہ اس کے سامنے قیوم ہے جواب اس دنیا میں نہیں ہے، سکھاں تو رو رو کر دیوانی سی ہورہی تھیں ایک پڑوسی عورت نے اسے بتایا قیوم رات کو اچھا خاصا سویا تھا مگر صبح جب سکھاں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ نہیں اٹھا۔ رات کو اس کا دم جانے کیسے نکل چکا تھا۔ سب رو رہے تھے مگر نجو کوشش کے باوجود نہیں رو پائی۔

☆ ☆ ☆

نجو قیمتی نرم و ملائم بستر پر بیٹھی تھی بالکل خاموش اور ساکت سی، ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا یہ ان تین مہینوں میں چوتھا ڈاکٹر تھا۔

''کیا ان کی زندگی میں کوئی پریشانی ہے، آئی مین آپ دونوں کے درمیان کوئی پرابلم؟'' ڈاکٹر حامد نے توقیر سے سوال کیا۔

''نہیں ڈاکٹر، ہماری تو محبت کی شادی ہے اس لیے ہمارے رشتے میں تو خوشی اور ناخوشی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔'' توقیر نے وضاحت دی۔

''تو یہ کب سے خاموش ہیں؟''

''ہماری شادی کی اگلی صبح ان کے کزن کا انتقال ہوگیا تب سے اب تک ان کی خاموشی میرے لیے بھی ایک معما ہے۔'' توقیر کو جتنا معلوم تھا بتادیا۔

''دیکھیے سب کچھ تو نارمل ہے اور جیسا کہ آپ نے بتایا میڈیکل رپورٹس بھی کلیئر ہے تو پھر ان کی خاموشی کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ شاید انہیں ان کی موت کا دکھ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ جب ہمارا اپنا کوئی ہم سے دور چلا جائے تو اکثر بڑا شدید دھچکا لگتا ہے ایسے میں اکثر لوگ سکتے میں رہ جاتے ہیں اور یہ کیفیت کافی ٹائم تک ان پر حاوی رہتی ہے مگر ہاں تین مہینے کافی مدت ہے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولے۔

ان کے جانے کے بعد توقیر اسے لٹا کر باہر لان میں آگئے انہوں نے اب تک کی زندگی کا جائزہ لیا، ان تین مہینوں میں وہ ازدواجی خوشیوں کو ترس گئے تھے۔ انہیں دو پل سے زیادہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ شادی شدہ شخص ہیں، وہ اپنی سوچوں میں گم تھے تبھی نوکرانی منیرہ ان کے پاس چلی آئی وہ اسی گاؤں کی تھی۔

''صاحب تساں (آپ) برا نہ مانو تے اِک گل بولوں؟'' وہ ڈرتے ڈرتے اجازت طلب کررہی تھی۔

''بولو۔'' انہوں نے گویا اجازت دی۔

''صاحب آپ نے بڑے بڑے ڈاکٹر لوگوں کو دکھایا اگر ٹھیک لگے تے پیر سکھی نوں دکھالو۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''پیر سکھی......؟'' توقیر کو یہ نام بڑا عجیب لگا۔

''وہ جی سکھی تو ان کا ناں (نام) ہے پر سارے پیر بابا کہندے نوں۔'' اس نے سمجھایا۔

''وہ کیا کریں گے؟'' توقیر نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''او جی ان کے کول ہر مرض دا علاج ہے شاید بی بی کو بھی رام آجائے۔'' (آرام آجائے) توقیر خاموش ہوگئے۔

دوسرے دن توقیر نے یہ موضوع چھیڑا تو اس کی والدہ بکھر گئیں انہیں تو ویسے ہی اب نجو کا وجود ناقابلِ برداشت لگ رہا تھا وہ تو اب ان کی دوسری شادی کی فکر کررہی تھیں۔

''توقیر آخر تم کب تک ہمیں تماشا بناؤ گے پہلے تو تم نے خاندان سے باہر ایک چھوٹے گھرانے کی لڑکی سے شادی کرلی، میں خاموش رہی اور اب تین مہینے سے سب چھوڑ چھاڑ اسی کی فکر میں گھلے جارہے ہو، میں کہہ رہی ہوں کہ اس لڑکی سے تمہیں کوئی خوشی ملنے کی نہیں۔''

''امی میں آخری کوشش کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے کرو...... مگر یاد رکھو یہ اگر پھر بھی ٹھیک نہیں ہوئی تو میں اس لڑکی کو تمہاری زندگی میں نہیں رہنے دوں گی۔'' وہ قطعی انداز میں بولیں تو توقیر خاموش ہوگئے۔

توقیر اسے ساتھ لیے گاؤں آگئے' پیر بابا کے آستانے تک ملازمہ نے راہ نمائی کی تھی، وہ بابا کی کٹیا میں گئے تو بابا چٹائی پر بیٹھے چٹنی روٹی کھا رہے تھے انہیں بھی شامل ہونے کی دعوت دی مگر توقیر نے معذرت کرلی۔ بابا فارغ ہوکر ان کے پاس آبیٹھے توقیر نے انہیں ساری بات بتائی' پیر بابا نے ایک نظر اسے دیکھا وہ یہاں ہوکر بھی جانے کہاں تھی۔

''اسے جو روگ لگا اے نا پتر اس دا علاج ڈاکٹر، حکیم اور خود میرے پاس وی نئیں۔''

''میں سمجھا نہیں بابا؟'' توقیر الجھ گیا۔

''پتر جب انسان کسی سے عشق کرتا ہے اور اسے کھو دیتا ہے تو ساری زندگانی رو رو کر گزار دیتا ہے پر جب بے خبری میں عشق توں محروم ہو جاندا اے تے نہ جینے دے قابل رہندا اے نہ مرنے دے' بے خبری وچ لگی چوٹ بڑی ظالم ہوندی اے جن لوگاں توں عشق رُس جاندا اے او عمر بھر رب نوں نئیں منا سکدے۔''

''میں کیا کروں بابا؟'' وہ بے بسی سے بولے۔

''اسے آزاد کردے، اس کی روح کا رشتہ تیرے نال نئیں جڑ سکدا، اس کا سکون اسی مٹی توں جڑا اے۔'' وہ صاف گوئی سے بولے۔

''پر میں اس کے بنا کیسے جیوں گا؟''

''تیرے نال رہ گی تے تو وی بے سکون رہے گا تے اے وی۔'' وہ نرمی سے بولے تو توقیر رونے لگے۔ نجو کو چھوڑنا ان کے لیے آسان نہیں تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ زندہ لاش کے ساتھ زندگی گزارنا کسی نارمل انسان کے لیے ممکن نہیں اور پھر جس کے دل میں کوئی اور تھا اس کے ساتھ رہنا بحیثیت ایک مرد توقیر اپنی توہین سمجھتے تھے، اس لیے توقیر نے اسے آزاد کردیا۔ نجو نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ سکھاں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھیں وہ ہر ایک سے یہی پوچھتیں۔

''میرے پتر نوں ویکھا اے، شاید میرے نال رُس گیا، اے ملے تے کہنا ماں انتظار کررہی اے، آکر روٹی کھا لے۔'' ان کی حالت جو دیکھتا اس کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔

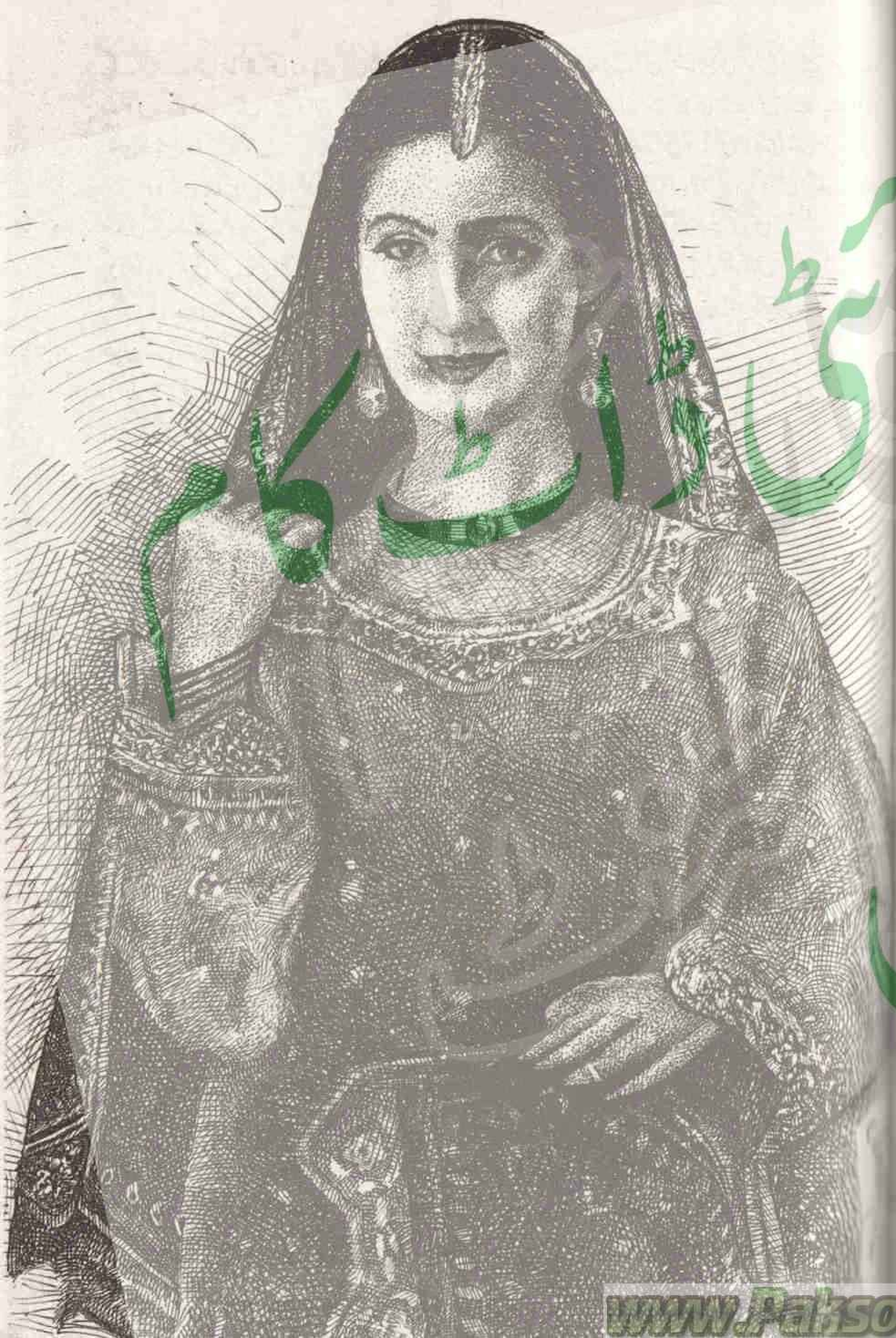
عدت پوری ہونے کے بعد پیر بابا اسے قیوم کی قبر پر لائے اور اس کی زبان پر پہلا نام قیوم کا آیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی پھر نجو نے روزانہ کا یہ معمول بنالیا، صبح جاتی اور شام ڈھلے واپس آجاتی وہ چند ہی جملے کہتی تھی۔

''مجھے معاف کردے قیوم، میں نے تیری جان لے لی، میں خود غرض ہوگئی سیاں تو ٹھیک کہتا تھا خوشی عشق دے قدماں وچ ہے اچیاں دیواراں دے پچھے نئیں۔'' ہر روز وہ آکر پیر بابا سے یہی کہتی۔

''بابا قیوم نے مینوں معاف نئیں کیا۔'' پیر بابا اسے تسلی دیتے۔

شام ڈھل چکی تھی پرندے آشیانے کی جانب لوٹ رہے تھے پیر بابا کو فکر ہونے لگی تو وہ اسے لینے چلے آئے دو تین مرتبہ آواز دینے پر جب نجو نے کوئی جواب نہیں دیا تو انہوں نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا نجو کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر بے پناہ سکون، وہ اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھی۔

''او تُو خوش قسمت ہے میری دھی تجھے عشق نے گلے لگالیا۔ قیوم نے تجھے معاف کردیا۔''



ناولٹ

کھلا دریچہ محبت کا

فرزانہ گیلانی

صبح، صبح اس گھر میں عجیب افراتفری کا عالم ہوتا تھا، ہر کوئی بھاگتا دوڑتا پھر رہا ہوتا کسی کو کالج تو کسی کو یونیورسٹی اور آفس جانے کی فکر لاحق ہوتی تھی سب سے زیادہ جلدی کا شور عریش مچاتی تھی اور ناشتا بناتی شاہدہ بیگم کو بوکھلا دیتی تھی۔ اس کا آج ضروری ٹیسٹ تھا اور وہ لیٹ ہو رہی تھی، وہ جتنی جلدی مچا رہی تھی گھڑی کی سوئیاں اتنی ہی تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔ جیسے تیسے الٹا سیدھا ناشتا کر کے اپنا شولڈر



بیگ لٹکائے خدا حافظ کہتی وہ باہر لپکی شاہدہ بیگم اپنی دعاؤں کے حصار میں اس کو اللہ کے حوالے کر کے کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگیں۔

وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی جو نہایت ضدی کسی حد تک خودسر اور منہ پھٹ۔ اس کی شخصیت کی نمایاں خوبی اس کا پُراعتماد ہونا تھا، اس نے خود کو کبھی کسی سے دبتا محسوس نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے خیال میں اس کا مستقبل میں کسی ایسے بندے سے واسطہ پڑنا تھا کہ جس سے وہ دب جاتی...... لیکن وہ دب گئی تھی ایک ایسے شخص سے جو اس کی ذات اور اس کے وجود سے اتنا ہی لاتعلق تھا جتنا وہ اس کی طرف مائل۔ اس کی لاتعلقی نے ہی اس کو اس کی جانب مائل کیا تھا۔ آج بھی اس کا رویہ ہنوز تھا وہ آج بھی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ آج وہ یونیورسٹی سے واپسی پر پھپھو کے گھر چلی گئی۔ پھپھو کا گھر ساتھ ہی تھا، ان کی ایک ہی پھپھو تھی۔

آج صبح سے ہی اس کا دل بہت بے چین تھا، دل کئی دنوں سے وسوسوں میں گھرا ہوا تھا پتا نہیں کب مستقل قسم کی بے فکری نصیب ہو گی۔ آج اتنے دنوں بعد دیکھا تھا باقی بیچ کے سارے دنوں میں کون سا پل تھا جب اس کا تصور ساتھ نہیں تھا سونے سے پہلے عالمِ بیداری کے اس آخری پل سے لے کر خوابوں کی وادی تک اور پھر آنکھ کھلنے سے کا پہلا احساس سب کچھ اس کے نام لکھا گیا تھا شاید پوری زندگی کے لیے۔

☆☆☆

آج موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہلکے ہلکے بادلوں نے آسمان پر بسیرا کر رکھا تھا۔ اس کی دستک کے جواب میں داؤد نے دروازہ کھولا تو وہ تو جیسے مراد بر آنے پر کھل اٹھی مگر وہ اس سے اتنا لاتعلق تھا کہ اس کے سلام کا جواب بھی احسان کی طرح دیتے ہوئے اسے یکسر نظرانداز کرتا تیزی سے اس سے پہلے ہی اندر چلا گیا۔ وہ اندر آئی تو آنٹی لاؤنج میں ہی بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر وہ کھل اٹھیں۔ حنا پھپھو کی ساس کو وہ اچھی بھی بہت لگتی تھی۔

”آنٹی، پھپھو کہاں ہیں؟ نظر نہیں آ رہی ہیں؟“ اس نے ان سے سلام دعا کے بعد پھپھو کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

”وہ اپنے کمرے میں ہوں گی بیٹا، تم وہیں چلی جاؤ۔“

”جی۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر پھپھو کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ پھپھو اپنے دو سالہ احمد کو زبردستی سلانے پر بضد تھیں جبکہ وہ ان کی کوشش کو ناکام بنانے میں لگا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟“

”ارے عریش، تم کب آئیں کیسی ہو... بھائی، بھابی اور...... امی ابو؟“

”بھئی میں اور آپ کے بھتیجے بھی ٹھیک ہیں۔“ اس نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے درمیان سے کاٹ کر خود ہی مکمل کر کے جواب بھی دے دیا۔ پھپھو اس کی جلد بازی والی عادت پر مسکرا دیں۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں آپ آئی ہی نہیں پھر آپ کو ایک ہی شہر ایک ہی گلی میں بیاہنے کا کیا فائدہ۔ آپ کی ہفتوں صورت دیکھنے کو ترستے ہیں۔“ وہ شکوہ کرتے ہوئے بولی، پھپھو مسکرا دیں۔

”بس کیا کروں، فرصت نہیں ملتی اوپر سے ان کے نخرے۔“ انہوں نے احمد اور حرا کی طرف اشارہ کیا۔ احمد تو سو گیا تھا مگر حرا آئس کریم کی فرمائش کر رہی تھی۔

”آ جاؤ باہر چلتے ہیں۔“ وہ پھپھو کی ہمراہی

باہر آئی۔ پہلی نظر صحن کے وسط میں کرسی پر بیٹھے داؤد مصطفیٰ پر گئی، اس کے ساتھ آنٹی اور حمزہ بھی بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز پر چائے کے برتن دھرے تھے۔

اس نے داؤد کی طرف دیکھا چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد، مضبوط ڈیل ڈول اور چہرے کے ہر تاثر میں سنجیدگی کا عکس اور اس کی شخصیت کو نمایاں اور شاندار بنانے میں اہم عنصر اس کی خمار آلود گلابی ڈوروں والی ذہین آنکھیں ہی تھیں جن میں پاکیزگی کا تاثر بھی نمایاں تھا جو کہ بہت کم کسی مرد کی آنکھوں میں ہوتا ہے، ہاں سے باتوں کے دوران اس کے چہرے پر بڑا دلنشیں اور نرم سا تاثر تھا۔ عریش یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ دل ہی دل میں اس کی اسمارٹنس کو سراہا تھا۔ آنٹی نے اسے دیکھ کر اسے بلایا اور چائے کی آفر کی۔ وہ اس وقت داؤد کے دل دکھانے والے تاثرات دیکھ کر آنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ واپس گھر جانا چاہ رہی تھی مگر آنٹی کے بلانے پر ان کے پاس جا بیٹھی۔ نوید پھوپا بھی آ گئے تھے۔ پھپھو سب کے لیے دوبارہ چائے لے آئیں۔ پھپھو نے اس کو چائے بنانے کو کہا۔ مجبوراً وہ تپائی کے قریب آئی ورنہ داؤد مصطفیٰ کے سامنے اس وقت وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت پُراعتماد تھی مگر آج نہ جانے کیوں وہ نروس ہو رہی تھی۔

کپ میں چائے ڈالنے پر کیتلی کا ڈھکن جو اٹکا ہوا تھا گر گیا چائے اوپر سے بھی چھلک کر ٹرے اور دیگر کپوں کو گندا کر گئی تھی۔

”اوہ، یہ کیا ہو گیا؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے کیتلی سیدھی کی کچھ گرم چھینٹے ہاتھ پر بھی محسوس ہوئے تھے۔

”یہ وہی ہوا ہے جو بدسلیقہ اور پھوہڑ لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔“ اس کی دھیمی سی بڑبڑاہٹ پر وہ فوراً ہی سرتاپا سلگ گئی تھی۔ اپنی سابقہ پسندیدگی پر خود کو دس بار لعنت بھیجی اب کیتلی کا ڈھکن صحیح سے نہیں اٹکا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اس کی شکل دیکھ کر پھپھو مسکرائیں جبکہ آنٹی نے داؤد کو گھورا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا، ایسا ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے اس کی شرمندگی کم کرنے کی کوشش کی۔

چائے پینے کے بعد وہ پھپھو کے ساتھ کچن میں آ گئی۔ پھپھو کو ڈھیر کے حساب سے ہری مرچیں کاٹتا دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”پھپھو یہ اتنی ساری مرچیں کیوں کاٹ رہی ہیں؟“

”بھئی آج ساگ بنایا ہے اور اس میں ہری مرچیں نہ ہوں تو پھر کیا مزہ کھانے کا۔“

”مگر پھر بھی یہ بہت زیادہ ہیں۔“ وہ اپنی حیرت چھپا نہ سکی۔

”مرچیں کیا کہتی ہیں، یہ تو بھئی اندر کی صفائی کرتی ہیں۔“ وہ سادگی سے بولیں۔

”کیا صفائی؟“ وہ حیران ہوئی۔ پھر اُن کی سادگی اور کم علمی پر مسکرا دی۔

”ارے میری بھولی پھپھو یہ اندر کی صفائی نہیں بلکہ صفایا کرتی ہیں اگر اس مقدار سے استعمال ہوتی رہیں تو۔“

☆☆☆

پچھلی رات زبردست آندھی اور بارش آئی۔ صبح اس نے یونیورسٹی سے چھٹی کی اور سارے گھر کی تفصیلی صفائی کی۔ بابا اور باقی بھائی تو گھر سے باہر تھے مگر علی البتہ ابھی تک سویا ہوا تھا اس نے بھی آج چھٹی ماری تھی۔ ساڑھے بارہ ہو رہے تھے سب کاموں سے فراغت کے بعد وہ نہانے کا سوچ رہی تھی کہ اتنے میں باہر بیل ہوئی۔ شہزاد کہہ کر گیا تھا کہ

وہ بارہ بجے تک انسٹی ٹیوٹ سے واپس آجائے گا۔ وہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی۔ دروازہ کھول کر وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی آنے والا شہزاد نہیں اور جو تھا اسے دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' داؤد نے سلام میں پہل کی۔ وہ ہکا بکا کھڑی تھی۔

''امی تو آپ کی طرف گئی ہیں۔'' آخر سنبھلتے ہوئے کہا۔

''مجھے علی سے ملنا ہے اگر وہ ہو تو اسے انفارم کر دیں۔'' وہ شائستگی سے بولا۔

''جی علی تو ہے آئیں۔'' دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھال کر اسے اندر آنے کے لیے رستہ دیا۔

''پتا نہیں علی سے کس سلسلے میں ملنا ہے یہ۔'' ڈرائنگ روم کی طرف تیز تیز قدموں سے چلتی وہ انہی سوچوں میں گم تھی۔

''وہ سو رہا ہے آپ بیٹھیے پلیز۔'' نہایت پزل انداز میں اس نے اخلاق نبھانے کی کوشش کی۔ داؤد نے ایک تفصیلی نگاہ اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر ڈالی اور پھر صوفے پر براجمان ہوگیا۔

''علی کے بچے اٹھ بھی جاؤ۔'' علی کے کمرے میں جا کر اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''اوہ، سونے دو۔'' اس نے کروٹ بدل لی۔

''پلیز بھائی اٹھ جاؤ، وہ آئے ہوئے ہیں۔''

''کون آئے ہوئے ہیں؟'' علی نے مندی مندی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''داؤد۔'' اس نے دھیمی آواز میں بتایا۔ علی حیرت انگیز طور پر فوراً اٹھ بیٹھا۔

''اوہو یار! کتنا بھلکڑ ہوں میں، اس نے رات بھی فون پر بتایا تھا۔'' وہ تیزی سے بستر سے اترا۔

''کتنی دیر ہوگئی ہے، شہزاد تو بیٹھا ہے نہ اس کے پاس؟'' اس نے سلیپر پہنتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''امی تو ہوں گی نا، میں ذرا نہا لوں تم جب تک میرے کپڑے نکال دو۔'' وہ باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''کوئی نہیں ان کے پاس۔'' اس نے خفگی سے اسے جتایا۔ علی باتھ روم کے دروازے سے پلٹا ایک نظر بیڈ پر بیٹھی عریش کو دیکھا پھر الماری کھول کر ہینگر سے کپڑے نکالے اور دوبارہ باتھ روم کا رخ کیا۔ وہ چپ چاپ اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتی رہی۔ پانچ منٹ کے بعد ہی وہ باہر آگیا، نہانے کا ارادہ ملتوی کر کے صرف ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا تھا۔

''ہم یونیورسٹی جا رہے ہیں، داؤد کے کسی دوست کے بھائی کا مائیگریشن کا مسئلہ ہے۔'' اس نے اسے گم صم حالت میں بیٹھا دیکھ کر بتایا۔

''تو میں کیا کروں؟'' وہ بیزاری اور خفگی سے گویا ہوئی۔

''کچھ نہیں کرو بس جلدی سے جو بھی کھانے کو ہے وہ لے آؤ، ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔''

☆☆☆

وہ ایک عام سا دن تھا وہ شور مچاتی پھپھو سے لپٹ گئی۔ پھپھو سے بچوں کی طرح ڈھیروں پیار لیتے جونہی اس کی نگاہ سامنے اٹھی تو پھر پلٹنا بھول گئی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ کہاں کھڑی ہے، وہ بھول گئی تھی کہ اسے پھپھو سے کیا کہنا ہے۔ وہ بھول گئی تھی کہ کوئی ایسا لفظ بھی ہے جو قدرت کے اس حسین شاہکار کی تعریف میں کہا جاسکے۔ وہ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے بلیک جینز اور ڈھیلی ڈھالی سی شرٹ پہن رکھی تھی اس کے بال منتشر تھے، بالوں کے گچھے نے اس کی کشادہ پیشانی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی سوجی اور بہت گلابی تھیں۔ شاید وہ سو کر اٹھا تھا۔ عریش نے دیکھا اس کے ہونٹوں کی تراش بہت خوب صورت ہے اس کو ایسے لگا جیسے اندھیرے میں روشنی ہوگئی ہو۔

''تو کیا یہ وہی ہے جو میرے دل کی خواہش ہے؟'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ خود سے پوچھا اور ایک دم ہی پلٹ کر لاؤنج میں چلی آئی۔

''ارے عریش کب سے یاد کر رہے تھے ہم لوگ تمہیں۔'' عظمیٰ آنٹی نے خوش دلی سے اسے اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ جواباً گرم جوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکی تھی۔

''آج میں نے تمہاری پسند کی ڈش بنوائی ہے یعنی کڑھی۔''

''اچھا......'' وہ بہ مشکل مسکرائی تھی۔ اسی اثنا میں پھپھو چلی آئیں عریش کو قدرے خاموش اور گم صم سا پا کر وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔

''کیا ہوا، تم خاموش کیوں ہو...... بھائی، بھابی سب ٹھیک ہیں نا؟'' وہ پریشان لہجے میں بولیں۔

''سب ٹھیک ہیں پھپھو آپ پریشان نہ ہوں۔'' اس نے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''میں گھر چلتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' پھپھو کے ساتھ ساتھ آنٹی کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔

''وہ میرے سر میں درد ہے۔'' اس نے بہ مشکل بات بنائی تھی۔

''کھانا کھائے بغیر تو تم نہیں جاسکتیں۔''

''مگر......''

''اگر گر مگر کچھ نہیں......'' آنٹی نے کہا۔

''داؤد آیا ہے۔''

''کون داؤد؟'' عریش نے خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''داؤد میرا دیور اور کون؟'' پھپھو نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''اوہ، اچھا۔''

''چار سال بعد آیا ہے، میری شادی پر بھی نہیں آیا تھا اب یہیں پاکستان میں اپنے بزنس کا سوچ رہا ہے، تم اس سے ملی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اب انہیں کیا بتاتی کہ اس ساحر کی وجہ سے ہی تو اس کی یہ کیفیت ہوگئی ہے اور یہاں سے اس کی یک طرفہ پریم کہانی کی شروعات ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ رستہ تو بہت خاردار ہے، اسے قدم قدم پر زخموں سے چور ہونا تھا وہ تو اپنے یونیورسٹی میں داخلے کا بتانے آئی تھی مگر کچھ بھی نہ بول پائی۔

عریش کو وہ پہلی بار ہی دیکھنے میں خاصا سنجیدہ مزاج اور ریزرو لگا تھا۔ وہ پہلے بھی شاید اس کا سامنا کر چکی مگر اب تو وہ اس کو اس قدر سوچ چکی تھی کہ اب مسلسل اس کی سوچوں اس کے دل و دماغ میں بلا اجازت چلے آنے پر قدغن نہ لگا سکی اسے تو شاید وہ یاد بھی نہ ہو مگر وہ تو اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ گزرتے دنوں میں عریش کو پتا ہی نہ چلا کہ اسے داؤد کو سوچنا کتنا اچھا لگنے لگا ہے۔ بہت دنوں بعد وہ چونکی تھی۔

''ارے، مجھے بھی محبت ہوگئی ہے کیا......؟ اوہ، زبردست......!'' وہ اس وقت بلاسبب ہی بہت خوش ہوگئی تھی کتنا اچھا لگتا تھا...... ایک شخص ہے جسے دیکھنے یا سوچنے کی وہ شعوری سعی سے مبرا تھی مگر ایک بے اختیاری سی بے اختیاری تھی جس کی بنا پر وہ ہر

روز ہی پھپو کی طرف کھنچی چلی آتی تھی، ناجیہ نے ازخود اس کے جدا انداز، مسکراتے لبوں اور جگمگاتی آنکھوں سے جان لیا کہ کوئی ہے جو اس کی سوچوں کا محور بن چکا ہے۔ داؤد مصطفیٰ، عریش نے نام لے کر اعتراف کرنے میں دیر نہ لگائی۔

''اوہ، جبھی تم اتنی خوش مزاج ہوگئی ہو۔''

''کیا مطلب، میں پہلے بدمزاج تھی کیا؟'' اس نے مصنوعی خفگی سے اسے ایک دھموکا جڑتے ہوئے کہا۔

ناجیہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی بال بنا رہی تھی اور گنگنا رہی تھی۔ ''اکھیاں وچ سڑک بنا لے۔''

''یہ آنکھیں تو میری بہن پہلے ہی چنی منی سی ہیں، اس میں سڑک تو نہیں البتہ باریک سی پگڈنڈی شاید بن جائے۔'' اس کے کندھے تھپتھپا کر اس کو دلاسا دیا۔

''بس بکواس کرتی رہنا اور کوئی ڈھنگ کا کام نہ کرنا۔'' وہ برا مناتے ہوئے بولی اور ایک جھٹکے سے اپنے کندھے چھڑائے۔

''اچھا، اچھا موڈ ٹھیک کرو تمہیں اچھی سی چائے پلاتی ہوں، او کے۔'' وہ اس کے کندھے تھپتھپا کر بولی اور کچن میں آگئی۔ ناجیہ اس کی خالہ زاد تھی اور باغرض تعلیم ان کے گھر ہی رہتی تھی۔ ناجیہ کو اس کا کپ پکڑا کر اپنا لے کر بیڈ پر آگئی۔

''اچھا تو ناجیہ صاحبہ، آپ بتائیں آپ کے سینے کے بائیں طرف کوئی ہلچل ہوئی؟''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں دوسروں پر فضول ٹائم برباد نہیں کرتی۔'' اس نے نخوت سے جواب دیا۔

''تم محبت کو وقت برباد کرنا کہتی ہو؟'' اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ ''محبت تو زندگی کا سب سے خوب صورت رنگ ہے اور تم تو ویسے ہی کلر بلائنڈ ہو۔'' وہ اس کو چڑانے کو بولی۔

''میں نہیں مانتی، آج کے دور میں سچی محبت کوئی کسی سے نہیں کرتا۔ بغیر غرض کے کوئی کسی سے بات نہیں کرتا... محبت کیسے کرے گا۔'' اس نے اپنا تفصیلی تجزیہ پیش کیا۔

''وقتی پسندیدگی کو محبت کا نام دینا میں محبت کی توہین سمجھتی ہوں۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے، سچی محبت کرنے والے بے شک بہت کم لوگ ہیں دنیا میں مگر ہیں ضرور ورنہ یہ دنیا اتنی خوب صورت نہ ہوتی۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے جیسے اس خوب صورتی کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں یہ ہے کہ سچی محبت کی قدر کرنے والے بہت کم ہیں۔'' عریش نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اچھا خیر، یہ بتاؤ کہ تمہارا محبت پر یقین نہ سہی مگر کوئی آئیڈیل تو ہوگا؟'' اس کے لہجے میں تشویش بھی شامل تھی۔

''میں آئیڈیل پر بھی بلیو نہیں کرتی۔''

''کیا؟'' عریش نے تاسف و ہمدردی کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھا۔ ''مجھے تمہاری سوچ پر ترس آ رہا ہے۔''

''اچھا، تمہارا آئیڈیل کیسا ہے؟'' ناجیہ نے یونہی بات کرنے کی غرض سے اس سے پوچھا ورنہ وہ سب جانتی تھی۔ عریش کو تو موقع چاہیے تھا داؤد مصطفیٰ کے بارے میں گفتگو کرنے کا۔ اس کا انداز...... لب و لہجہ...... نشست و برخاست آنے جانے کے اوقات تک کو اپنے قلبی لگاؤ کی بنا پر انتہائی گہرائی سے دیکھتی تھی۔ ابتداً وہ کچھ جھجکتی تھی لیکن رفتہ رفتہ جھجک بھی کم ہوگئی، اس کا دل چاہتا وہ ہر وقت بس داؤد کی ہی

باتیں کرے اب ناجیہ نے خود ہی پوچھ لیا تو وہ فوراً ہی بول پڑی۔

"میرا آئیڈیل تو مل گیا ہے۔ سنجیدہ، پُروقار اور دردمند دل رکھنے والا امپریسو پرسنالٹی، کچھ کچھ رومینٹک۔ میں تم سے کہتی تھی نا کہ کوئی ایسا جو اندھیرے میں روشنی لے آئے جس کو دیکھ کر نظر تھم جائے۔ جس کی نظروں میں پاکیزگی ہو، جو عورت کا احترام کرنا جانتا ہو۔"

"تمہیں اس میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی ہے جو کسی دوسرے میں نہیں؟" اس نے طنز سے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے وہ بس انسان لگتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا مطلب وہ انسان ہے اور باقی سب بندر اور ریچھ ہیں؟" ناجیہ حیرت سے آنکھیں پھیلائے صدمے سے گویا نڈھال ہوگئی۔

"کوئی معقول وجہ بتاؤ، وہ انسان لگتا ہے تمہیں مگر تمہاری باتیں انسانوں والی نہیں لگتیں مجھے۔" ناجیہ کے لہجے میں ملامت اور افسوس کی آمیزش تھی۔

"تو اور کیا بتاؤں کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند ہیں، کان پسند ہیں۔" وہ چڑ کر بولی تو ناجیہ نے اسے گھورا۔

"بھئی وہ مجھے اچھا لگتا ہے یہی کافی نہیں ہے۔"

"ہونہہ اچھا لگتا ہے، میں تمہاری باتوں میں آ کر تمہارا دل رکھنے کو چپ کر کے سنتی رہتی ہوں اور تمہاری ہاں میں ہاں ملاتی رہتی ہوں مگر وہ مجھے تمہارے حوالے سے بالکل بھی پسند نہیں۔" ناجیہ کے لہجے وانداز میں ناگواری تھی۔

"کیوں، کیا کمی ہے۔ آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب کچھ تو ہے اس میں جو ایک انسان کو مکمل بناتا ہے پھر کیا مسئلہ ہے پڑھا لکھا، شریف بندہ ہے۔" اس کا اطمینان دیکھنے والا تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جو خوبیاں تم گنوا رہی ہو اس میں موجود ہیں مگر پھر بھی تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔" ناجیہ نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

"نہیں ہیں۔ داؤد مصطفیٰ کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔" وہ اب بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

"ناجیہ، تمہیں پتا ہے مرد کی ساری دلکشی اس کی ہائٹ میں ہوتی ہے۔" وہ بیڈ سے نیچے اتر کر خواب کی سی کیفیت میں بولتی صوفے پر جا بیٹھی۔

"تو کیا یہ دنیا کا آخری مرد ہے جس کی ہائٹ اچھی ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہائٹ کے مرد ہیں دنیا میں...... مگر مسئلہ یہ ہے کہ تم اندھی ہو چکی ہو اور جب انسان کی آنکھوں پر محبت کی سیاہ پٹی بندھ جاتی ہے تو اسے پتا نہیں ہوتا کہ مچھر کھا رہے ہیں یا مکھی، ویسے تو محبت کرنے والے سب ہی پاگل ہوتے ہیں مگر یک طرفہ محبت کرنے کے بارے میں کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ یک طرفہ محبت خلل ہے دماغ کا۔ یہ واقعی لاعلاج مرض ہے۔" وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرا کر بولی۔ آخر میں وہ بھی غیر سنجیدہ ہوگئی۔

"بے شک دنیا میں زیادہ ہائٹ کے اچھے مرد ہیں مگر ان میں داؤد مصطفیٰ جیسی خوبیاں تو نہیں، مجھے تو داؤد سے محبت ہے۔" اس نے پوری بات سن کر سکون اور تحمل سے جواب دیا۔

"میں نے تو تمہارے لیے دو تین اچھے، اچھے رشتے بھی دیکھ لیے تھے۔" ناجیہ لہجے میں فکر سمیٹ کر بولی۔

"ارے، خالہ صغریٰ آپ نے یہ کام کب سے شروع کر دیا؟" اس نے بھی اس کی بات کا جواب اسی کے سوال جیسا غیر سنجیدہ دیا۔

"کون سا؟"

"یہی رشتے کروانے کا۔"

"تم زیادہ دادی اماں بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"پہلے سن تو لو۔" وہ اصرار بھرے لہجے میں بولی۔

عریش نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک تو اپنا عمران عباس ہے۔ اُف، کیا زبردست کپل ہوگا۔" اس کو پتا تھا عمران عباس اس کو پسند نہیں ہے۔

"شٹ اپ۔" وہ تلملائی۔

"ارے پاگل، لڑکیاں مرتی ہیں اس پر۔" اس نے لالچ دیا۔

"اور میری جوتی بھی نہ مرے اس پر۔"

"اچھا تو فواد خان کیسا ہے وہ تو تمہیں پسند بھی ہے چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔"

"وہ بھی تمہیں ہی مبارک ہو سمجھیں!"

"اُف تو ایسے رہی ہو جیسے وہ مرے جا رہے ہیں تم سے شادی کے کرنے کے لیے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا، اس کے علاوہ مجھے تو پوری دنیا کے مرد بیکار سے لگتے ہیں۔ میرے لیے تو وہ دنیا کا آخری مرد ہے اور اب پلیز دماغ کھانا بند کرو۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

"اگر دماغ ہوتا تو کیا وہ تمہیں دنیا کا آخری مرد لگتا جو تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالتا ہے۔" ناجیہ نے آخری کوشش کے طور پر غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں تو نہ ڈالے گھاس، میں گھاس نہیں کھاتی اگر بھی ڈالی تو وہ میں تمہیں دے دوں گی، تمہاری تو فیورٹ ڈش ہے نا؟" اس نے حساب برابر کیا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔

☆☆☆

عریش آج کل داؤد مصطفیٰ کے بارے میں ہی سوچتی۔

داؤد مصطفیٰ کو جب سے اس کی نظروں کا تپتا ارتکاز محسوس ہوا تھا اس کے بعد سے اسے دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر چند ناگواری کی علامت شکنیں اتر آتی تھیں لیکن اس نے زبان سے کبھی اس کی بات کا اعتراف نہیں کیا تھا تو براہِ راست اسے ٹوکا نہیں تھا لیکن جب بھی موقع ملتا "آپ اپنی اسٹڈیز پر توجہ مرکوز کریں۔" جتاتا ہوا ہلکا سا جملہ ضرور ادا کرتا تھا۔ وہ اس جملے کا پس منظر جانتی تھی جبھی سوچتی اگر داؤد میرے جذبوں سے واقف ہے تو مجھ سے بچنے کی کوشش کیوں کرتا ہے کیا کمی ہے مجھ میں؟ اور یوں اس کا گریز ہی عریش کی دیوانگی میں اضافے کا سبب بنا، وہ سائے کے مانند اپنے ساتھ چلتی اس کی نظروں سے الجھن محسوس کرتا تھا بالآخر اس نے ایک دن اس کو اپنے پاس بلایا۔

"یہ آپ کن چکروں میں رہتی ہیں آج کل؟"

"محبت کے چکروں میں۔" اس نے ایک مبہم سی سرسری بات کہی تھی مگر اس جملے کا جو مسکراہٹ سے بھرپور شوخ جواب آیا اس سے داؤد کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا اور وہ بھی چند ساعتیں سنجیدگی سے انہیں دیکھتے

رہنے کے بعد نظریں جھکاتے ہوئے مزید کہہ رہی تھی۔

"کوئی بھی شخص خود پر پڑنے والی خاص نگاہوں سے انجان نہیں رہتا، آپ پر اٹھنے والی میری ان نگاہوں کی تحریر بھی آپ بخوبی پڑھنا جانتے ہیں جس کے ہر ہر لفظ میں آپ ہیں پھر یہ اجتناب کیوں اختیار کر رہے ہیں؟"

"شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔" اِک بیکراں حیرانی سے نکل کر داؤد نے اسے دھیمے مگر سخت لہجے میں ڈانٹا تھا۔

"ذرا یہ تو سوچیں آپ ایک مرد سے مخاطب ہیں، نامحرم مرد سے۔" اس کے لہجے میں شدید ناگواری تھی۔

"میں اس شخص سے مخاطب ہوں جس سے میں محبت کرتی ہوں۔" عریش دل ہی دل میں خود بھی اپنی حرکت پر حیران ہونے لگی۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے کچھ زچ ہو کر اسے شرر بار نظروں سے دیکھنے لگا۔

اسے چند جملوں میں ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کی عادت تھی..... مسلسل بول کر اسے جو کچھ سمجھانے کی سعی کی سب بے اثر گیا تھا، اس کی وہی ٹون تھی کی سچ ہے کہ یک طرفہ محبت کسی منہ زور چڑھتے دریا کے مانند ہوتی ہے جو بند توڑ کر سمت اور جگہ کا تعین کیے بنا بس بہتا ہی چلا جاتا ہے بغیر اس غرض کے کسی کو نقصان پہنچے یا کسی کو اس پانی کی طلب نہیں کچھ یہی کیفیت عریش کی تھی چاہے جانے کی طلب پوری نہ ہونے کے باوجود کسی گہرے ذاتی ادراک کے بنا ہی وہ اپنے جذبوں میں اتنی کھری ہو چکی تھی کہ داؤد کے علاوہ کسی اور شخص کی زندگی میں شامل ہونے کا تصور بھی اس کی دھڑکنوں کو پسپا کرنے لگتا تھا۔ وہ اپنے جذبے کے ہاتھوں ہاری ہوئی تھی اور اس ہار میں اب تک اسے اپنی عزتِ نفس کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ بس اس نے سوچا کہ اس کے جذبوں میں سچائی ہے تو وہ ضرور اپنا آپ منوالیں گے مگر داؤد کی بے گانگی ہنوز پہلے دن کی طرح تھی۔

"میری زندگی میں آپ کے علاوہ کسی اور کی گنجائش ہرگز نہیں ہے۔" اس کی خاموشی پر اس کی سمت دیکھے بنا اس نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا تھا۔ داؤد یک بہ یک اٹھ کھڑا ہوا جیسے کسی شدید ردِعمل کو روکنا چاہتا ہو۔ چند قدم ٹہل کر واپس اس کی طرف پلٹا نگاہیں سختی سے اس پر جما کر بولا۔

"میں اتنی دیر سے یہی ایک بات آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں محترمہ کہ جو آپ کہہ رہی ہیں میں ان باتوں پر بلیو نہیں کرتا۔" وہ ہر حرف پر زور دے کر کہہ رہا تھا۔ آواز کو حتی الوسیع نرم رکھنے کی سعی کی تھی مگر لہجہ خاصا سرد تھا۔ "اور ویسے بھی آپ کی عمر ابھی ان باتوں کی نہیں ہے پہلے یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کریں عملی زندگی میں قدم جمائیں پھر آپ اپنی زندگی کے بارے میں حتمی فیصلے کر سکتی ہیں اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ اپنی جذباتی باتوں اور حرکتوں سے میرا دل جیت لیں گی یا کبھی نہ کبھی مجھے آپ سے محبت نامی چیز ہو جائے گی تو یہ بھی آپ کی حد درجہ خوش فہمی ہی ہو سکتی ہے۔" وہ اس کی اتنی واضح باتوں اور روڈ لہجے سے اب بری طرح خائف ہو رہی تھی۔

"میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ کوئی میری طرف انگلی اٹھائے جب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی ایسا فضول جذبہ ہی نہیں تو میں کوئی خوامخواہ اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا ہوں، نہ آپ کی حوصلہ افزائی کر سکتا ہوں۔ جس طرح آپ میری راہ میں آتی ہیں، میرے پیچھے لپکتی ہیں، یہ سب کچھ میرے

لیے بے حد ناگوار ہے اور یہ سب اِک سلجھے ہوئے ذہن کی لڑکی..... کو سوٹ بھی نہیں کرتا۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ باکردار لڑکیوں کو سوٹ نہیں کرتا۔" عریش کے دل کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی کہ جس شخص کے لیے وہ اپنا آپ بھول بیٹھی ہے وہی آج اتنے کھلے لفظوں میں اسے انعام دے رہا ہے۔ اُف یہ محبت بھی نری خواری ہے پھر انہیں وضاحت دینا بھی ضروری سمجھا "آپ بااختیار ہیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔" پل کے پل اس کی خوب صورت آنکھوں میں پانی آن ٹھہرا مگر لہجہ سپاٹ ہی تھا۔ "یہ سچ ہے کہ میں آپ کے معاملے میں بے اختیار و بے بس ہوں بہت کوشش کرتی ہوں کہ آپ کے رستے میں نہ کھڑی ہوں مگر یہ قدم رکھتے ہی نہیں جو رستہ آپ کی منزل کو جاتا ہو کیا آپ اس راستے پر اپنے قدم بڑھنے سے روک سکتے ہیں؟"

"لیکن آپ کو اپنے قدم روکنے ہوں گے۔" داؤد نے اس کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری نہیں جانا تھا۔ "آپ اپنے حوصلے اور جرأت کو مثبت اپروچ دیں۔ پلیز یو مے گو ناؤ۔" لفظوں کو وہ خاصا چبا کر بولا۔ "ان خرافات میں پڑنے کے بجائے آپ اپنے پیرنٹس کی عزت کا خیال کریں۔" عریش سلگ اٹھی۔

"بہتر ہوتا کہ آپ اپنے والدین کو میرے گھر بھیجیں۔" وہ اس آر یا پار والے موقع کو کسی طور گنوانا نہیں چاہتی تھی سو بول پڑی۔ "میرا خیال ہے پھر سب کچھ اعتدال پر آ جائے گا اس کے بعد آپ جو چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔" وہ اس کی ڈھٹائی پر کھول اٹھا۔

"بچ...... میں آپ کو اتنا کم عقل نہیں سمجھتا تھا، کتنی بے باکی سے آپ مجھے ایک فضول سے یک طرفہ جذبے کے لیے مسلسل کنوینس کر رہی ہیں۔ آپ کیا کر رہی ہیں اس بات کا آپ کو ذرا بھی لحاظ نہیں تو کم از کم اپنے والدین کی عزت و تربیت کا ہی کچھ خیال کر لیں۔" اور اس کا اس طرح جتانا ہی عریش کو گڑبڑا گیا، اس کے لال بھبوکا چہرے کو دیکھ کر اس کی غضبناکی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"آپ اس جذبے کے لیے کیوں اپنی عزتِ نفس کو داؤ پر لگا رہی ہیں۔ جس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔" اس کے اس قدر ریخ پا ہونے پر وہ بے چینی سے اپنے لب کچلنے لگی۔ محبت کرنا کس طرح ذلیل کروا رہا تھا کیا جائے کہ اب اسے اس شخص سے محبت ہوئی تھی جس کا مزاج اور اصول اس پر واضح تھے مگر وہ اس کی الفت سے دستبردار ہونے کا اختیار نہ رکھتی تھی۔ وہ بہت دلگرفتہ سی اس کے پاس سے لوٹی تھی اس کا آخری فقرہ اسے رُلا گیا تھا۔

"عریش آپ انا اور خود داری کی تشریح سے بے شک ناواقف ہوں مگر میں اپنی عزت پر اٹھی انگلی برداشت نہیں کر سکتا...... آئندہ اس بات کا خیال رکھیے گا۔"

وہ کتنے ہی دن گم صم سی رہی تھی، اس سے سامنا ہونے پر اس کا کہا حرف حرف ذہن کے سناٹے میں شور مچانے لگتا۔ کیا وہ اس کے نزدیک اتنی بے وقوف اور بے حمیت تھی کہ اس بری طرح اس نے اس کی دل شکنی کی تھی، وہ اس سے ناراض تھی مگر مقابل منانے والا نہ ہو تو خود ہی ماننا پڑتا ہے وہ بھی اپنی جگہ درست تھا اگر وہ خود اس کی راہ میں آ کر اتنے کھلے لفظوں میں اپنی چاہت کا احساس نہ دلاتی تو شاید وہ کبھی بھی اتنی شدت سے اسے رد نہ کرتا اس نے سوچا تھا اور بہت دنوں سے اپنی تذلیل کے احساس سے اندر جو چبھن ہوتی تھی اسے تھپکی دے کر سلا دیا۔ اسے اس کی بے

گانگی کا دکھ تھا مگر اس نے سوچا اس کا جذبہ خالص ہے تو کبھی نہ کبھی ضرور اس کے دل پر اثر انداز ہوگا۔

کہو وہ چاند کیسا تھا
جدھر سب کچھ لٹا آئے
جدھر آنکھیں گنوا آئے
کہا سیلاب جیسا تھا، بہت چاہا کہ بچ نکلیں
مگر سب کچھ بہا آئے
کہو وہ ہجر کیسا تھا
کبھی چھو کر اسے دیکھا
تو تم نے کیا بھلا پایا
کہا بس آگ جیسا، اسے چھو کر تو اپنی روح
یہ تن من جلا آئے
کہو وہ چاند کیسا تھا
فلک سے جو اتر آیا
تمہاری آنکھوں میں بسنے
کہا وہ خواب جیسا تھا نہیں تعبیر تھی اس کی
اسے اِک شب سلا آئے
کہو وہ عشق کیسا تھا
بنا سوچے بنا سمجھے
بنا پرکھے کیا تم نے
کہا تتلی کے رنگ جیسا بہت کچا انوکھا سا
جبھی اس کو بھلا آئے
کہو وہ نام کیسا تھا
جسے صحراؤں اور چنچل ہواؤں پر لکھا تم نے
کہا بس موسموں جیسا
نہ جانے کس گھڑی کس پل
کسی رو میں مٹا آئے

اس کے اندر طوفان اٹھا تھا وہ اپنے سرکش آنسو سب سے چھپانے کے لیے باہر آگئی۔ خنک شام کے لبوں پر نارنجی مسکان کھل رہی تھی چار سو خاموشی چھائی تھی فضا میں ٹھنڈک کا احساس اور ہوا خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔ وسیع و عریض صحن میں چنبیلی، لیموں اور ایک کیلے کا درخت تھا لیموں کے پیڑوں کے پاس کین کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک پر وہ بیٹھ گئی موسم بہت خوب صورت تھا مگر اس کے اندر کا موسم باہر کے موسم کی خوب صورتی اور دلکشی دیکھنے سے محروم تھا۔

''محبت زندگی کا سب سے خوب صورت رنگ ہے اور جس رنگ اور جس محبت میں محبت نہ ملے تو وہ محبت بھی ادھوری سی لگتی ہے، وہ رنگ بے رنگ سا لگتا ہے، ایک ایسی ہی ادھوری اور بے رنگ محبت ہے میری۔'' اس کے اندر سے سسکی نکلی۔

''ناجیہ سچ کہتی ہے سچی محبت کرنے والے بہت کم لوگ ہیں دنیا میں اور اتنے ہی کم اس سچی محبت کی قدر کرنے والے۔ عورت کی محبت کو اس مرد کے معاشرے میں ہمیشہ شک کے ترازو میں تولا جاتا ہے، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مرد اگر محبت کرے تو اس کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور اگر عورت محبت کر بیٹھے تو گناہ گار کہلائے۔ میں نے زندگی میں جو چاہا وہ مجھے ملا جس چیز کی بھی خواہش کی وہ پوری ہوئی مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جسے میں نے سب سے بڑھ کر چاہا جس کی سب سے زیادہ تمنا کی وہی مجھے نہ مل سکا۔'' بچپن سے وہ اپنی ہر ضد منواتی آئی تھی مگر آج وہ ہار گئی تھی۔

ناجیہ اس کو ڈھونڈتے ہوئے صحن میں آگئی۔ اس کو یوں شکستہ حال دیکھ کر وہ بھی دکھی ہوگئی۔ عریش نے آنسو چھپانے کے لیے چہرہ جھکا لیا۔

''عریش سنبھالو خود ...... یہ تم نے کیا حالت بنالی ہے اپنی...... کوئی دیکھے گا تو کیا سمجھے گا سب کتنا پریشان ہوں گے۔''

''ناجیہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے کچھ مت دینا میں کبھی کچھ نہیں مانگوں گی بس تم میرے آس پاس رہنا میرے لیے اتنا ہی بہت ہوگا تو جانتی ہو اس نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ تم جذباتی ہو رہی ہو، محبت کوئی کھیل نہیں ہے کہ میں چار دن کے لیے تم سے کھیل لوں، وہ سمجھتا ہے میں اس سے کھیل، کھیل رہی ہوں، محبت کوئی کھیل نہیں ہوتا اور مجھ سے زیادہ محبت کو کون جان سکتا ہے یہ تو ایک نظر کا کمال ہے جو ایک پل میں ایک عام سے انسان کو خاص بنا دیتی ہے، وہ میرے لیے کتنا اہم ہے اس کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں۔'' وہ انتہائی کرب کے عالم میں بول رہی تھی۔

''میرے لیے اس کے بغیر زندگی گزارنا سزا سے کم نہیں ہوگا۔'' اس کا لہجہ بھیگا سا تھا وہ اب رو رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر ناجیہ کا شدت سے دل چاہا کہ کاش داؤد مصطفیٰ آج اگر اس کو اپنے لیے روتا دیکھ لے تو اس کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچے بھی نہ۔

''عریش میں تمہارے جذبات کو سمجھتی ہوں، یہ تو داؤد ہی جذبات سے عاری ہے جو تمہاری محبت کی قدر نہ کر سکا۔ اب اس کے لیے آنسو بہا کر خود کو ضائع مت کرو۔'' اس نے گویا تسلی دی۔ ''چلو اندر کوئی آگیا تو اپنے رونے کی کیا وجہ بتاؤ گی، چلو شاباش!'' وہ اس کو کندھے سے پکڑ کر اٹھانے لگی اور وہ ناجیہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ ناجیہ کی ساری نصیحتیں بھلا چکی تھی اب کمرے میں اس کی دبی دبی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ناجیہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''پلیز عریش چپ ہو جاؤ۔'' وہ بہت مشکل سے کہہ پائی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بے وقوف لڑکی کو کیسے دلاسا دے مگر وہ بدستور روتی رہی۔

☆☆☆

داؤد آفس سے لوٹا چینج کر کے وہ لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں عظمیٰ بیگم اس کے لیے چائے لے آئیں۔

''تھینکس امی۔'' اس نے مسکرا کر کپ تھاما۔ عظمیٰ بیگم مسکرا دیں۔ وہ ایک بار پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''داؤد مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' انہوں نے تمہید باندھی۔

''جی کہیں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

''بیٹا میں چاہتی ہوں کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے تو میں سوچ رہی ہوں کہ شاہدہ سے عریش کو تمہارے لیے مانگ لوں مجھے تو وہ بچی بہت پسند ہے۔''

''مگر امی میں نے اس کے بارے میں کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔''

''تو اب سوچ لو۔''

''امی آپ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔''

''کیوں بیٹا، عریش میں کیا برائی ہے؟ اچھی لڑکی ہے۔'' وہ تشویش آمیز لہجے میں بولیں۔

''امی وہ پاگل سی لڑکی ہے۔ ضدی اور جذباتی بھی ہے اور حد سے زیادہ بچپنا بھی ہے اس میں۔ آپ پلیز اس کو رہنے دیں۔''

''شروع میں سب لڑکیاں ضدی اور جذباتی ہوتی ہیں۔'' انہوں نے اس کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''مگر امی مجھے ایسی لڑکیاں پسند نہیں ہیں، آپ

میرے...... لیے کوئی سنجیدہ اور سلجھی ہوئی لڑکی دیکھیں۔'' اب انہیں کیا بتاتا کہ اس کی بے باکی اس کو پسند نہیں آئی۔

''مگر بیٹا میں نے تو تمہاری بھابی سے بات بھی کرلی ہے، کیا پتا اس نے شاہدہ سے بھی ذکر کردیا ہو۔'' وہ فکرمندی اور تشویش سے بولیں۔

''امی آپ بھی کیا کرتی ہیں، مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔'' وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ عظمیٰ بیگم ایک دم جذباتی ہوکر رونے لگیں۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ میرا بیٹا میری بات ماننے سے انکار کردے گا۔ مجھے تو بہت مان تھا تم پر کہ تم میری بات نہیں ٹالو گے اور تم خود تو کہتے تھے کہ امی کی پسند سے شادی کروں گا، اب کیا ہوا؟'' انہوں نے شکایت بھری نظروں سے اس کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے، میں یہ شرمندگی سہہ لوں گی۔ تم بتاؤ کون پسند ہے تمہیں، کل لے چلنا مجھے۔'' وہ ناراض لہجے میں اس سے بولیں اور اٹھ کر جانے لگیں تو داؤد نے لپک کر ان کو کندھوں سے تھام کر پھر سے بٹھادیا۔

''امی پلیز، کیسی باتیں کرتی ہیں، میں آپ کا مان توڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں ہے، میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ آپ عریش کے علاوہ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں مگر اگر آپ نے بھابی سے بات کرلی ہے تو ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے ماں کو تسلی دی۔ ''چلیں اب مسکرادیں۔''

''جیتے رہو میرے بچے، مجھے تم پر ایسے ہی تو مان نہیں ہے۔ مجھے اپنے بچے کی فرمانبرداری پر بھروسا تھا۔'' وہ اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔ ''ہمیشہ خوش رہو۔'' وہ بھی ماں کو خوش دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا۔

☆☆☆

دن اسی طرح بے کیف گزر رہے تھے کبھی کبھی بے چینی بہت بڑھ جاتی، اس کو اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا کوئی راہ نہیں ملتی تھی۔ اس کے سجدے طویل ہوگئے تھے۔

''یا اللہ بس یہ بے چینی دور کردے میرے من کی بے چینی میرے اندر کی وحشت کم کردے۔'' اس نے کہیں پڑھا تھا کہ بے چینیاں تو روح کی زکوٰۃ ہوتی ہیں اور اضطراب من کا خراج اس سے انسان کو بھاگنا نہیں چاہیے اگر تپتی اور جھلستی زمین پر دو چار چھینٹے پانی کے پڑجائیں تو تپش اور حبس اور بڑھ جاتا ہے مگر اس پر تو ایک بوند بھی نہ برسی تھی اور اس کے باوجود اس حبس میں اس سے سانس لینا دوبھر ہوگئی۔ اس نے گیلی آنکھوں سے سامنے دیکھا تو ناجیہ کھڑی تھی۔

''عریش تمہاری خدا نے سن لی، تم ڈرائنگ روم میں آجاؤ داؤد کی امی آئی ہیں تمہارا ہاتھ مانگنے۔'' وہ اس کی پشت تھپتھپا کر گرمجوشی سے بولی۔ عریش نے حیرت سے ناجیہ کی طرف دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں بنو...... جلدی سے تیار ہوکر آؤ تمہارا ہی انتظار ہورہا ہے۔'' اس نے ماحول کی افسردگی کو کم کرنے کی کوشش کی، عریش بھی حیرت سے باہر نکلی آنسو صاف کیے اور دونوں ایک دوسرے کو گلے لگا کر مسکرادیں۔

آنٹی نے منگنی پر کوئی فنکشن وغیرہ نہیں کیا۔ بس گھر کے افراد ہی تھے البتہ بھائیوں نے تصویریں ضرور بنائی تھیں۔

''عریش کی شادی کے بعد ہم کتنے تنہا ہوجائیں گے ناں؟'' منگنی کی تصویریں دیکھتے ہوئے علی نے کہا اور وہ یہ بات پچھلے چار دن میں بلا مبالغہ دسویں بار کہہ رہا تھا پہلے تو سب دکھی ہوتے لیکن اب بابا نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ عریش دور نہیں جارہی اور دوسری بات یہ کہ تم گھر پر ٹکتے ہی کب ہو جو عریش کی موجودگی یا غیر موجودگی سے تمہیں کوئی فرق پڑے گا۔'' علی کھسیانا سا ہوکر چپ ہوگیا اور پھر کافی دیر تک چپ ہی رہا۔

''ایک بیٹی جارہی ہے، میں دوسری لانے کا سوچ رہی ہوں۔'' امی نے وقاص بھائی کی طرف دیکھا اور وقاص بھائی نے مشکوک نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔

''کیا ارادے ہیں امی؟''

''میرا ارادہ تو بہو لانے کا ہے باقی تم اور تمہارے ابو کہو تو میں کل ہی ناجیہ کا ہاتھ مانگ لوں تمہارے لیے۔'' وقاص تو دل و جان سے راضی تھا یہ تو سب کو ہی معلوم تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی بیگم صاحبہ، آپ اپنے بیٹے کی رضامندی لے لیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ سب کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' انہوں نے محفل میں بیٹھے جملہ حاضرین سے بھی دریافت کیا۔

''قطعاً نہیں۔'' سب سے پہلے علی بولا۔

''اور مجھے تو سب سے برا رشتہ ہی بھابی کا لگتا ہے۔'' شہزاد بھی کیوں پیچھے رہتا۔

''کیوں؟'' وقاص نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ آنے کے ساتھ ہی بھابی صاحبہ قبضہ جماتی ہیں بھائی جان پر۔ گھر بھر کو اپنی سلطنت سمجھنے لگتی ہیں اور سب سے زیادہ تو بے چارے دیور ہی ان کے عتاب کا نشانہ بنتے ہیں۔'' علی نے تفصیلی تجزیہ پیش کیا تھا۔

''بالکل سو فیصد درست بات کی ہے علی نے۔'' شہزاد نے شاید زندگی میں پہلی بار علی کی کسی بات کی تائید کی تھی۔ ''ہر بات میں ٹانگ اڑانا اِدھر کی بات اُدھر لگانا افرادِ خانہ کو آپس میں لڑانا بھابیوں کے فیورٹ مشغلے ہوتے ہیں۔'' شہزاد نے تائیدی بیان جاری کیا۔

''چپ کرو شیطانوں، میرے بیٹے کو تنگ مت کرو وہ ایسی نہیں ہے۔'' امی نے کہا تو وقاص بھائی مسکرادیے۔

☆☆☆

''کیا بات ہے عریش ڈیئر! میں دیکھ رہا ہوں آج کل تم کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہو۔'' وہ سب کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی جب شہزاد نے اچانک اسے مخاطب کیا وہ جیسے ایک دم چونکی۔

''ہاں نہیں تو...... ٹی وی تو دیکھ رہی ہوں۔''

''اچھا تو پھر بتاؤ یہ آنٹی کیوں لڑ رہی ہیں۔'' اس نے ڈرامے میں موجود آنٹی کے بارے میں پوچھا اور ٹی وی آف کردیا۔ اس بار وہ واقعی سٹپٹا گئی۔ وہ پتا نہیں کتنی دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وقاص، علی اور ناجیہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''کیا ہے بھئی، ٹی وی چلاؤ کوئی بات نہیں ہے۔'' سب کی توجہ اپنی طرف مبذول پاکر وہ کچھ روہانسی ہوگئی۔

''عریش تم پریشان ہو؟ دیکھو اگر کوئی بات ہے تو ہم سے شیئر کرو۔'' علی نے اسے مخاطب کیا۔

''اُفوہ کیا مسئلہ ہے بھئی...... کوئی بات ہوگی تو شیئر کروں گی نا، تم سب تو پیچھے ہی پڑ گئے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی ایک دم ہی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔ ''میں جارہی ہوں ابو کے کپڑے پریس کرنے ہیں۔'' وہ آنکھیں جھپک کر آنسو روکتی فوراً ہی جانے کے لیے اٹھی تھی وقاص نے جلدی سے اسے ہاتھ پکڑ کر روکا پھر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

''کپڑے علی پریس کر دے گا تم وہ بات بتاؤ جس کی وجہ سے پریشان ہو۔'' وقاص نے نرمی سے کہا۔

''ہاں ہاں میں کر دوں گا۔'' علی فوراً راضی ہوگیا...... اس نے مدد طلب نظروں سے ناجیہ کو دیکھا وہ ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ امی نے اس کو بلالیا۔

''کیا یونیورسٹی میں کوئی مسئلہ ہے؟'' علی نے اندازہ لگایا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ آنسو اب گال پر پھسل رہے تھے۔

''کسی نے ڈانٹا ہے، کسی دوست سے لڑائی ہوگئی ہے؟'' وہ سب باری باری اس سے وجہ پوچھ رہے تھے اور وہ نفی میں سر ہلاتے ہلاتے ایک دم وقاص بھائی کے شانے سے سر ٹکا کر بری طرح رودی۔

''عریش کیا بات ہے یار؟'' وقاص نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کیے، اس کے اس طرح سے رونے سے سب ہی بوکھلا گئے تھے علی فوراً ہی پانی لے کر آ گیا۔ اس طرح ہچکیوں سے تو وہ کبھی نہیں روئی تھی۔

''عریش کیوں پریشان کر رہی ہو۔'' شہزاد نے اسے کندھوں سے پکڑ کر وقاص سے الگ کیا۔

''اچھا مت بتاؤ پر یوں ہلکان تو مت ہو، پانی پی لو۔'' علی نے تسلی دی اور پانی کا گلاس تھمایا۔

''میں امی کو بلا رہا ہوں۔'' شہزاد اٹھتے ہوئے بولا اور یہ دھمکی کارگر رہی۔

''نہیں پلیز...... امی کو مت بلاؤ۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

''جب تک تم وجہ نہیں بتاؤ گی ہم کیا کر سکتے ہیں یار۔''

''افوہ...... میں سمجھ گیا۔'' شہزاد ایک دم سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا سب لوگوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا عریش نے بھی متوحش ہو کر اسے دیکھا جانے وہ کیا سمجھا تھا۔

''تمہیں وہی والا رونا آ رہا ہے نا جو لڑکیوں کو بابل کی دہلیز چھوڑتے ہوئے آیا کرتا ہے۔'' شہزاد نے شرارت سے پوچھا اس نے سر جھکا دیا تردید کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

''یہ بات تھی۔'' علی نے خفگی سے آنکھیں دکھائیں۔ ''جان نکال دی تم نے لڑکی۔'' وقاص نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

''یار ابھی تو دو ماہ باقی ہیں، تمہیں ابھی سے ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں اس طرح تو تم آدھی رہ جاؤ گی۔''

☆☆☆

شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں سب رشتے دار جو دوسرے شہروں میں مقیم تھے وہ بھی پہنچ چکے تھے۔ گھر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی ہر کوئی جلدی میں تھا کسی کا دوپٹا نہیں مل رہا تھا تو کسی کی میچنگ چیزیں...... ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا۔ مہندی کی تقریب مشترکہ تھی اس لیے مہمان بہت زیادہ تھے۔ تقریب کا اہتمام گھر میں کیا گیا تھا، لائٹنگ اور فلورل ڈیکوریشن مکمل تھی۔ اسٹیج مہندی کی رسم کے لحاظ سے سجایا گیا تھا اس کو اسٹیج پر داؤد کے برابر بٹھایا گیا تو اس کو یہ سب ایک خواب کے مانند لگا سات سہاگنوں نے اس کو مہندی لگائی۔ کزنز کی چھیڑ چھاڑ، مذاق، شوخ و شرارتی جملے اس کو آسمان کی بلندیوں پر لے جا رہے تھے۔

مہندی کی تقریب بخیر و خوبی انجام کو پہنچی۔ عریش نے شادی پر اپنی تمام فرینڈز کو مدعو کیا

تھا، آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی پھر اسے یہاں سے چلے جانا تھا اس کی امی کچھ دیر پہلے اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں وقاص بھائی نے زبردستی اٹھا کر سونے بھیجا تھا کیونکہ ان کی طبیعت رونے سے خراب ہو رہی تھی۔

بھائی جو اس کو ہر وقت شادی کے نام پر چھیڑتے رہتے تھے ان کی بھیگی بھیگی آواز بہن کی جدائی میں ضبط سے سرخ آنکھیں عریش کا دل ابھی بھی بھرا ہوا تھا۔ ان کی محبت سے بھری آواز سن کر اور بھی رونا آ گیا۔

اسے داؤد سے ملنے کی خوشی بھی تھی مگر ماں باپ اور بھائیوں سے بچھڑنے کا دکھ اس خوشی پر غالب تھا۔ رخصتی کے وقت وہ اتنا پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سب ہی پریشان ہوگئے۔

بیڈ روم اتنی خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا کہ سب نے ہی تعریف کی، وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ رکھے گاؤ تکیے...... کے سہارے بیٹھی تھی۔ داؤد کا رویہ نارمل تھا، عریش کی جھکی پلکیں لرز رہی تھیں۔ داؤد نے بڑے غور سے اس کی پلکوں کا لرزتا رقص دیکھا۔ وہ اتنی خوب صورت تو نہیں تھی مگر دلہن بن کر اس پر بہت روپ آیا تھا۔

☆☆☆

ولیمے کے بعد وہ دونوں عریش کی امی کے گھر آئے ہوئے تھے عریش کتنی دیر امی سے لپٹی رہی، یہ اس عریش سے یکسر اجنبی لگ رہی تھی جو رخصتی کے دن دھواں دھار رو رہی تھی۔ داؤد کی وہ دیوانی تھی اور کبھی کبھی داؤد اس کی اس قدر دیوانگی سے بیزار بھی ہو جاتا مگر اس کے لیے یہ سب اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں وہ تو اس بات پر ہی بہت خوش تھی کہ داؤد اب اس کا ہے۔ اس نے جو چاہا وہ پا لیا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ انسان جس کی خواہش کرے جس سے محبت کرے اس کا ساتھ بھی مل جائے تو زندگی کتنی سہل ہو جاتی ہے آج کل وہ بھی اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھی۔

عریش گیلے بال سلجھا رہی تھی، داؤد بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ٹانگیں پھیلائے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ عریش بلیک کلر کی خوب صورت اے لائن لانگ شرٹ پہنے ہوئے تھی کپڑوں کی ہم رنگ چوڑیاں لائٹ سا میک اپ کیے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ داؤد بھی کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''چائے تو پلا دو۔'' اس کی نظریں ملنے پر اس نے چائے کا کہہ دیا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی چائے بنانے کچن میں آ گئی۔

☆☆☆

صبح دیر تک وہ سوتی تھی مگر اب وہ صبح جلدی اٹھتی اپنے ہاتھوں سے داؤد کے لیے ناشتا بناتی۔ پھپھو جب تک بچوں کو اسکول بھیج چکی ہوتیں نوید پھوپا جنہیں اب وہ بھائی کہتی تھی آفس دیر سے جاتے تھے۔

وہ اپنا اور داؤد کا ناشتا بناتی، داؤد کے جانے کے بعد آنٹی کے لیے ناشتا بناتی' وہ دیر سے ناشتا کرتی تھیں اور وہ پھر سے سو جاتی اور گیارہ بجے اٹھتی۔

وہ پھپھو کے منع کرنے کے باوجود... سارا کام ان کے ساتھ مل کر کرتی تھی۔ زندگی آج کل بہت خوب صورت لگنے لگی تھی۔

☆☆☆

عریش سو کر اٹھی تو آسمان پر کالے بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ موسم بے حد رومینٹک ہو رہا تھا، اس موسم میں ایک دم در

آنے والی خوب صورتی نے اسے پُرجوش کر دیا تھا، کچن میں آئی تو پھپھو پکوڑے تل رہی تھیں پکوڑے بن گئے تو عریش نے چٹنی بھی بنائی چائے دم پر تھی۔
وہ سب کچھ اٹھا کر لان میں آگئی جہاں سب موجود تھے بس داؤد کی کمی تھی۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑنا شروع ہوگئی تھی کین کی کرسیوں پر بیٹھ کر سائبان تلے انہوں نے چائے کے ساتھ پکوڑے کھائے۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ سب اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔

اتنا خوب صورت بھیگا بھیگا موسم تھا اس کے خیالات کی رو داؤد کی طرف بہنے لگی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے آجائے وہ اس طرح کے موسم کی شروع سے ہی دیوانی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کر رہے ہوں گے وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔

داؤد دو دن سے اسلام آباد گئے تھے کل آنا تھا۔ داؤد کی یاد اس اس موسم میں بری طرح حملہ آور ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھا اس میں داؤد کی کمی کا احساس شدت سے جاگا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا کہ داؤد کو برسے موسم کے حوالے سے کوئی خوب صورت پیغام بھیجے۔

رات گیارہ بجے داؤد کی آمد پر چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ ہلکی بارش اب بھی جاری تھی، اس نے بیڈروم کا دروازہ کھولا تو عریش باتھ روم سے نکل رہی تھی۔ داؤد کو دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

”آپ آگئے، آپ نے تو کل آنا تھا؟“ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اس کے آنے کی خوشی سے۔

”واپس چلا جاؤں؟“

”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ اس کا مذاق سمجھ کر مسکرا کر بولی۔ ”میں نے آپ کو بہت مس کیا۔“ جواباً داؤد نے کسی بے تابی کا اظہار نہیں کیا بس مسکرا دیا۔

شادی کے دو ماہ بعد ہی ڈاکٹر نے اس کو ماں بننے کی نوید سنائی تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی اور بار بار اپنے رب کا شکر ادا کرتی۔

ڈاکٹر سے واپسی پر داؤد نے خوب ڈھیر ساری مٹھائی لی، اس کی غیر معمولی خوشی سب نے ہی محسوس کی تھی، وہ شادی پر اتنا خوش نہیں تھا جتنا اب تھا۔ جس انداز میں اس نے سب کو یہ خوش خبری سنائی تھی وہ انداز دیدنی تھا، ایک نظر سب پر ڈال کر وہ عریش کا چہرہ تکنے لگا سب بہت خوش تھے اس کے کانوں میں اپنے بھائیوں کی آوازیں تھیں خوشی سے معمور چہکتی آوازیں۔

”عریش، میں خالہ بن جاؤں گی۔“ یہ تاجیہ تھی۔

”کمرے میں میری تصویر لٹکا لو صبح شام درشن کرنا، میرا بھانجا میرے جیسے ہونا چاہیے۔“ علی بولا۔

”نہیں میرے جیسا ہوگا۔“ شہزاد کیوں پیچھے رہتا۔

☆☆☆

باہر ہونے والی چہل پہل سے اس کا سویا سویا ذہن جاگ اٹھا مندی مندی آنکھوں سے اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا، ساڑھے نو بج رہے تھے سرہانے پڑا دوپٹا کندھے پر ڈالا جوتے پاؤں میں پھنسا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی یونہی بکھرے بالوں سمیت منہ ہاتھ دھوئے بغیر وہ باہر نکل آئی۔ زندگی پوری طرح رواں دواں تھی سب اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے پھپھو.... اس پر نظر پڑتے ہی لپک کر آئیں۔

”اٹھ گئیں، منہ ہاتھ دھولو۔ میں گرم گرم ناشتا بناتی ہوں۔“ وہ بولتے بولتے اس کے حلیے کو بغور نوٹ کر رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے پھپھو مگر ناشتا بس ہلکا پھلکا ہونا چاہیے، میں کچن میں ہی کرلوں گی۔“ اس نے واش روم کا رخ کیا۔

وہ ناشتا کر رہی تھی کہ داؤد لمبی روش عبور کر کے عین اس کے سامنے آرکا اور ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ عریش کو حیرت ہوئی کیونکہ وہ اس وقت آفس میں ہوتا تھا اور وہ اپنی حیرت کو چھپا نہ سکی۔

”آپ آفس نہیں گئے؟“

”گیا تھا، موبائل بھول گیا تھا وہی لینے آیا ہوں۔“ عجلت بھرے لہجے میں بولا۔

”اوہ، آپ بیٹھیں میں لاتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”نہیں، تم بیٹھو کھانا کھاؤ میں خود لے لیتا ہوں۔“ اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس کو جانے سے روکا۔

عریش کو حیرت ہوئی کہ آج کل وہ اس پر واقعی بہت مہربان تھا۔ اس کا وہ خیال رکھتا تھا یا نہیں اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی مگر وہ اپنے بچے کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اصولاً تو اس کو یہ سب اچھا لگنا چاہیے تھا مگر پتا نہیں کیوں؟ یہ سب عجیب سے دکھ میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسے لگتا کہ وہ اس کا کبھی تھا ہی نہیں، اس نے تو کبھی اس سے محبت کے دو لفظ نہیں بولے تھے مگر جب سے عریش نے اسے باپ بننے کی خوش خبری دی تھی تب سے اس کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی تھی، اس کا بے حد خیال رکھتا مگر اس کو لگتا وہ اس کا نہیں اپنے بچے کا خیال رکھتا ہے، اسے عریش کی نہیں اپنی اولاد کی پروا تھی۔

آئیڈیل

آئیڈیل ایسا لفظ ہے جو سماعت کو تو بہت اچھا لگتا ہے مگر اس لفظ کے ساتھ اگر انتہا پسندی بھی شامل ہو جائے تو پھر اس لفظ کی خوبصورتی مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ انتہا پسندی غیر حقیقت پسندانہ سوچ کی ترجمان ہے کیونکہ ایسا آئیڈیل دنیا میں کوئی نہیں، کہیں نہیں جو انسان کی خواہشات کے عین مطابق ہو، اس عالم رنگ و بو میں بے عیب صرف ایک ذات ہے ورنہ ہر شے میں کہیں نہ کہیں کوئی ظاہری یا مخفی کمزوری ضرور ہوتی ہے، قدرت جب اپنی صناعی میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی رکھنے پر مُصر ہے تو پھر انسان یقینی طور پر ایسے کسی آئیڈیل کی تلاش میں زندگی بھر بھٹکتا ہی رہے گا یا پھر کسی موقع پر اسے خوش فہمی ہو جائے گی کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے۔

مرسلہ: رخسانہ امجد، ملکوال

وہ اس پر یہ سب ظاہر نہیں کرتی تھی مگر سارا دن اس کا یہی سوچتے ہوئے گزرتا کہ وہ اس کے ساتھ ایک سمجھوتے کی زندگی گزار رہا ہے۔ اب بھی اگر وہ خوش ہے تو اپنے بچے کے لیے ورنہ وہ تو اس کی زندگی میں زبردستی شامل ہوگئی ہے۔ دن رات ایسی ہی سوچوں نے اس کو چڑچڑا بنا دیا تھا، سارا دن کمرے میں رہتی، داؤد کا دل چاہتا وہ اس سے آنے والے مہمان کے حوالے سے باتیں کرے، اس کے لیے شاپنگ کرے اس کے ساتھ جائے مگر وہ میرا دل نہیں چاہ رہا شاپنگ کا۔ اگر وہ باتیں کرتا تو اس کو نیند آنے لگتی۔ اس کا رویہ دیکھ کر داؤد کبھی کبھی پریشان بھی ہو جاتا مگر اس کی حالت دیکھ کر خاموش ہو جاتا کہ ڈاکٹر کے مطابق ایسی حالت میں عورت چڑچڑی ہو جاتی ہے۔

داؤد اس سے جس گرم جوشی کی توقع کر رہا تھا وہ مفقود تھی۔ وہ اٹھ کر اوپر آ گئی موسم بدل سا گیا تھا، سیاہ بادل گھر کر آرہے تھے ہواؤں میں مستی اور نمی

تھی۔ شاید دور کہیں بادل کھل کر برسے تھے۔ ایسے موسم کی وہ دیوانی ہوا کرتی تھی اب وہ ریلنگ پر دونوں کہنیاں ٹکائے ذرا سا سر اٹھا کر بادلوں کو دیکھتے ہوئے داؤد کے رویّے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب داؤد نے عقب سے اسے اپنے حصار میں لے لیا عریش کو اس کی شدتوں سے اب الجھن ہو رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟" اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ بھی تو بہت بدل گئے ہیں، اپنے بچے کے لیے نا، ایسا کیوں ہے؟"

"پاگل...... کیسی باتیں کرتی ہوں، میں تمہارا خیال نہیں رکھوں گا تو پھر کس کا رکھوں گا؟"

"میرا نہیں اپنے بچے کا۔"

"میں تمہارا پہلے خیال نہیں رکھتا تھا کیا؟" اس نے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

"اب اس لیے زیادہ خیال رکھتا ہوں کہ یہ مرحلہ بہت دشوار ہے اور تم نازک سی ہو۔" اتنی عجیب تعریف پر وہ جھینپ سی گئی۔

"مجھے امی کے گھر جانا ہے۔" داؤد نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں تو ہو آیا کرو جب دل چاہے۔"

"مگر میں وہاں کچھ دن رہنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔" وہ کل سے امی کی طرف تھی کن جتنوں سے اس نے داؤد سے آنے کی اجازت لی تھی۔ تنگ آ کر وہ لڑ پڑی تھی۔

"وہ میرے اپنے ہیں، آپ کو کیا لگتا ہے وہ میرا خیال نہیں رکھیں گے۔" آنٹی اور پھپو کی بے تحاشا توجہ اور محبت نے اسے تقریباً مفلوج کر دیا تھا داؤد تو دن بھر آفس [illegible] تو مگر یہ دونوں خواتین اسے زچ کر دیتی تھیں، یہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ، یہاں بیٹھو، وہاں کھڑی نہ ہو، وہ حقیقتاً وہاں سے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈلیوری کے وقت عریش کی حالت بہت خراب تھی ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔ "ماں اور بچہ دونوں میں سے کسی ایک کی جان بچائی جا سکتی ہے، اللہ سے دعا کریں۔" اس کی حالت بہت سیریس تھی امی بے تحاشا رو رہی تھیں۔ داؤد اضطراری انداز میں کاریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ وہ رات بھر سویا نہیں تھا اب بھی وقاص بھائی نے زبردستی اسے گھر بھیجا تھا کہ کچھ دیر آرام کر لے۔ وہ کمرے میں آیا وضو کر کے جائے نماز بچھا کر نفل پڑھنے لگا، وہ سجدے میں گر گرا اپنے رب سے اس کی سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"یا رب میں تجھ سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں تو اس کی زندگی دے، میرے رب تو میرے گھر کو آباد رکھنا۔" وہ گہری نیند میں تھا جب موبائل کی بیپ بجی۔ اس نے وقت دیکھا صبح کے نو بج رہے تھے جانے کس وقت اس کی آنکھ لگی تھی۔ دوسری طرف وقاص تھا اس کی چہکتی اور نمناک آواز سنائی دی۔

"داؤد، عریش اب خطرے سے باہر ہے اور میرا بہت پیارا سا بھانجا ہوا ہے۔"

وہ اسپتال چلا گیا اس کی حالت دیکھ کر وہ اب مطمئن ہو گیا تھا۔ امی اس کے سرہانے پڑی چیئر پر بیٹھی اس پر کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

"آنٹی، آپ اب گھر جائیں، میں ہوں یہاں آپ کچھ آرام کریں۔" انہیں زبردستی بھیج کر وہ سرہانے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

کیسی طبیعت ہے؟"

"کیسی طبیعت ہے اب؟" اس نے پھر سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر کھڑکی کھولنے لگا۔ کمرا یکدم روشنی میں نہا گیا۔

"آپ نے ابھی تک بچے کو نہیں دیکھا آپ تو بہت ایکسائٹڈ تھے اس کے لیے۔" وہ کچھ متعجب سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری جو حالت ہوئی اس کے بعد مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔" وہ عین اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔

"میں سمجھی اپنے بیٹے کی فکر ہو گی آپ کو۔" وہ شکوہ کناں لہجے میں گویا ہوئی۔

"بیٹے سے رقابت؟"

"جی نہیں۔"

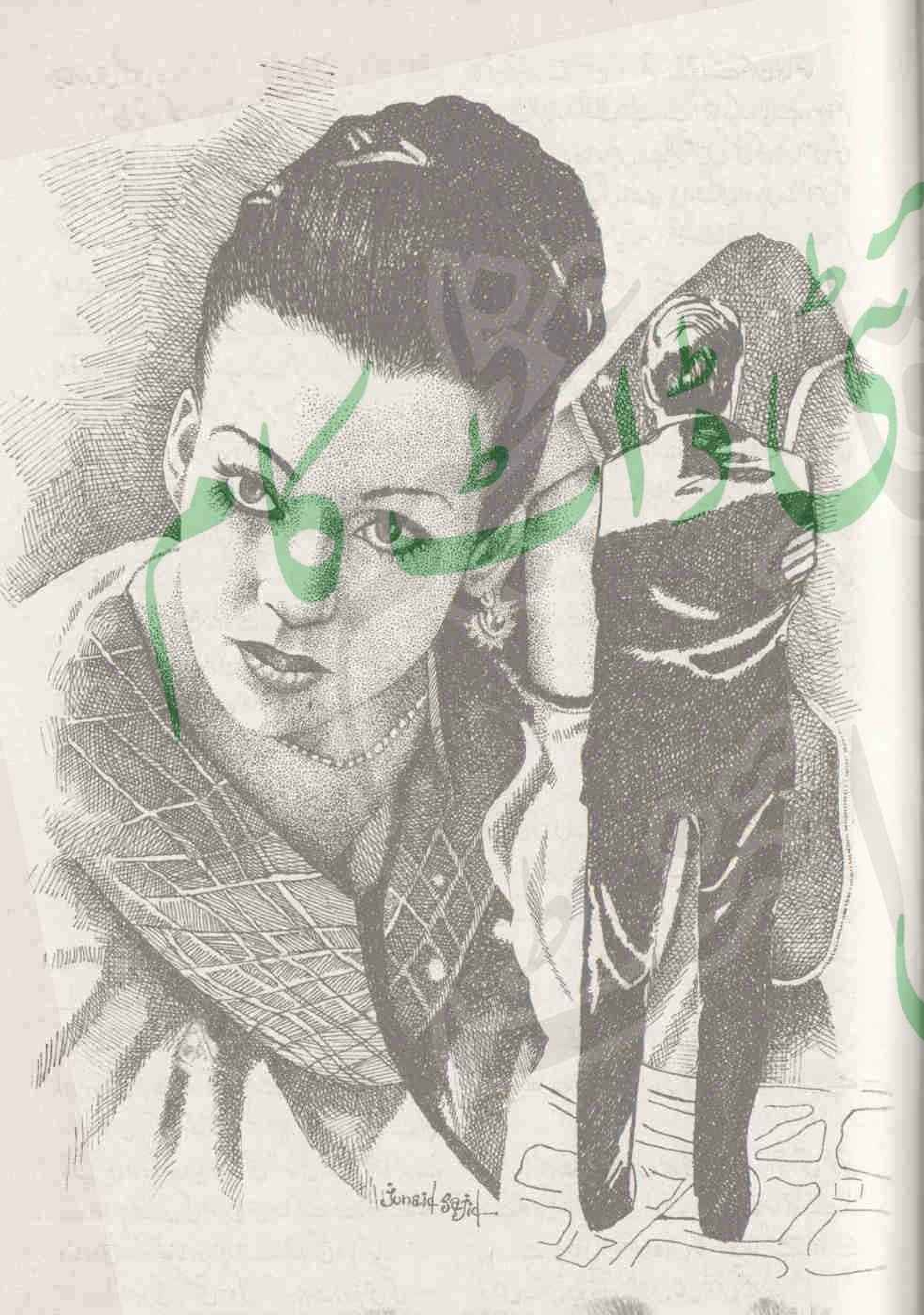
"پاگل، یہ تحفہ بھی تو تم ہی نے مجھے دیا ہے۔" وہ جھک کر بچے کو دیکھنے لگے۔

"تمہیں پتا ہے علی اور شہزاد آپس میں لڑ رہے تھے علی کہہ رہا تھا مجھ سے ملتا ہے اور شہزاد کا خیال ہے کہ اس کی صرف ناک علی سے ملتی ہے۔ اس کی چھوٹی سی ناک کو نشانہ بنا رکھا تھا۔" داؤد نے اس کے چہرے کے تاثرات جانچے وہاں جامد خاموشی تھی، ایک طویل سانس لے کر وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"مجھے پتا ہے تم دل ہی دل میں مجھ سے ناراض ہو...... میں مانتا ہوں میں تمہیں وہ محبت اور توجہ نہیں دے سکا جو تمہارا حق تھی، اس کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں.. تب میں محبت جیسے پاکیزہ جذبے سے واقف نہ تھا مگر آج مجھے لگتا ہے کہ محبت تو انسان کی جڑوں میں ہوتی ہے اس سے کب تک میں بھاگ سکتا تھا۔ میرے متعلق غلط سوچنے کی بات ہے تو میرا خیال ہے تم اس سلسلے میں حق بجانب تھیں میرا مطلب ہے میں نے خود تمہیں ایسا سوچنے کا موقع دیا۔ شادی کے بعد تمہیں جس محبت کی ضرورت تھی وہ میں تمہیں نہ دے سکا جس کی تم مستحق تھیں میں اس سے دانستہ کوتاہ نظری کرتا رہا شاید اس لیے کہ میں اس غرور میں رہا کہ میں نے تم پر احسان کیا ہے اور اس احسان کا بدلہ یہ سمجھتا تھا کہ تم میرے گھر آ گئی ہو میری زندگی میں آ گئی ہو تو بس یہی کافی ہے۔ مجھے تم سے محبت کرنے کی ضرورت نہیں، تم سے شادی کر لی ہے یہی اس محبت کا بدلہ ہے مگر اب مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت میں احسان تو ہوتا ہی نہیں، محبت تو احسان کی قائل ہی نہیں، محبت کا بدلہ تو محبت ہوتی ہے۔ میں برا ہوں ناں؟" داؤد نے مسکراتے ہوئے عریش سے تائید چاہی تھی، وہ رو رہی تھی۔ اس کے انداز پر عریش کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

"اب ٹھیک ہے تم بس ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔" محبتوں سے منہ موڑنا اب اس قدر آسان بھی نہیں تھا اس نے داؤد کی طرف دیکھا وہ بھی محبت پاش نظروں سے اسے تک رہا تھا۔ طمانیت اور آسودہ خاطری جیسے اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

اب آگے کا سفر اس کے لیے مبہم نہ تھا، سفر کی کٹھنائیاں وہ طے کر چکی تھی اور اب ایک روشن اور چمکدار سفر اس کا منتظر تھا داؤد نے اس کے پُرسکون چہرے کو دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر مسکرا دیا۔



"صاحب جی، آپ کا انتظار کیا جارہا ہے.....مولوی صاحب بھی آگئے ہیں۔"

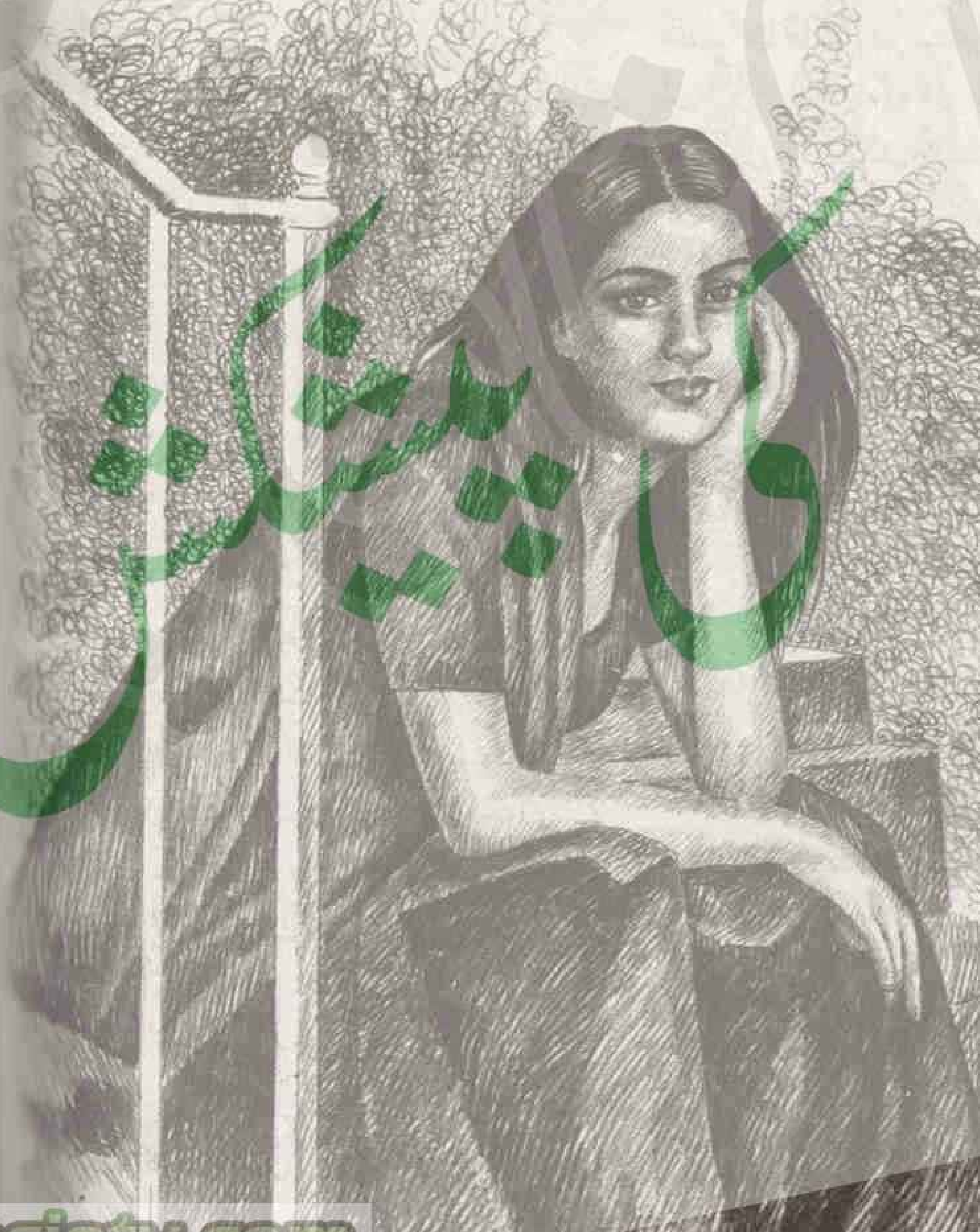
"چل میرا شہزادہ، یہاں اکیلا کیوں بیٹھا ہے آج تو تیری خوشی کا دن ہے۔ چل جا باہر چھنے (شامیانے) میں سب تیرا ہی انتظار کررہے ہیں، میں نے کہلوا بھیجا تھا کہ دولھا تیار ہورہا ہے، اب جا جلدی باہر دروازے پر برادری والے کھڑے ہیں تیرے انتظار میں۔" وہ اسے جیسے بچوں کی طرح

ناولٹ

آخری حصہ

محبت کی شام

سدرۃ المنتہیٰ



چمکار رہی تھیں۔

آج پورا گھر سجایا گیا تھا۔ گھر میں دو دن پہلے سے گانا بجانا شروع ہو گیا تھا۔ مومنہ کو اس کی پھپھو کے گھر عارضی طور پر بھیجا گیا تھا وہاں سے رخصتی ہونی تھی۔ وہ سارے ارمان جو اس کی پہلی شادی پر وہ پورے نہ کر سکیں وہ سارے آج پورے کیے جا رہے تھے۔ اس کا دل جیسے ہر چیز سے کٹتا جا رہا تھا اور اعتبار جو آج کے دن اپنے آپ سے بھی اٹھ گیا تھا پھر وہ کسی اور کو مورد الزام کیا ٹھہراتا۔ خاموشی سے ان کے ساتھ باہر کی طرف ہو لیا۔ ساحرہ کی مسلسل کالز آ رہی تھیں، جنہیں وہ کئی دنوں سے نظر انداز کر رہا تھا، ایک دو میسج چھوڑ دیے کہ ضروری کام میں مصروف ہے۔

''امبر کی آج برات ہے، وہ تم سے بہت خفا ہے کم از کم آج کے دن تو تمہیں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ ایسا بھی کیا ضروری کام تھا کہ تم اس سے بات تک نہ کر سکے۔ اسے تسلی تک نہ دے سکے، تمہاری کمی صرف میں نے ہی نہیں اس نے بھی محسوس کی ہے۔''

ابھی ابھی اس کا ٹیکسٹ آیا تھا اور وہ بے دلی سے خود پر طنزیہ مسکرا دیا۔

''کیا بتاؤں میں تمہیں کہ کتنے ضروری کام میرے بغیر ادھورے ہیں۔ جن کو مکمل کرنے کے لیے مجھے بہت کچھ گنوانا ہے...... شاید تمہاری محبت بھی جو پچھلے آٹھ سالوں سے میری عادت بن چکی ہے، تم اور تمہاری محبت...... میں اور میری بے وفائی۔''

اس کے ہاتھ میں قلم دیا گیا اور اس نے اپنا آپ کسی اور کو لکھ دیا...... اتنی آسانی سے دستخط کرنے کے بعد ہاتھ دل کی طرح ہی ساکت سے ہو گئے پھر دعا ہوئی...... کھانا ہوا اور اسے اندر بھیج دیا گیا۔

''امبر کی رخصتی ہو گئی...... بہت رو رہی تھی...... کاش تم ہوتے حسن...... تم نے تو اسے بہن کہا تھا...... اس نے تمہارا گفٹ لینے سے انکار کر دیا ہے، وہ تم سے بہت زیادہ ناراض ہے مگر تمہیں کسی کی ناراضی کی کیوں پروا ہونے لگی، نہ میری، نہ کسی اور کی۔'' اس کا آج کے دن میں یہ تیسرا ٹیکسٹ تھا۔ اس نے سم نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی اور سیل فون دراز میں ڈال دیا، وہ مجبور ہو رہا تھا اس سے بات کرنے کو بہت دل کر رہا تھا مگر ابھی وہ اتنی ہمت کہاں سے لاتا...... وہ کیا بتاتا اس کو۔

اِدھر مومنہ اپنے کمرے میں اس کا انتظار کر رہی تھی، اس کی اماں اسے یہاں دیکھ کر ٹھٹکیں۔

''تو اپنے کمرے میں نہیں گیا...... بچی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی، اس نے تو کل سے کچھ کھایا بھی نہیں ٹھیک سے، جا اسے کچھ کھلا بھی، کھانے کی ٹرے رکھوا دی ہے میں نے تمہارے کمرے میں۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

''جاتا ہوں اماں...... تھوڑی دیر بھی اپنے پاس بیٹھنے نہیں دیں گی کیا؟'' اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''میرا بچہ ماں صدقے جائے، ابھی تو اپنی دلہن کے کمرے میں جا، بے چاری کب سے بھوکی بیٹھی ہے، جا تو بھی کھانا کھا لے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔''

''او کے...... جاتا ہوں...... اب خوش ہیں آپ مجھ سے؟'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''بہت خوش ہوں میری جان...... تو بھی خوش رہے گا دیکھنا...... ماں کی دعا جو تیرے ساتھ ہے۔'' پیار سے پیشانی چوم کر وہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولیں۔ آج وہ حقیقی معنوں میں خوش تھیں۔

''یہ دعا ہمیشہ میرے ساتھ رہنی چاہیے۔'' وہ ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنی طرف سے انہیں کوئی خوشی دی تھی اِک یہی تسلی تھی وگرنہ تو وہ ہر طرح سے خود کو مجرم تصور کر رہا تھا۔ اس کا خود کا اور محبت کا۔

☆☆☆

وہ اندر آیا تو اسے بیڈ کے ایک سرے پر عجیب انداز میں لیٹے دیکھا۔ اس کا ایک بازو بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ سر پر دوپٹا پھیلا ہوا تھا اس انداز سے کہ چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ ''اتنے بھاری کپڑوں میں یہ اس طرح بے فکر ہو کر سو رہی ہے۔'' اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی مگر وہ یکسر طور پر اسے نظر انداز کرتا اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہو کر آیا تو جیسے خود کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

ٹرے سے اپنے لیے کھانا نکالا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک مرتبہ خیال آیا کہ اسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لے مگر اس خیال کو جھٹک کر خود کھانے لگا۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر وہ بیڈ تک آیا...... خیال تھا کہ اپنا تکیہ لے کر صوفے پر سو جائے یا پھر باہر...... چونکہ باہر اتنی اچھی ہوا تھی، اسے ویسے بھی اے سی چلا کر سونے کی عادت کم تھی، نزلے کی وجہ سے وہ احتیاط کرتا تھا۔ جیسے ہی اپنا تکیہ اٹھایا اور چادر اس کے پاؤں کے نیچے سے آہستہ سے کھینچنے کی کوشش کی اس کا پاؤں الجھا مگر کوئی حرکت نہیں ہوئی بلکہ اس کا نازک سا وجود نیچے کی طرف ڈھلکتا گیا۔ اس نے فوراً بڑھ کر اسے سنبھالا اور نیند سے بیدار کرنا چاہا اس کا سر نیچے ڈھلک گیا...... اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ شاید بے ہوش تھی۔ اس نے اس کے گال تھپتھپائے اسے جھنجوڑا مگر کوئی حرکت نہیں ہوئی، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا...... فوراً نبض چیک کی تو چل رہی تھی اسے کندھوں پر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

''ارے کیا ہوا...... کیا ہوا میرے چاند! اسے کیا ہوا......؟'' وہ برآمدے سے بوکھلائی ہوئی آئیں۔

''یہ بے ہوش ہو گئی ہے...... میں اسے یہاں کوئی ٹریٹمنٹ نہیں دے سکتا، اسے فوراً اسپتال یا قریبی کلینک لے جانا پڑے گا۔ ڈرائیور کہاں ہے، گاڑی نکالے یا آپ لوگ اسے سنبھالیں، میں نکالتا ہوں اپنی گاڑی۔'' وہ عجلت میں کہتا ہوا اسے چارپائی پر لٹا کر بھاگتا ہوا باہر گیا، گاڑی اسٹارٹ کی، اندر آ کر اسے اٹھایا اور انہیں ساتھ آنے کا کہہ کر جلدی قدم اٹھاتا ہوا لے گیا۔

''جانے کس کی نظر لگ گئی میرے بچے کی خوشیوں کو...... ہائے کیا ہو گیا اچانک...... تو نے کچھ کہہ دیا......'' وہ مسلسل بول رہی تھیں۔

''خدا کے لیے اماں فی الحال تو خاموش ہو جائیں...... ورنہ دے ماروں گا کہیں گاڑی بھی......'' وہ تیز ڈرائیو کرتے ہوئے بری طرح جھنجلایا تھا۔ اس کے کہنے کے بعد ہی وہ چپ ہوئیں کچھ...... عجیب پریشانی تھی ایک کے بعد ایک امتحان...... ایک کے بعد ایک آزمائش...... وہ تھکنے لگا تھا بری طرح سے۔ اطمینان کی سانس جب لی اسے ذرا ہوش آیا۔

☆☆☆

''تمہیں بلڈ پریشر کا بہت مسئلہ ہے اور پتا ہے یہ سب مسلسل ٹینشن کی وجہ سے ہوتا ہے۔ رات تمہاری طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ تم نے کچھ کھایا بھی نہیں اور تم ویک بھی بہت ہو، یہ سیرپ باقاعدگی کے ساتھ لیا کرو۔'' وہ اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے اسے ہدایات دے رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی

طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جو بھی کہہ رہا تھا اس کی نظریں اور طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ دانستہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا، یہ وہ محسوس کر رہی تھی۔

''اپنا خیال رکھا کرو اور ٹینشن مت لیا کرو، ویسے بھی اب کیا پریشانی ہے تمہیں...... تمہیں مستقل گھر مل گیا ہے، ایک حیثیت مل گئی ہے۔ اب پریشانی کا کیا جواز بنتا ہے؟'' اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا سا طنز آ گیا تھا۔

''گھر مل گیا......!'' وہ اس کے لہجے میں کہنے لگی۔ ''پریشانی تو میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب......'' اس کا لہجہ دھیما مگر معنی خیز تھا۔

''یہ شکوہ کس سے ہے؟'' وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''کسی سے نہیں...... اپنی قسمت سے۔'' وہ سر جھکا کر بڑبڑانے لگی۔

''تم ناخوش تھیں اس شادی سے تو انکار کیوں نہ کیا؟'' اس کا لہجہ کچھ سخت سا ہوا۔

''آپ ناخوش تھے تو میں انکار کیسے کرتی۔''

''سب کچھ انسان کی خوشی سے نہیں ہوتا...... تم گھر سے کسی اور کے لیے نکلیں مگر......''

''یہ طعنہ کیا میری زندگی کے ساتھ ہمیشہ جڑا رہے گا؟'' وہ شکایتی انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''یہ طعنہ نہیں ایک سادہ سی بات ہے، میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا۔''

''صرف آپ کے لیے سادہ سی بات ہوگی میرے لیے نہیں...... میں نے کل ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے، میں کوشش کروں گی اپنے ماضی کو دفن کر کے آپ کے ساتھ پُرخلوص رہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ کبھی مجھے اپنا ماضی یاد نہیں دلائیں گے۔'' وہ اسے دیکھتا رہ گیا حیرت سے، کیسی لڑکی تھی وہ ایک دم سے سب کچھ قبول کر لیا...... سب کچھ بھلا بھی دیا اپنا ماضی...... اپنا ہر حوالہ۔

''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں تمہارے ماضی کا حوالہ کبھی نہیں دوں۔'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا اس کے علاوہ جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

''میں کوشش کروں گی آپ کو بہت خوش رکھوں، میری طرف سے آپ کو کوئی رنج، کوئی پریشانی نہ ہو۔'' پہلا دعوا اسی نے کیا تھا۔ شاید اس کا دل جیتنے کے لیے۔

''تمہاری بڑائی ہے اور مہربانی بھی......'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے اپنی جانب سے کوئی دعوا نہیں کیا تھا پھر بھی اسے اندازہ تھا اسے زبردستی ہی سہی خود کو مکمل طور پر تیار کرنا ہوگا۔

''آپ کو بھی مجھے خوش رکھنا ہوگا۔'' وہ بڑی جاندار مسکراہٹ کے ساتھ جتانے والے انداز میں کہنے لگی۔

''عجیب زبردستی ہے...... میں تو کسی کو خوش نہیں رکھتا...... میں نے ٹھیکا تھوڑی ہی لے رکھا ہے۔'' وہ کچھ ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''ٹھیکا ہی تو لے رکھا ہے۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''زبردستی کی محبت......'' وہ بڑبڑایا۔

''جو آسانی سے نہ ملے اسے زبردستی حاصل کرنا چاہیے۔''

''چاہے محبت؟'' وہ زبردستی کا قائل کہاں تھا۔

''چاہے محبت......'' اس کے لہجے میں کھنک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قائل ہونے لگا۔ محبت کا لفظ اس کی کمزوری تھا اور وہ اسی لفظ کے بہکاوے میں آ کر کمزور ہو رہا تھا۔ محبت نے ہمیشہ ہی اسے مجبور کیا تھا۔ اس کے اور کتنے رنگ ہیں، کتنے طریقے...... وہ

سوچنے لگا۔

☆☆☆

نہ جانے کیوں قدم اندر رکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بیگ کندھے پر لٹکائے وہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں اور مجرموں کی طرح داخل ہو رہا تھا۔

''حسن...... تم آ گئے...... تم آ گئے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے تیز تیز سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

''تم آ گئے...... اُف تھینکس...... حسن...... شکر ہے تم آ گئے......'' وہ بہت ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔

''ہوں...... میں آ گیا...... کیوں...... میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں گیا تھا۔'' اس کا لہجہ برف جتنا سرد ہو چکا تھا۔

''پتا نہیں کیوں...... مجھے عجیب سے وہم ہو رہے تھے، بہت ڈر لگ رہا تھا، نہ جانے کیوں...... ایسا...... جیسے تم واپس نہیں آؤ گے، مجھے چھوڑ دو گے...... پتا نہیں کیوں حسن مجھے بہت ڈر لگا، میں اتنے بڑے گھر میں اکیلے روتی رہی...... بچوں کی طرح...... تم یقین کرو، ابھی ابھی...... میں رو رہی تھی...... مجھے ایسا لگ رہا تھا کوئی تمہیں مجھ سے چھین لے گا...... میں خوف زدہ تھی......'' اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

''یہ وہ ساحرہ تو نہ تھی...... بولڈ، پُر اعتماد، خاموش، اپنے آپ میں رہنے والی، اس طرح کب وہ کمزور ہوئی تھی، میرے ساتھ کب یوں روئی تھی بچوں کی طرح۔'' وہ بدلی ہوئی ساحرہ کو دیکھنے لگا اور بے یقینی سے خود کو نکالنے لگا۔

''میں نے تمہیں بہت یاد کیا، بہت زیادہ......'' وہ اس کے ساتھ لگ کر سسک پڑی۔ ''تم اتنے دنوں سے غائب تھے...... مجھے تمہاری کمی بہت محسوس ہوئی۔''

''تمہیں ایسا کیوں لگا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا...... ایسا کیوں لگا کہ کوئی مجھے تم سے چھین لے گا...... بتاؤ؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا کیونکہ وہ اس سے کہہ نہیں پا رہا تھا کہ میں تمہیں چھوڑ ہی تو رہا تھا۔ تمہیں تکلیف ہی تو دے رہا تھا۔ کوئی مجھے تم سے چھین ہی تو رہا تھا مگر وہ بتا نہ سکا، الٹا پوچھنے لگا۔ وہ اس سے کچھ سننا چاہتا تھا۔

''تم اتنے دنوں کے لیے مجھے چھوڑ کر چلے گئے...... تم نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی، تم نے ایک فون کال تک نہیں کی...... تم پورے بیس دن مجھ سے دور رہے، تم نے میرے ایک ٹیکسٹ کا جواب تک نہیں دیا۔ میں کیسے نہ خوف زدہ ہوتی...... مجھے کیسے نہ ڈر لگتا...... میں کیوں نہ روتی؟'' وہ اس سے الگ ہو کر کہنے لگی۔

''تم تو بہت اسٹرونگ ہو...... اگر میں تمہیں چھوڑ بھی دیتا...... اگر میں تمہیں تکلیف دیتا بھی تو...... تمہیں کچھ نہ ہوتا...... تم اکیلے رہ سکتی ہو۔'' وہ اس کو بتانے سے پہلے اس کا ری ایکشن جاننا چاہتا تھا۔

''تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے...... نہ ہی تمہیں مجھ سے کوئی الگ کر سکتا...... نہ کوئی مجھ سے تمہیں چھین سکتا ہے تو پھر میں یہ سب کیوں سوچوں...... کس لیے سوچوں اور میں اتنی بولڈ نہیں...... کم از کم تمہارے بارے میں بالکل نہیں ہوں...... کبھی بھول کر بھی یہ بات مت کہنا، مذاق میں بھی نہیں، سوچنا بھی مت...... بولنا تو دور کی بات ہے۔'' اسے اندازہ نہیں تھا وہ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتی ہے اس کے بارے میں...... اب وہ اس کو سب بتانے کی ہمت کہاں سے لاتا۔

''میں نے سوچا تھا میں تم سے لڑوں گی...... تم سے بات نہیں کروں گی مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ تم ہو سکتا ہے مجھے نہ مناؤ...... ہو سکتا ہے تم بھی مجھ سے

لڑنا شروع ہو جاؤ...... پچھلے دنوں کی طرح اور پھر میں بہت دکھ اٹھاؤں...... اس سے بہتر ہے کہ میں تم سے نہ ہی لڑوں...... تم سے خفا نہ ہی ہوں، ہوسکتا ہے تم مجھے نہ مناؤ، الٹا خفا ہو جاؤ...... اب مجھے تمہاری ناراضی سے ڈر لگتا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی حسن...... ایک دن کے لیے بھی نہیں...... یہ تو پھر بھی بیس دن تھے تو میں کیسے نہ پریشان ہوتی...... بتاؤ؟'' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت بھی...... اسے نظر آ رہا تھا کہ ان دنوں میں وہ خود سے کتنی بے پروا رہی ہے۔

''اِدھر آؤ...... بیٹھو......'' اس نے بیگ نیچے رکھا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''یہ نہیں پوچھو گی کہ میں اتنے دن غائب کیوں رہا، مجھ پر کیا قیامتیں ٹوٹیں...... میرے ساتھ کیا ہوا...... کچھ تو پوچھو تا کہ میں تمہیں بتا سکوں۔'' وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

''تم خود ہی بتا دو، تم مجھ سے ہر بات شیئر کرتے ہو، کچھ بھی نہیں چھپاتے...... تو بتا دو، تم بیس دن مجھ سے دور رہے، یہ بیس صدیاں تھیں میرے لیے۔'' اس کا لہجہ تھکا ہوا اور دھیما تھا۔

''اگر میں تم سے کچھ چھپاؤں اور تمہیں کسی اور طرف سے پتا لگے تو تمہارا کیا تاثر ہوگا؟'' وہ جیسے اسے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے......'' اس کا یقین جانے کیوں پچھلے خدشوں پر بھاری ہو رہا تھا۔

''کیوں...... کیا میں انسان نہیں ہوں؟''

''اسی لیے کہ تم انسان ہو، انسان ہی تو انسانیت رکھتے ہیں۔ سچے ہوتے ہیں محبت میں، وعدہ کرتے ہیں اور نبھایا کرتے ہیں۔'' وہ آج بحث میں اس سے نہیں جیت سکتا تھا۔ اس کے پاس نہ آج ہمت تھی، نہ دلائل تھے اور نہ ہی لفظ...... وہ بس اسے بتا ہی سکتا تھا پھر اس کے بعد جو طوفان آنا تھا اس کا سامنا کرنا تھا۔ فیس کرنا تھا۔

''دیکھو تم اگر مجھ سے روٹھو گی تو میں تمہیں منا لوں گا اگر تم مجھ سے لڑو گی تو خاموش رہوں گا اگر کوئی غلطی کرو گی تو معاف بھی کر دوں گا اگر میں تم سے لڑوں تو تم بھی چپ رہو گی نا؟ اگر میں تم سے خفا ہوں تو تم بھی منا لو گی مجھے...... اگر میں کوئی غلطی کروں تو تم بھی مجھے معاف کر دو گی نا؟ تم بھی مجھے چھوڑ کر تو نہیں جا سکتی نا...... بتاؤ؟''

''میں تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، غلطی کے معاملے میں غلطی پر منحصر ہے، ہوسکتا ہے معاف کر دوں، ہوسکتا ہے سزا دے دوں...... مگر چھوڑوں گی پھر بھی نہیں، کبھی نہیں......'' وہ نا سمجھی میں ہی سہی مگر اس کی بات کا جواب دے رہی تھی اور اسے لاجواب کر رہی تھی۔

''ساحرہ...... میں...... میری بات سمجھنا پلیز......'' ہاتھ پر دباؤ بڑھ گیا، چہرے پر پریشانی اور الجھن کا تاثر تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا پہلے اپنے بارے میں وضاحتیں پیش کرے اسے اپنی محبت کی سچائی کا یقین دلائے، اس کے بعد اسے تمام مجبوریوں سے آگاہ کرے پھر اصل بات کی طرف آئے۔ اسے الجھن سی ہو رہی تھی...... پھر جب ایک بات کلیئر کرنی ہی ہے تو سو باتوں سے کیوں...... سیدھے سیدھے کیوں نہیں...... اسے کوفت سی ہوتی تھی بات کو گھما پھرا کر کرنے سے مگر ابھی وہ بے بسی کے عروج پر تھا۔

''ساحرہ...... میں اتنے دنوں سے...... ساحرہ...... میں۔''

'''تم...... کیا تم......؟'' وہ خود اس کی میں، میں سے الجھ رہی تھی۔

''میں نے...... وہ مومنہ کو چھوڑنے گیا تھا نا...... تو...... میں اصل میں دیکھو...... ساحرہ......''

''اب کہہ بھی چکو حسن...... کیا مسئلہ ہے، تم مجھ سے نہیں شیئر کرو گے تو کس سے کہو گے بھلا...... بولو، کہو ناں!'' وہ اپنے تئیں اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگلے دو لمحوں میں وہ اس کو کیا بتانے والا ہے۔

☆☆☆

ایک آواز جو اس کی زندگی بن گئی تھی جس آواز نے اس کی زندگی کو زندگی بنایا تھا۔ اس نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا، اس کی بانہوں میں زندگی آ گئی تھی۔ وہ زندگی جس کے لیے اس نے سالوں، مہینوں، ہفتوں، لمحوں، انتظار کیا تھا، انتظار جو شدید ترین ہوتا ہے۔ انتظار جو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے مگر اس نے انتظار کیا، جب امید کا دامن چھوڑ کر اس نے زندگی میں گم ہو جانا چاہا تب زندگی نے اسے سمیٹ لیا۔ اس کی زندگی بھرپور طریقے سے اسے زندہ کر گئی، وہی زندگی جو اس آواز میں تھی۔

''مما میرے ہاتھوں میں باؤل کیوں نہیں آ سکتا......؟''

''مما میں بڑی چیزوں کو کیوں نہیں پکڑ سکتا؟ میں آپ کی طرح گاڑی کیوں نہیں چلا سکتا؟'' وہ سوال پر سوال کیے جاتا، اس نے زندگی کو بانہوں میں سمیٹ کر خود تک محدود کر لیا اور اس کے سوالوں کے جواب دینے لگی۔ وہ زندگی کو زندگی سمجھا رہی تھی، اس نے محبت کو وسعت دے دی۔ محبت بہت وسیع تھی۔ اس کے قلب کی طرح اس کی زندگی کی طرح اس کی طرح اور محبت کی طرح......

☆☆☆

اس نے بتانا چاہا تھا مگر وہ بتا نہیں سکا تھا، اس کی محبت اور شدت اسے ایسا کرنے سے پوری طرح سے روک رہی تھی اور وہ ٹال گیا، خاندانی مسائل اور جھگڑوں کی تجوری کھل گئی وہ اس کی پریشانی دیکھ کر مسائل کی شدت کو سمجھ رہی تھی مگر مسائل کی نوعیت کو سمجھ نہ سکی اور پھر زندگی ایک نئے سرے سے شروع ہوئی تھی جیسے پچھلی تمام بدگمانیاں دھل گئی تھیں...... مگر یہ سب وقتی طور پر ہوا تھا وہ بھول بیٹھا کہ جس اٹل حقیقت سے وہ بھاگ رہا ہے، کسی ثبوت کی صورت وہ اٹل حقیقت اسے اس کے سامنے کبھی بھی بے نقاب کر سکتی ہے۔ ایک پُرجوش سی صبح تھی جب اس نے اسے جگایا تھا، اس کا پورا کمرا جگمگا رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے پوری آنکھیں کھولتے ہوئے کمرے کی سجاوٹ کو دیکھا اور سامنے دھری ٹیبل پر رکھے کیک پر اس کی نگاہ ٹک گئی۔

''بھول گئے......، مجھے پتا تھا، کیسا لگ رہا ہے سرپرائز؟'' وہ بہت ایکسائٹڈ تھی۔

''اوہ...... ہیپی اینورسری......'' اس کے چہرے پر ایک بھرپور سی مسکراہٹ آ گئی جو تا دیر نہ تھمی۔

''اب اٹھو اور جلدی سے فریش ہو جاؤ تا کہ ہم کیک کاٹیں۔'' وہ اس کے بال بگاڑتے ہوئے بیڈ سے نیچے اتری اور کھڑکی کھول کر پردے برابر کر دیے۔

''صبح کتنی خوب صورت ہے اور کتنی دلکش ان پورے آٹھ سالوں کی طرح مگر نہیں...... ان میں سے ایک سال جو کاش کہ ہماری زندگی میں نہ آتا تو ہم کتنے مکمل سے لگتے۔ کاش اس ایک سال کو میں کیلنڈر سے مٹا دوں۔'' وہ صفحات سے مٹانے کی بات کر رہی تھی حالانکہ اسے پتا تھا کہ حقیقتیں نہیں

مٹتیں۔ حرف مٹانے سے کچھ نہیں ہوتا، حالات نہیں بدلتے، سچائیاں نہیں بدلتیں۔ مگر وہ دونوں عجیب طرح سے ایک دوسرے کو بہلا رہے تھے...... ایک دفعہ بھی یہ نہیں سوچا کہ بہلاوے وقتی ہوتے ہیں۔ انسان نہ جانے کیوں اپنا کیا دھرا، وقت، حالات پر ڈال دیتا ہے اپنی تمام غلطیوں، کوتاہیوں کی ذمے داری تقدیر اور حالات پر ڈال کر خود بری الذمہ ہوجاتا ہے۔ وہ بھی بیچ والے عرصے کو حالات پر ڈال کر بری الذمہ ہوگئے تھے۔

تمام خوش گمانیاں صبح تک محدود تھیں۔ شام تک ایک سچائی نے ان تمام خوش گمانیوں کو ڈھانپ لیا تھا۔

"تم نے دعوا کیا تھا، تمہیں یاد نہیں مگر مجھے یاد ہے...... تم نے مجھ سے جھوٹ بولا...... مجھ سے دھوکا کیا...... کھیلتے رہے میرے ساتھ۔" وہ ایک ایک کر کے الماری سے کپڑے نکال کر نیچے پھینکتی جارہی تھی، عجیب کیفیت طاری تھی یہ دکھ تھا یا غصہ تھا بہرحال اس کا اعتماد بری طرح ٹوٹا تھا۔

"تم میری بات تو سنو ساحرہ...... پلیز میری سچویشن کو سمجھو، مجھ سے بات تو کرو، مجھ سے پوچھو یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا...... کس لیے ہوا؟" وہ کشمکش میں اسے پوری طرح روکنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں کیا سمجھوں...... کیا دیکھوں یہ سب جو تم نے کیا ہے...... کاش حسن میں تب ہی سمجھ جاتی، میں یوں بے وقوف نہ بنتی، تم نے جھوٹ بولا اور میں نے یقین کیا...... تم نے بہلایا اور میں بہل گئی...... بہت بڑی بات ہے حسن......"

"میرا قصور نہیں ہے ساحرہ، تم میری پرابلم سمجھو...... خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔"

"قصور میرا ہے حسن اور اب مجھے سزا بھگتنی ہے...... بھگتنے دو۔" وہ اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے چیخی تھی۔

"تمہاری بیوی آج تمہارا بچہ لے کر اس گھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگئی ہے۔ جاؤ اس کی تیمارداری کرو۔ جاؤ اس کی خوشی میں جشن مناؤ اس کا خوشی سے استقبال کرو۔ اس نے تمہیں تمہارا وارث دیا ہے، اس نے تمہیں وہ دیا ہے جو میں نہ دے سکی۔ جاؤ دھوکے کی زندگی سے نکل کر حقیقت کی زندگی جیو اور مجھے بھی جینے دو۔ لوگ تمہارے پاس آکر تمہیں مبارک باد دیں گے، جاؤ جشن مناؤ گھر سجاؤ، تم باپ بن گئے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں بہ آواز بلند روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے آناً فاناً اپنے چند جوڑے بیگ میں اڑسے اور کمرے سے بیگ گھسیٹتے ہوئے باہر نکلی۔

"رکو! پلیز ساحرہ...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے لاؤنج تک آیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح روکے۔ وہ کم از کم اس سے بات کرنے کی پوزیشن میں تو ہو۔

"دکھ صرف اس بات کا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک کھیل کھیلا گیا...... اور میں بے خبر رہی...... دکھ تو صرف اس بات کا ہے کہ میرا اعتماد آج سب سے اٹھ گیا۔ تمہیں اگر شادی کرنے کے لیے دنیا میں ایک یہ ہی بندہ ملا تھا تو کم از کم مجھے کہتیں تو سہی، تم نے چھپ کر وار کیا ہے مجھ پر، کون سی زیادتی کی تھی میں نے تمہارے ساتھ...... یا پھر ایک بہت بڑی غلطی تھی اس گھر میں لا کر پناہ دے کر، تم پر بھروسا کر کے جس کی سزا بن کر آج تم میرے سامنے کھڑی ہو۔" مومنہ بڑے سکون کے ساتھ اس کا سکون تباہ کر کے کھڑی تھی۔

"میں اسے نکال دوں گا ساحرہ، تم رکو تو سہی، تم کہو تو میں اسے ابھی کہ ابھی طلاق دیتا ہوں۔"

"یہ آپ کی بھول ہے حسن صاحب کہ آپ مجھے اب اس گھر سے نکالیں گے۔ میں آپ کے بچے کی ماں ہوں اور آپ کی قانونی، شرعی بیوی، اس گھر کی اتنی ہی حق دار، یہ چلی جائیں تو بے شک جائیں مگر میری اب اس گھر سے لاش ہی نکلے گی۔" وہ بچے کو گود میں سنبھالتے ہوئے ساحرہ کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہہ کر اندر بڑھی۔

"رکو...... تمہیں یہاں سے جانا ہوگا آج نہیں تو کل مگر میں تمہیں چھوڑ دوں گا، میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا...... ہرگز نہیں۔"

"کیوں...... کیوں نہیں رہ سکتے آپ میرے ساتھ...... بتائیں شادی کر سکتے ہیں تو رہ کیوں نہیں سکتے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب مجھ سے اپنا مطلب نکال کر اب آپ مجھے چھوڑ دیں گے اور میں چلی جاؤں گی، ہرگز نہیں، میں اس بچے کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاسکتی اگر اتنا ہی اپنی غلطی کا پچھتاوا ہے تو نکال دیں مجھے گھر سے مگر میں اپنا بچہ ساتھ لے کر جاؤں گی اور یہ آپ کرنا نہیں چاہیں گے کیونکہ آپ اور آپ کی ماں اس بچے کو کھونا نہیں چاہتے۔" اس کے منہ میں جیسے زبان نکل آئی تھی۔ یہ اس کی حیثیت بول رہی تھی جو اس گھر میں اب اس کی شرعی طور پر تھی جو حیثیت اس نے خود اسے دی تھی اور اب اتنی آسانی سے اسے بے دخل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ اتنا کہہ کر رکی نہیں تھی اور ساحرہ اب کی بار بغیر کچھ کہے خود پر ضبط کیے خاموشی سے بیگ گھسیٹتے ہوئے اس گھر سے نکل گئی۔

اسے اب کہاں جانا تھا یہ اسے معلوم نہ تھا۔ رات دو بجے تک سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتے ہوئے جب پٹرول ختم ہوا اور اس کی توانائی بھی تو ویرانے میں گاڑی روکے وہ تنہائی میں گھپ اندھیرے میں خود سے لڑنے لگی اور کچھ اپنی تقدیر سے...... تو کچھ محبت سے بھی۔ محبت جواب نہیں رہی تھی۔ اس کا دل خالی خالی ہوگیا اور آنکھیں بھر آئیں، وہ کتنی اکیلی تھی...... کتنی تنہا...... کتنی بے سہارا وہ اسٹیرنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ رات چار بجے امبر پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتے، ڈھونڈتے وہاں پہنچی تھی۔

☆☆☆

"تو تم نے کر دکھایا وہ سب جس کا اسے خدشہ تھا مگر حسن یہ سب اسے اعتماد میں لے کر نہیں کیا جاسکتا تھا...... بتاؤ؟"

"آٹھ سال امبر...... آٹھ سال کم نہیں ہوتے مگر میں نے انتظار کیا اور شاید اب تک کرتا رہتا مگر نہ جانے کیا ہوا سب کچھ اچانک ہی ہوا۔"

"سب کچھ ہو بھی گیا اور تم نے اسے بھنک تک نہ لگنے دی۔ بہت خوب، تمام زندگی بے خبری میں بیت جاتی اگر وہ اپنا بچہ لے کر خود تمہارے گھر نہ آتی۔ تم نے اس کے اعتماد کو بری طرح توڑا ہے اور اب تم کہتے ہو کہ میں اسے سمجھا کر یہاں لاؤں...... اگر یہ ممکن ہے تو تمہیں یہ سب کرنا ہوگا، اسے خفا میں نے نہیں، تم نے کیا ہے، اس کا اعتماد میں نے نہیں، تم نے توڑا ہے۔"

"میری تو زندگی بکھر گئی ہے امبر...... کوئی نہیں جو مجھے سمجھے، تم بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں تھکن کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"میں کیا کرسکتی ہوں...... جو اس کی حالت ہے، تم نہیں سمجھ سکتے وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ ایسے میں اسے سمجھانا بہت مشکل ہے پھر بھی

تمہیں کچھ انتظار کرنا چاہیے۔'' اسے سوائے اس کے کوئی حل نہیں سوجھ رہا تھا۔

''انتظار...... تاکہ وہ میرے بغیر رہنے کی عادی ہوجائے۔ انتظار...... جس میں وہ مجھے بھولتی جائے، میرا نام اس کی زندگی سے مٹ جائے۔ کتنا انتظار امبر...... بتاؤ اسے کتنی مہلت دوں میں۔''

''وہ ایک دم سے سب کچھ قبول نہیں کرسکتی حسن، میں پھر بھی بات کروں گی، میں کوشش کرکے دیکھ لوں گی مگر وہ بھی اب اپنی ضد پر قائم ہے۔ دیکھو حسن وہ بھی بس تم سے محبت کرتی ہے، ٹوٹ کر مگر فیصلہ بہرحال اس کا اپنا ہوگا اور فیصلہ حالات کو مدِنظر رکھ کر کیا جاتا ہے، صرف محبت، انسان کو روک نہیں سکتی۔ تم یہ سوچو کہ وہ کیسے اس لڑکی کا وجود تمہاری بیوی کی حیثیت سے مان لے۔ تم کہیں اور کرلیتے مگر اس لڑکی کو ساحرہ پر فوقیت نہ دیتے، بہرحال یہ سب اس کی بھی غلطی تھی جو اس نے ایک اجنبی لڑکی پر اتنا بھروسا کیا مگر اس سے زیادہ بھروسا تم پر تھا۔ جو تم نے توڑا، تم کہہ رہے ہو سب اچانک ہوا...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ تم بچے نہیں کہ زبردستی پکڑ کر تمہیں بٹھایا گیا ہوگا تم نے اپنی پوری رضامندی سے نکاح کیا۔ حسن اب تم خود کو بے قصور نہیں ٹھہرا سکتے۔ بہرحال تمہیں اب خود اس سے بات کرنی ہوگی۔''

''وہ مجھ سے بات کرنا چاہے تو...... وہ میری بات سنے تو۔''

''دیکھو بجائے اپنی صفائی پیش کرنے کے اس سے کھل کر اپنی غلطی تسلیم کرو پھر اسے منانے کی کوشش کرو، پورے حقائق کے ساتھ اور اب تمہیں جو کرنا ہے اس بات کو کلیئر کرو، کوئی جھوٹا دعوا نہیں کہ تم اس لڑکی کو چھوڑ دو گے یا فلاں، فلاں میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو ساتھ رکھنے کی سوچ رہے ہو۔''

''وہ میری مجبوری ہے امبر...... اور یہ میری محبت...... نبھانا دونوں کو ہی ہوگا۔ بس ساحرہ مان جائے، وہ واپس گھر چلی آئے میں اس کو علیحدہ گھر میں رکھوں گا وہ گھر صرف ساحرہ کا ہے، تم اسے قائل کرو پلیز۔''

''گھر سے نکالو گے، زندگی سے تو نہیں، دیکھو یہ نیچرل فیکٹ ہے، وہ دونوں اِک دوسرے کو برداشت نہیں کرسکیں گی، میرے خیال سے تم اب کوئی ایک انتخاب سوچ سمجھ کر کرلو۔''

''امبر سمجھنے کی کوشش کرو، وہ میرے بچے کی ماں ہے، میں اسے دھکے دے کر کیسے نکال سکتا ہوں گھر سے چلو دوسری جگہ منتقل ہو بھی جائے مگر... فی الحال میں اسے اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کرسکتا۔ میرے بچے کو میری ضرورت ہے، میں کیسے چھوڑ دوں اور ایک ماں سے بچہ چھینا بھی نہیں جاسکتا۔ تم خود سمجھ دار ہو سمجھ سکتی ہو، اسے سمجھاؤ۔''

''بڑی بات ہے حسن...... کاش تم دعوا نہیں کرتے، تم نے اسے اتنی محبت دی کہ اسے دھوکے کی توقع نہ تھی تم سے۔ تم کم از کم اسے لاعلم نہ رکھتے حسن۔''

''میں اس سے اجازت مانگتا اور وہ دے دیتی، یہ ممکن نہ تھا۔''

''وہ دے دیتی حسن۔'' اس کے لہجے میں یقین تھا۔

''پھر بھی وہ ایسا کرتی، مجھے چھوڑ دیتی۔''

''اور تم اسے ایسا کرنے دیتے؟''

''میں کیا کروں امبر، ساری سچویشن تمہارے سامنے ہے؟''

''حسن اس سے بات کرو، میں خود نہیں چاہتی کہ تم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھے میرے گھر آکر اس سے ملو۔''

''مجھ میں ہمت نہیں اس کا سامنا کرنے کی۔''

''اگر ہمت نہیں تو چھوڑ دو۔'' امبر کو غصہ آگیا۔

''چھوڑ ہی تو نہیں سکتا۔'' وہ ہر طرح سے خود کو بے بس محسوس کررہا تھا۔

''تم کچھ بھی نہیں کرسکتے، مجھے یہاں کیوں بلایا پھر آخر!'' وہ خفگی سے کرسی چھوڑ کر اٹھی۔

''تم میرے لیے کچھ کرسکتی ہو امبر؟'' وہ سراپا سوال بن گیا۔

''جس حد تک کرسکی...... کروں گی۔'' اس کی حالت پر بہرحال اسے رحم آنے لگا تھا۔

''مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں۔'' وہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا۔

''تمہیں خود سے امید رکھنی چاہیے۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی وہ کاریڈور سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اپنے اندر اس نے ہمت کو ٹٹولا مگر... فی الحال اسے سوائے بے ہمتی کچھ نہ ملا، وہ خود کو ہی سنبھال نہیں پارہا تھا سو حالات کیسے سنبھالتا اسے خود اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگا۔ سوائے غصے کے اور چارا کیا تھا جو اس کے بس میں تھا وہ کام وہ بخوبی کررہا تھا۔ غصہ، پریشانی اور فکر۔ وہ یہاں تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ محبت سے نفرت تک کا راستہ بہت مشکل تھا۔

☆☆☆

''تو پھر تم نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا؟'' شام کا دھندلکا پھیلتا جارہا تھا۔ جس کو دور کرنے کے لیے اس نے پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھول دیں مگر وہ اس کے اندر کا حبس گھٹانے میں ناکام ہی رہی تھی مسلسل۔

''فیصلے تبدیل کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔'' اس کا لہجہ اٹل ٹھوس اور احساس سے خالی تھا۔

''نظرِ ثانی کرنے کے لیے تو ہوتے ہی ہیں ناں؟'' وہ اسے اکسا رہی تھی۔

''وقت نہیں بچا، جو ہوا ہے اسے حقیقت کے ساتھ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب اس کی زندگی میں میری کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس اس کھوکھلی محبت کو نبھانے کی گنجائش، رشتے جب مقام کھو بیٹھیں اور کوئی حیثیت باقی نہ رہے تو لفظی سہاروں سے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ اب تک ہم ایک دوسرے کو بہلاتے رہے تھے۔ اس نے حقیقت کو تہِ دل سے قبول کیا اور میں خوابوں کی دنیا میں گھر بناتی رہی۔ ایسے گھر جو بارش ہوتے ہی بہنے لگیں، گھونسلوں کی طرح ڈھے جائیں، ایک ہلکا سا جھٹکا، بس ہلکا سا جھٹکا ہی کافی ہے اور وہ ہلکا سا جھٹکا جس نے طوفان برپا کردیا تھا میرے اندر جو اس نے نہیں دیکھا، جو میں نے محسوس کیا امبر...... اپنے اندر کی دنیا کو تہس نہس ہوتا محسوس کیا...... اب مٹ چکی ہے میرے اندر کی ہر خواہش...... اس لیے جھوٹی تسلی سے مجھے خوش فہمی میں مت دھکیلو، مجھے قبول کرلینے دو اپنی ہار...... اپنی شکست...... مجھے سچائی کو فیس کرلینے دو۔'' اس کے اندر جیسے لاوا بھڑک رہا تھا۔

''تم جذبات سے کام مت لو ساحرہ...... پلیز اپنے بارے میں سوچو، تم اکیلی ہو...... تم کہاں رہو گی...... ایسا مت کرو...... یا تو اسے قبول کرکے اس کے ساتھ رہو، کم از کم تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔''

''میرا دل ٹوٹ چکا ہے امبر...... خالی در و دیوار مجھے پناہ دینے کے لیے کسی بھی جگہ مل جائیں گے، میں اپنی پوری زندگی ان لڑکھڑاتے سہاروں کے ذریعے نہیں گزارنا چاہتی ہوں، میں کما سکتی ہوں، میں اپنے لیے گھر اور سہولیات کا

اہتمام کر سکتی ہوں، میں مالی طور پر اتنی کمزور نہیں، ایک اچھے ڈاکٹر کی انکم کتنی ہوتی ہے یہ پوری دنیا جانتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اتنا بھی بے مول نہیں کر سکتی۔'' وہ پوری طرح سے محبت کے سحر سے نکل چکی تھی اور مکمل طور پر حقیقت پسند ہو کر سوچ رہی تھی، ایک طرح سے یہ اس کی ذات کا مضبوط پہلو تھا۔ اپنے خدشے جن سے وہ مسلسل بھاگتی رہی تھی۔۔ فقط ایک جھٹکے کی دیر تھی کہ سب کچھ بدل گیا۔

''سب کچھ ایسے نہیں ہو جاتا ساحرہ...... سب کچھ کے پیچھے بہت کچھ ہوتا ہے مگر کچھ کے لیے سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، میں جانتی ہوں تم دل سے رنجیدہ ہو مگر پلیز اس سے ایک بار مل کر بات تو کر لو۔ ہو سکتا ہے کوئی صورت نکل آئے۔''

''دیکھو امبر...... بچی مت بنو...... پہلی بات کہ وہ اپنی نئی نویلی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا، دوسری بات کہ مجھے ساتھ رکھ کر اسے کچھ بھی نہیں ملنے والا اور اب کچھ رہا بھی نہیں پھر تم اسے جیلسی ہی کہو کہ اس لڑکی کا وجود مجھ سے برداشت نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کو میری موجودگی اچھی لگے گی۔''

''تم اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہو ساحرہ، تم صرف اپنے اور حسن کے بارے میں سوچو...... اپنی زندگی کے بارے میں پلیز...... خدا کے لیے۔''

''سوچنے کا وقت نہیں رہا امبر...... سوچوں میں الجھ کر میں رہی سہی ہمت بھی ہار بیٹھوں گی، میں سچائی کو تسلیم کر چکی ہوں، میں اس سے بات بھی کر چکی ہوں۔ اب نہیں...... اب کچھ نہیں پلیز امبر...... پلیز...... مجھے چھوڑ دو...... میں کچھ دنوں میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی بس میں ذرا اس مسئلے کو کلیئر کر لوں تو اپنے لیے کسی جگہ کا انتخاب کروں گی، فی الحال میں کچھ مینٹلی طور پر ڈسٹرب ہوں، مجھے مزید ڈسٹرب مت کرو۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی بند کرنے لگی۔

''روشنی آنے دو، کھڑکی بند مت کرو۔'' اسے اعتراض تھا۔

''روشنی نہیں اندھیرا ہے، ہر جگہ اندھیرا ہے...... لائٹ جلا دو امبر...... میں باہر جانا چاہتی ہوں ٹھنڈی ہوائیں، میرا جی گھبرا رہا ہے۔'' اس کے چہرے پر بے چینی و اضطراب کی کیفیت تھی۔

امبر پوری طرح سے ناامید ہو چکی تھی اس سے اور اب اسے اس کی فکر ہو رہی تھی، وہ خود بھی اس کے پیچھے باہر آئی۔ لاؤنج میں بیٹھے عشان نے ان دونوں کو باری باری باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر کئی سلوٹیں نمودار ہوئیں، اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا اذانیں ہو رہی تھیں وہ کھلے دروازے سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی دلجوئی میں لگی تھی۔ اس لگا اس کا وجود تب سے بے معنی سا ہو گیا ہے جب سے وہ اس گھر میں رہنے آئی ہے، نہ وہ باہر کہیں آؤٹنگ کے لیے گئے ہیں، نہ وقت ساتھ گزارا ہے۔ وہ چھٹیوں پر آیا تھا پندرہ دن کی، اس کے بعد فیلڈ چینج ہوتے ہی اسے چلے جانا تھا۔

''جب اسے معلوم بھی ہے کہ میں جا رہا ہوں ایک دو دن میں تو پھر بھی میرے لیے وقت نہیں۔'' وہ ویسے ہی سخت نظریات کا حامل تھا۔ اس کے ساتھ تو رعایت کرتا تھا مگر اب اس سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بلاوجہ اپنا خون جلا رہا تھا اور بلاوجہ خون جلانا اس کی عادت تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے جو اچھائی کا خول خود پر چڑھایا تھا وہ اترنے کو تھا۔

☆☆☆

''اگر ہم ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے ایک دوسرے سے اجنبی بن کر رہ سکتے ہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے مگر اس کی سزا میرے بچے کو مت دو، جس کو تمہاری ضرورت ہے۔ جس کا تم پر حق ہے، وہ بچہ ہے تمہارا اور تم اس کی ماں...... سگی ماں ہو تم اس کی مگر تمہارا سلوک اس معصوم کے لیے نقصان دہ ہے۔ کتنی شدت سے رو رہا ہے اور تمہیں اس پر رحم نہیں آتا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے تمہارے ماں ہونے پر بھی شک ہوتا ہے۔'' کافی دنوں سے وہ اس کا یہ رویّہ دیکھ رہا تھا اور اب نظر انداز کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ علی جب روتا تھا تو اس کو ہر چیز ہر پریشانی بھول جاتی، وہ اسے اٹھاتا پیار کرتا، بہلاتا مگر اسے چپ کرانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ چند ماہ کا بچہ روتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھتا اور وہ بت بنی بیٹھی رہتی، رحم آتا تو اٹھا لیتی ورنہ بیٹھی رہتی۔ وہ اسے دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ اس کے علم میں نہ تھا کہ اس کا یہ رویّہ صرف اس کے سامنے ہے وہ اسے جتانا چاہتی تھی، اسے تکلیف دینا چاہتی تھی یا پھر اس طرح اپنی جانب پوری طرح متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ جس سے ابھی تک وہ محروم تھی۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ تمہیں مسئلہ کیا ہے آخر؟'' وہ جھلا اٹھا اس کی مسلسل خاموشی سے۔

''میرے مسائل سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ بے دلی سے روتے ہوئے علی کو نظر انداز کر کے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

''تم چاہتی کیا ہو آخر...... سب کچھ تو مل گیا ہے تمہیں بلکہ ملا کہاں چھینا ہے تم نے، اس سے جس نے تمہیں پناہ دی، سہارا دیا، تم نے اس کا شوہر ہتھیایا، تمہیں سب ملا، یہ گھر، یہ مقام، اب بھی تمہارے چہرے پر خوشی نہیں، اطمینان نہیں، نہ جانے اور کیا کچھ کر کے تمہیں خوشی ملے گی، اب کیا چاہتی ہو تم، کیا سازش ہے تمہاری، اب کھل کر بتاؤ مجھے۔'' وہ اس کے سامنے بہ آواز بلند کہنے لگا۔ ایک تو وہ بری طرح الجھ رہا تھا پھر مزید اس نے پریشان کر رکھا تھا۔ اسے اس کے یہ نخرے زہر لگ رہے تھے۔

''پہلی بات کہ مجھ سے شادی کرنا آپ کی مجبوری تھی، میری نہیں...... میں نے آپ کی منت نہیں کی تھی کہ مجھ سے شادی کریں، رہی بات چھیننے کی تو اس کے ذمے دار آپ خود ہیں ڈاکٹر صاحب آپ بچے نہیں...... نہ ہی نا سمجھ ہیں کہ میری وجہ سے آپ کو یہ سب کرنا پڑا۔ میں اور پھر یہ بچہ صرف اور صرف آپ کی مجبوری ہیں اور رہی بات مقام ملنے کی تو مجھے اگر آپ نے وہ مقام دیا ہوتا تو مجھے چند دن بعد وہاں چھوڑ نہیں آتے، بھول نہ جاتے، اس قدر بے پروا نہ ہوتے۔ میری ذمے داریوں سے اور یہاں جب میں خود آئی تو آپ کا رویّہ آپ کا سلوک جو میرے ساتھ رہا۔ ایک نوکر سے بھی بدتر، ایسا رویّہ تو آپ کا اپنے ملازم کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ مجھے یہاں کب تک رکھا جائے گا اور کب نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی۔ زندگی کی ٹھوکریں مزید مجھے کتنا ذلیل کریں گی۔'' وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لہجے میں نمی تھی وہ رو دینے کو تھی۔

''اس گھر میں تم اپنی جگہ اپنے سلوک سے بناؤ گی، تمہیں نکال سکتا تو اسی دن نکال دیتا۔ یہ سچ ہے کہ تم میری مجبوری ہو، یہ سچ ہے کہ میں کبھی تم سے محبت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں تمہارے لیے اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

''اور یہی سچ ہے کہ آپ اس کے لیے مجھے چھوڑ دیں گے۔ کب اور کہاں...... کس وقت یہ نہیں معلوم، کب گھر بدر کیا جائے۔ اس حیثیت کو مقام

کہتے ہیں، عزت کہتے ہیں، بتائیں؟''

''تم میری پریشانیوں میں اضافہ کر رہی ہو اور کچھ نہیں۔'' اس کا لہجہ کچھ کمزور پڑا تھا۔

''اور آپ میری کشمکش میں اضافہ کر رہے ہیں، مجھے بتا دیں کہ کب تک رکھیں گے تاکہ میں اپنے لیے کچھ بندوبست کرلوں، اس بار کسی پر بھی بار نہیں ہونا چاہتی۔''

''اگر میں تمہیں واقعی چھوڑ دوں؟'' اسے کوئی ترکیب سوجھی تھی۔

''تو پھر میں اپنا بچہ ساتھ لے جاؤں گی۔'' وہ پہلے سے سوچے بیٹھی تھی۔

''بچہ، جس سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ مسکرایا۔

''ہو یا نہ ہو مگر میں اسے آپ کے حوالے نہیں کرسکتی اور دنیا کا کوئی قانون مجھ سے اس عمر میں میرا بچہ نہیں چھین سکتا۔''

''تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو؟'' وہ دہاڑا۔

''نہیں، حقیقت بیان کر رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ ایک دم سے پختہ ہو گیا تھا۔

''تم میری پریشانی سے فائدہ اٹھا رہی ہو۔''

''اس کے ذمے دار آپ خود ہیں۔ مجھے آپ کا جواب چاہیے۔''

''تمہیں میری بربادی چاہیے...... تو سن لو میں خود یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا، رہنا تم یہیں اپنے بچے، اپنی حیثیت کے ساتھ۔'' وہ بھی اب بلیک میلنگ کا ہتھیار استعمال کر رہا تھا۔

''آپ کی مرضی ہے، گھر آپ کا، حیثیت آپ کی، کس کو الو بنا رہے ہیں آپ اور پھر یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔''

''تمہیں صرف اپنی پروا ہے اور بس!''

''میں دنیا کی واحد شخص نہیں، آپ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ مطلب کی خاطر کسی کو غلام بنا لیا، مطلب نکلا تو آزاد کر دیا، بہت خوب......''

''تمہیں کیا کہوں، لکھ کر دوں یہ گھر، بتاؤ کیا چاہتی ہو، تمہیں یہ گھر لکھ کر دوں؟''

''مجھے اپنی محبت، اپنی عزت، اپنی حیثیت لکھ کر دیں۔ مجھے لکھ کر دیں کہ مجھے یہاں سے نہیں نکالا جائے گا۔'' وہ اپنا آپ منوانا چاہتی تھی ہر صورت۔

''یہ گھر تمہارا ہے...... مگر میں اور میری محبت، جو میں سالوں سے کسی اور کے نام کر چکا ہوں اس سے زیادہ مجھ سے امید مت رکھنا البتہ میں تمہیں یہاں سے نہیں نکالوں گا اگر الگ ہونا ہی ہوگا تو خود کہیں جاؤں گا، تمہیں اس گھر کی حاکمیت مبارک......'' وہ یہ سب کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ اس کی باتوں کے جال میں جکڑا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ نرمی میں مار کھا جاتا تھا۔ یہ کچھ وہ ٹھیک تھی اور کچھ اس پر ایکسٹر رعب جمانا چاہتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ تیزی سے کامیاب ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''تو تم حسن احمد سے ملنے گئی تھیں، مجھ سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تم نے؟''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، میں ملنے گئی تھی ڈیٹ مارنے نہیں۔'' اسے اس کا یوں پوچھنا سخت زہر لگا تھا۔

''اور ڈیٹ کس طرح ماری جاتی ہے، ظاہری بات ہے چوری چھپے ملنے اور ڈیٹ مارنے میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔'' اس کا انداز حد درجہ سخت اور چبھتا ہوا تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو عشان؟'' اس کے لیے یہ انداز بالکل نیا تھا۔

''وہی جو تم سننا چاہتی ہو۔'' وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے عشان، تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو۔'' اس کے لیے یہ لہجہ ناقابلِ برداشت تھا۔

''جو کچھ کرنے میں تمہیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی وہ سوچنے میں مجھے شرم کیونکر ہوگی۔''

''عشان...... وہ میرے بھائیوں جیسا ہے۔'' اسے گہرا صدمہ ہوا تھا۔ وہ کرسی پر ڈھے سی گئی۔

''بھائیوں جیسا ہے مگر بھائی نہیں ہے۔''

''تمہاری سوچ اتنی گر سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاتی جبکہ تمہیں شروع سے پتا بھی ہے ہمارے ریلیشن کا اس کے باوجود بھی تم نے اس حد تک سوچا اور اس طرح کی زبان استعمال کی...... مجھے جتنا افسوس ہو کم ہے۔''

''تم اس سے ملنے کیوں گئی تھیں، مجھے یہ بتاؤ؟''

''تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ میں اس صورتِ حال میں اس سے کیوں اور کس لیے مل سکتی ہوں؟'' اس کا لہجہ کچھ مدھم ہوا۔

''تم حد سے زیادہ پرائے مسئلے میں انوالو ہو رہی ہو، مجھے قطعی یہ پسند نہیں۔'' وہ اب اصل بات پر آ گیا تھا۔

''تمہیں اور کیا، کیا ناپسند ہے مجھے بتا دو، رہی بات انوالو ہونے کی تو ان کی پریشانی میں ان کے ساتھ ہوں میں، تمہیں یہ کہنا بھی نہیں چاہیے۔''

''میری پسند سے تمہیں کیا سروکار اگر ہوتا تو تمہیں پروا ہوتی میری؟''

''اور کس طرح پروا کروں میں تمہاری عشان، تمہارے دل میں جو اصل بات ہے وہ بتا دو برائے مہربانی مختلف قسم کے حوالوں، بہانوں اور باتوں سے کام مت لو۔ صاف، صاف کہو میں سن سکتی ہوں۔''

''تمہاری دوست کی وجہ سے ہماری روٹین ڈسٹرب ہو رہی ہے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے عشان، وہ بے چاری جو خود پریشان ہے، وہ ہمیں کیوں ڈسٹرب کرے گی، تم سے اس کا یہاں رہنا برداشت نہیں ہو رہا ناں؟''

''ہاں یہی سمجھو، مجھے کسی کی غیر ضروری مداخلت پسند نہیں اپنی زندگی میں...... جب میں اپنے بہن بھائیوں سے الگ رہ سکتا ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے اپنے سپریٹ گھر میں کسی اور کی ضرورت نہیں، نہ ہی گنجائش ہے۔''

''جانتی ہوں تم کتنے خود پسند ہو مگر عشان وہ ہمیشہ کے لیے نہیں رکی، وہ چلی جائے گی۔ بس کچھ عرصے جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔''

''مجھے تو یہ لگتا ہے کہ وہ ہمیشہ یہاں رہے گی، جس سچویشن کو اس نے کری ایٹ کیا ہے۔''

''تم سے میری ایک دوست چند دن کے لیے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ اتنی خود دار ہے اگر اسے بھنک بھی پڑ جائے تمہاری باتوں کی تو ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رکے، یہ تو میں نے زبردستی روکے رکھا ہے۔ میں اسے اس مشکل میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی، تم سن لو، آئندہ یہ بات مت کہنا۔''

''آئندہ میں اس سے ڈائریکٹ بات کروں گا۔ تم سے کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' وہ پہلے سے سوچ کر بیٹھا تھا۔

''عشان تم اسے کہو گے کہ وہ ہمارے گھر سے چلی جائے...... تم اسے کہو گے؟''

''اگر وہ خود دار ہے تو اس کو یہ سب کہنے کی بھی

ضرورت نہیں ہوگی۔ میرے خیال سے اسے یہ سب خود سوچنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے کسی کی لائف ڈسٹرب ہو رہی ہے۔“

”عشان وہ ہماری محتاج نہیں ہے، وہ اکیلے گھر میں رہ سکتی ہے مگر ایسا میں نے اسے کرنے دیا تو وہ کبھی بھی وہاں نہیں جائے گی۔ میں اس کا گھر برباد ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی۔“

”تم صرف اپنے گھر کی فکر کرو محترمہ!“ اس کا انداز طنزیہ تھا۔

”تمہارے کیا ارادے ہیں، آخر کس سینس میں تم مجھے یہ سب کہہ رہے ہو۔“

”تمہاری عقل اگر کام کرے تو تمہیں خود سمجھنا چاہیے یہ سب۔ میں چاہتا ہوں وہ اب یہاں سے چلی جائے۔“ اس نے صاف صاف کہا۔

”میں اس کو کہوں یہاں سے چلی جائے۔ جو میرے ہر دکھ سکھ میں کام آئی، میں اس کو کہوں جو کالج لائف سے میرے مسئلے حل کرتی آئی ہے۔ میں اس کو آج اکیلا چھوڑ دوں جو میرے لیے کبھی سائبان تھی۔ جس نے سگی بہنوں سے زیادہ میرا خیال رکھا۔ مجھے چاہا، مجھے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ شادی کے بعد بھی ہر جگہ، ہر گیدرنگ میں مجھے ساتھ رکھا۔ کبھی حسن نے تو اعتراض نہیں کیا۔ مجھے بہنوں کی طرح سمجھا، اس سے زیادہ خیال کیا اور تم آج کیا کچھ سوچ رہے ہو، ..... تف ہے تم پر عشان تمہیں یہ سب بولنے سے پہلے کچھ تو سوچنا چاہیے تھا کچھ تو بھرم رکھ لیتے میرا۔“

”مجھے اس سے مطلب نہیں ہے..... بس تم اسے کہو اب جائے جہاں بھی اس کا دل چاہے، جو عورت اپنا گھر بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی وہ کسی اور کا گھر بنا رہنے کیوں دے گی۔“

”تمہاری سوچ، تمہاری ذہنیت اب اور کتنی گرے گی عشان، کتنا حیران کرو گے مجھے آج..... میں بھول چکی تھی کہ سب مرد ڈاکٹر حسن کی طرح نہیں سوچتے، اس کے جیسی سوچ نہیں رکھتے۔“

”تو کیا برائی تھی، کر لیتیں نا ڈاکٹر حسن سے شادی کس نے روکا تھا؟“

”اپنی گندی زبان قابو میں رکھو، اب ایک لفظ بھی کہا تم نے تو میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکوں گی۔“ وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

”شوق سے جاؤ، میں نہیں روکوں گا نہ ہی مناؤں گا سن لو، کل میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں اگر ایک ماہ کے بعد جب میں گھر آیا اور میں نے اسے یہاں دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔ پھر تم کیا میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا سمجھیں!“ وہ اپنا تکیہ اور چادر لے کر باہر نکل گیا۔ ڈرائنگ روم میں سونے کے لیے۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ عجیب مصیبت گلے پڑ گئی تھی، ایک طرف وہ پریشانی اس پر یہ سب، اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ عشان کا یہ روپ اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ یہ سب اس کے لیے حیرت کا ایک جھٹکا تھا جو اسے مزید پریشان کر گیا۔ ایسے میں بھلا وہ اس کی پریشانی کا کیا حل نکالتی۔

☆☆☆

وہ پہلی مرتبہ اس کے ساتھ کہیں باہر آئی تھی، اسے پہلی مرتبہ بہت اچھا لگا تھا۔ بہت حد تک وہ خود کو مکمل محسوس کر رہی تھی۔ بہت بڑے عرصے بعد اسے ذہنی اطمینان حاصل ہوا تھا۔ حسن، علی کو گود میں اٹھائے مختلف قسم کے کھلونے دیکھ رہا تھا۔ علی کوئی چیز ہاتھ میں پکڑ لیتا وہ فوراً اسے پیک کروانے کے لیے دے دیتا۔

”بس کریں آپ، کیا پوری دکان خریدنی ہے۔“ اس نے آخر ٹوک دیا۔

”پوری مارکیٹ نہ خرید لیں؟“ اس نے شاپر تھامتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ پہلی دفعہ وہ اس کے ساتھ اس انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کو بے حد خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے اور خریداری کرتے ہوئے بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔

شاپنگ مال کے سیکنڈ فلور پر آتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رکا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ امبر کے ساتھ جیولر کی شاپ سے باہر نکل رہی تھی۔ خاصی غائب دماغ سی اس نے شاید نہیں مگر امبر نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دم سے جیسے شرمندہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس میں شرمندگی کی کیا بات تھی۔ اس نے بعد میں سوچا، وہ علی کو مومنہ کو پکڑاتے ہوئے بجائے پیچھے کے آگے کی جانب تیزی کے ساتھ بڑھا، مومنہ کا رخ دوسری جانب تھا وہ دیکھ نہ سکی تھی۔

”چلو نیچے چلیں، دیر ہو رہی ہے۔“ وہ عجلت کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ کچھ حیرانی سے اس کی ایک دم جلد بازی اور گھبراہٹ پر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی مگر اس کی حیرانی ایک سکتے میں تب بدلی جب پارکنگ ایریا کی طرف آتے ہوئے اس نے عین سامنے چند قدم کے فاصلے پر اسے دیکھا اور پہچان لیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت کھڑی رہ گئی، وہ بھی رکا رہا۔ شاید وہ بھی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں کامیاب ہو گیا جبھی حیرانی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے اس کا زیر لب نام بھی لیا تھا۔ وہ حیرت سے آگے بڑھا۔

مومنہ کا دل ایک دم سے جیسے رک گیا تھا مگر وہ اسے پوری طرح سے نظر انداز کرتے ہوئے آگے تیزی سے بڑھی۔ حسن گاڑی تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے کار تک آئی فوراً دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی پہلے سے اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی آگے بڑھا لے گیا۔ اس نے مڑ کر اسے گھبراتے ہوئے دیکھا، وہ کچھ فاصلے پر اتنا ہی حیران پریشان کھڑا تھا۔ اپنی ٹانگ تھامے ہوئے۔ دوسرے لمحے گاڑی ریورس ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ بلاشبہ سعید تھا، وہ زندہ تھا..... اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ خوش ہو یا غم منائے..... اس کی زندگی اب ہی تو سیٹ ہوئی تھی۔ پھر سے ایک طوفان..... یہ سچ تھا کہ وہ سعید کو بھلا نہیں سکی تھی مگر حسن کے ساتھ رہتے ہوئے وہ مطمئن تھی اور عنقریب وہ اسے مکمل طور پر بھول جاتی اگر آج یہ واقعہ نہ ہوتا۔ سب سے پہلی بات کہ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا اور پہچان بھی لیا تھا۔ بھلا کیسے نہ پہچانتا..... اس کی شکل تو نہیں بدلی تھی دوسرے لمحے اسے اپنی ہی سوچ پر غصہ آیا۔ علی گود میں بیٹھا کھلونے کے ساتھ کھیل رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے خول میں سمٹے، اپنی اپنی پریشانیوں میں گم تھے ایک دوسرے سے مکمل طور پر بے خبر، بے پروا۔

☆☆☆

”مجھے اب آخری مرتبہ اس سے بات کرنی ہے امبر ٹو دی پوائنٹ..... صاف، صاف مجھے اندازہ ہے اب وہ انکار نہیں کرے گا۔“ وہ جب سے آئی تھی چپ چپ تھی، آج صبح حسب معمول اس نے یہی بات کی۔

”کاش میں تم دونوں کو سمجھا سکوں؟“ وہ اپنے لیے بریڈ پر مکھن لگاتے ہوئے افسوس کے ساتھ بولی۔ عشان کو گئے ہوئے بارہ دن ہو چکے تھے۔ اسے یہی فکر تھی کہ کچھ دنوں بعد جب اس کی واپسی ہوگی تو کیا ری ایکشن ہوگا۔ ساحرہ کو پتا چلا تو وہ کیا سوچے گی، اسے کتنی تکلیف ہوگی۔ ”اس سے پہلے اگر کوئی حل نکل آئے تو اچھا ہے.....“ وہ خود کو کوسنے لگی،

کل اسے اپنے ساتھ مارکیٹ جانے پراسی نے فورس کیا تھا ورنہ وہ بار بار انکار کر رہی تھی۔

''تم نے دیکھا امبر، اس کے چہرے پر کیسا سکون اور کیسی خوشی تھی۔ تم نے دیکھا امبر وہ کتنا خوش تھا کتنا مگن...... اتنی جلدی امبر...... اتنی جلدی...... وہ اپنی دنیا میں سیٹ ہو گیا اور میں ابھی تک پریشان ہوں...... فکر مند ہوں...... میں کیوں پریشان ہوں امبر...... کس کے لیے...... اس کے لیے جو اپنی زندگی میں ہر طرح سے خوش ہے، مجھے بے چین کر کے پریشان کر کے، مجھے نہیں سوچنا چاہیے اگر وہ خوش رہ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں اگر وہ بے چین نہیں ہے تو میں کیوں ہوں۔'' اسے جیسے دورہ پڑ چکا تھا۔

''تمہیں بھی خوش رہنا چاہیے...... تمہارا حق ہے زندگی پر...... مگر یہ ٹھیک نہیں ہے، تم اسے مکمل طور پر اس کا ہونے کے لیے چھوڑ رہی ہو، اس پر تمہارا حق پہلے سے ہے...... اسے ڈھیل مت دو ساحرہ۔''

''میں زبردستی اسے خود پر یا خود کو اس پر مسلط ہونے دینا نہیں چاہتی۔ تم باتوں سے مجھے بہلا چکیں اب نہیں......'' وہ چائے کا بھرا ہوا کپ میز پر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے اب انتظار رہے گا اس کی طرف سے اس کاغذی رشتے سے آزادی کا، ورنہ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا اور یہ فیصلہ بھی بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ جواب ہوگا۔'' وہ سخت لہجے میں کہتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ امبر نے بریڈ کا آدھا حصہ بے دلی سے پلیٹ میں رکھا اور سوچنے لگی علاوہ اس کے وہ کیا کر سکتی تھی۔

☆☆☆

''میں نے تمہیں کہاں نہیں ڈھونڈا مومنہ...... ہر اس جگہ جہاں میں جا سکتا تھا۔ سارے دارلامان دیکھ لیے، سارے ادارے، ہر جگہ، شہر کا چپہ چپہ چھان مارا مگر تم نہیں ملیں۔ کتنی دعائیں کی تھیں میں نے تمہارے ملنے کی اور کل تم ملیں بھی تو اجنبیوں کی طرح، نظریں چرا کر بھاگ رہی تھیں تم مجھ سے اور میں حیران تھا جس کے لیے تم نے سب کچھ چھوڑا اسے تم نے کتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔ اب تک میں سمجھتا رہا کہ تم مجھ سے محبت کرتی تھیں تم میرے لیے گھر سے بھاگ نکلیں مگر اب پتا چلا میں کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار تھا۔ تم صرف اپنے لیے، اپنی آزادی کے لیے گھر سے نکلیں تھیں۔ میں تو ایک بہانہ تھا بس ایک بہانہ...... جب تمہیں مجھ سے بھی فرار ملا تو تم نے اپنی دنیا بسالی۔'' نمبر ملنا کون سا مشکل تھا وہ بھی شہر کے مشہور فزیشن کا اور اب وہ ڈاکٹر حسن کے گھر کے نمبر پر اسے وہ سنا رہا تھا جو کل سے اس کے اندر لاوا بن کر دہک رہا تھا۔ وہ سارا افسوس، دکھ، تکلیف۔

''تم نہیں سمجھو گے سعید...... اور میں تمہیں اپنے بارے میں کوئی وضاحت دے کر بھی کیا کروں گی، یہ ایک لمبی کہانی ہے، پھر تم اتنے عرصے کہاں تھے بتاؤ...... کیا میں نے سوچا نہیں ہوگا، یاد نہیں کیا ہوگا تمہیں...... کیا میں پریشان نہیں ہوئی ہوں گی۔ وہ ایک الگ بات کہ مجھے کسی نے پناہ دے دی، سہارا دے دیا، ورنہ آج میں کس حالت میں ہوتی اس کا تصور بھی مشکل ہے پھر مجھے کیسے ڈھونڈتے تم بتاؤ...... اور کیا پچویشن تھی جو مجھے ڈاکٹر حسن سے شادی کرنا پڑی یہ میری مجبوری تھی سعید...... میرے پاس اور کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔'' وہ اس وقت جتنی اپنی صفائیاں دے سکتی تھی دے رہی تھی۔

''تم نے تو اپنا مستقبل محفوظ کر لیا...... بچ گیا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے، بے گھر تو میں بھی ہوا تھا مگر تمہارے انتظار میں بھٹکتا رہا اس امید پر کہ تم مجھے کبھی نہ کبھی ضرور ملو گی اور اسی حالت میں ملو گی جس حالت میں انتظار میں، میں ہوں مگر تم تو مجھے مکمل طور پر بھلائے ایک بھرپور زندگی گزار رہی ہو، مجھ سے پوچھو جو تمہاری وجہ سے ہر چیز سے گیا۔ میں نے اپنے حصے کا مکان چھوڑا...... اپنی ٹانگ کھو دی تمہارے لیے، تمہیں میں نے ہر تکلیف سے بچانا چاہا تمہیں بھگا کر... خود گولیوں کی زد میں آ گیا...... وہ تو میری تقدیر میں زندگی لکھی تھی جو مل گئی اور ایک دوست بروقت پہنچ گیا۔ میں بچ گیا مگر میری کیا حالت تھی، اتنی بے چارگی میں بھی میں نے اپنی زندگی کی دعائیں صرف اس لیے مانگیں کہ تمہارا اور کوئی نہیں اگر میں مر گیا تو تم کیا کرو گی، کس کے ہاتھ لگو گی، کہاں جاؤ گی...... کاش مجھے اندازہ ہوتا تو اپنے مرنے کی دعا کرتا...... کم از کم یہ دن نہ دیکھنا پڑتے مجھے۔'' اس کی آواز میں نمی تھی، وہ رو رہا تھا۔

''اب تو تمہیں میرے بچ جانے کا افسوس ہوگا ناں...... کوئی بات نہیں، تم دعا کرو میں مر جاؤں...... میں مر جاؤں مومنہ...... میں مر جاؤں۔'' کال کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا دل بیٹھ گیا تھا ریسیور کو دیکھتے ہوئے وہ ساکت تھی، وہ جو بے بسی سے کہہ رہا تھا سچ تھا۔ وہ جس تکلیف سے بھی گزرا تھا اسی کی وجہ سے گزرا تھا اور وہ جتنی بھی تکلیف دیکھ رہا تھا اسی کی وجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس فی الحال کوئی حل نہیں تھا۔ وہ جلد باز تھی اور بے وقوف بھی مگر اس وقت اسے اس کا احساس پوری طرح سے ہو رہا تھا مگر وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے لیے سوچ رہی تھی مگر اس کی سوچ بھٹک رہی تھی۔

☆☆☆

''مجھے لگتا ہے ڈاکٹر صاحب آپ ڈاکٹر ساحرہ کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ کبھی بھی نہیں...... ان دنوں میں جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو بالکل نہیں...... بہلا رہے ہیں آپ مجھے اور اپنے آپ کو اور اب میں مزید نہیں بہل سکتی۔'' وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

''میں اسے کیسے بھلا سکتا ہوں، جس کے ساتھ ایک عرصہ گزارا ہے میں نے اسے بھولنے کے لیے کم از کم ایک زندگی کافی نہیں۔'' وہ کشن کے اوپر بیٹھا ہوا تھا بہت خاموش اور چپ چپ، اس نے اس کی چپ کو توڑا تھا۔

''مگر وہ تو چھوڑ کر چلی گئی ناں......''

''مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی تو میں اسے روک لیتا، میں اس کو جانے ہی نہیں دیتا۔''

''مگر وہ تمہیں بھلا چکی ہے پوری طرح سے اور وہ نفرت کرتی ہے تم سے۔'' وہ اس کی بات پر ہنس دیا۔ استہزائیہ ہنسی خود اپنے آپ پر۔

''جائیں اسے منا کر لے آئیں ناں کیوں چھوڑ رکھا ہے اسے۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی اور طنز بھی ساتھ۔

''وہ خود ہی آ جائے گی...... تم دیکھنا وہ ضرور آئے گی۔''

''اگر ایسا ہے تو کوئی ایک انتخاب کرنا ہوگا یا میں یا پھر وہ؟''

''میں نے کہا نا یہی کافی ہے کہ تم اس گھر میں ہو، باقی اس سے اس کی حیثیت تم نہیں چھین سکتیں، آئندہ ایسی بات بھی مت کرنا۔'' وہ کچھ تیز ہوا تھا، بہت دیر سے اسے برداشت کر رہا تھا۔

''میں اپنے گھر میں کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی سن لیں آپ۔'' وہ رعب سے کہتے ہوئے علی کے لیے فیڈر بنانے لگی۔

”یہ گھر اس کا ہے اور اسی کا رہے گا سن لو تم، وہ اگر چاہے تو تم یہاں رہو گی ورنہ نہیں، سامان گول کرلو اپنا، تمہاری اتنی ویلیو کب ہو گی کہ تم اسے کچھ کہنے لگو، آئندہ زبان بند رکھنا اپنی، اس کے لیے کچھ کہنا تو دور کی بات سوچنا بھی مت۔“ وہ بپھرتا ہوا اٹھا تھا۔ ”کبھی مت بھولنا کہ اس نے تمہیں سہارا دیا اور تم نے اس کے ساتھ جو کیا سو کیا جو میں نے بھی کیا سو کیا مگر میں اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا، اتنے دنوں میں، میں نے ہر طرح سے کوشش کی کہ تمہیں خوش رکھ سکوں مگر تم اب حد سے بڑھ رہی ہو، اپنی لمٹ کراس نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔“ اس نے شال کا پلو پشت پر پھینکا اور کمرے سے نکل گیا۔

”تو یہ ہے تمہاری حیثیت اس گھر میں مومنہ بی بی.... دیکھ لو بہت غور سے کسی بھی وقت اوقات دکھا دی۔“ وہ علی کو گود سے اتار کر لیٹ گئی اور خود کو کوسنے لگی، کوئی خوش فہمی تھی جو دور ہو گئی۔

”تو وہ جب بھی اس گھر میں واپس آئی مجھے گھر بدر کر دیا جائے گا...... اگر وہ نہ چاہے گی تو لمحوں میں نکال دیا جائے گا پھر تمہاری حیثیت کیا رہ جائے گی...... کیا عزت ہے تمہاری اب بھی......“ وہ خود کو بہت کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی اور اسی لمحے اس نے فیصلہ کیا تھا...... حتمی فیصلہ۔ اس کی کشمکش ختم ہوئی مگر بے چینی شروع ہوئی تھی، وہ پھر سے روتے ہوئے علی کو نظر انداز کرنے لگی۔ یہ سزا وہ اس بچے سے زیادہ اپنے تئیں اپنے آپ کو دے رہی تھی۔ جس کا خمیازہ بھگتنا سب کو ہی تھا۔

☆☆☆

”تو وہ ابھی تک یہیں پر ہے، میرے کہنے کے باوجود بھی۔“ وہ کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا، اس کے سامنے خاموش رہا مگر جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں گئی وہ امبر پر برس پڑا۔

”تمہیں آخر اس سے کیا تکلیف ہے...... چلی جائے گی کچھ دن اور کون سا نقصان ہو جائے گا ہمارا آخر......“ وہ اسے چائے کا کپ پکڑاتے دھیمے لہجے میں کہنے لگی۔

”نقصان نہیں تو فائدہ بھی نہیں ہوا...... اور جب میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے گھر میں کسی کا عمل دخل قبول نہیں تو بس نہیں۔“ اس کی آواز کچھ اونچی ہوئی تھی۔

”آہستہ عشان، پلیز کچھ تو خیال کر لو پلیز...... میری خاطر......“ اسے ڈر تھا وہ سن نہ لے۔

”کیوں خیال کر لوں...... جب تمہیں خیال نہیں، جب اسے خیال نہیں۔“

”دیکھو بات کو بڑھاؤ مت، خدا کے لیے اندر چلو، کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ بری طرح سے پھنس گئی تھی۔

”چلو اس کے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں، صاف صاف ابھی اسے بتانا ہو گا کہ مزید وہ یہاں کتنا عرصہ ٹھہرے گی یا پھر ہمیشہ کے لیے ٹھہرنے کے ارادے ہیں، ایسے میں کم از کم میں اپنا گھر خیراتی ادارے کی جگہ پیش نہیں کر سکتا۔“

نیچے سے آتی آوازوں پر اس کی آنکھ فوراً کھل گئی وہ ابھی تو سوئی تھی اٹھ کر کھڑکی تک آئی، امبر کی آواز بہت ہلکی تھی، عشان ایک دم سے دہاڑا تھا مگر اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ اس نے اپنا دماغ نیند کے زیر اثر محسوس کیا اور واش روم میں گھس گئی، فی الحال اتنا ہی سمجھ آیا کہ وہ دونوں لڑ رہے ہیں، اس نے منہ پر نیم گرم پانی کے چھینٹے مارے اور کمرے سے نکلی اس خیال سے کہ ان کو سمجھائے یا چپ کرائے اپنے تئیں وہ صلح کی نیت سے جا رہی تھی

اور دل ہی دل میں امبر کو برا بھلا کہہ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ جھگڑے کی بنیاد اسی نے ڈالی ہوگی۔

”یہ میرا گھر ہے کوئی دارالامان نہیں جو چاہے منہ اٹھا کر آجائے اور ڈیرا ڈال کر بیٹھ جائے۔“ اس کے قدم سیڑھیوں کے بیچ رک گئے، اتنے تیکھے لفظ اس کا جی بالکل بھی یقین کرنے کو نہیں چاہا تھا۔

”اسے کہو کہ اپنا سامان اٹھائے اور جہاں دل چاہے چلی جائے۔ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں اس میں ہمارا قصور نہیں، تم نے ٹھیکا نہیں لے رکھا۔“ وہ وہیں ساکت ہو کر جم گئی۔ اسے یقین کرنا پڑا یہ سب اس کے لیے کہا جا رہا تھا، اس کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ یہ دن بھی دیکھنے کو ملا، وہ خود کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں گئی آناً فاناً اپنی چند چیزیں سمیٹیں، بیگ میں سیل فون اور اے ٹی ایم کارڈ ڈالا اور بیگ ہاتھوں میں اٹھائے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئی تھی جہاں وہ کتنی ہی دیر سے وجۂ تنازعہ تھی۔

”کاش تم آرام سے مجھے کہہ دیتیں، جب میں جا رہی تھی تو مجھے نہ روکتیں...... کم از کم آج تمہارے شوہر کے منہ سے میں اپنے لیے ایسے الفاظ نہ سن سکتی۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”کاش تم مجھے مزید ذلیل ہونے کے لیے نہ روکتیں، میں سمجھتی رہی تمام مرد حسن احمد کی طرح رشتوں اور ناتوں کا احترام کرتے ہیں۔ وسیع قلب رکھتے ہیں، میں تو عشان کو بھائیوں کی طرح سمجھتی رہی۔“ وہ اپنی زبان سے اقرار کر رہی تھی۔ ”مگر میں غلط تھی، میں نے سمجھنے میں غلطی کی جس کی معافی چاہتی ہوں، عشان صاحب اتنا عرصہ میری وجہ سے جو تکلیف آپ دونوں کو ہوئی اس کی میں معافی چاہتی ہوں...... اب تک جو میں آپ کے گھر کا کھاتی پیتی رہی ہوں اس حساب سے کچھ رقم میں آپ کے اکاؤنٹ میں بھیج دوں گی، باقی بھول چوک کی معافی دے دیجیے گا، امید ہے میری وجہ سے اب امبر کو کچھ سننا نہیں پڑے گا، اپنے تئیں آپ کا نقصان پورا کرنے کی میں ہر ممکن کوشش کروں گی۔“ وہ اپنے اوپر کنٹرول کرتی اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھی۔

”ساحرہ اس حد تک شرمندہ کرو گی مجھے؟“ امبر اس کے سامنے پانی پانی ہو رہی تھی۔

”شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے ڈیئر...... ایک دفعہ بھی تمہارا خیال نہ کیا میں نے۔“ اس کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور طنز بھی، دکھ اپنے لیے، طنز عشان کے لیے۔

”تم ایسے کیسے جا سکتی ہو ساحرہ...... ابھی اس وقت...... نہیں رکو پلیز......“ امبر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کس طرح اپنی پوزیشن کلیئر کرے۔

”کیوں، کیا ابھی کچھ بے عزتی باقی ہے جو تم میری کروانا چاہتی ہو؟“

”ساحرہ، کیا میں یہ سب کر سکتی ہوں؟“ وہ بے بس سی کھڑی تھی۔

”تمہیں کرنے کی ضرورت نہیں تمہارا شوہر کافی ہے۔“

”محترمہ اگر آپ کو دروازے کا پتا ہے تو پلیز ورنہ میں راستہ بتا دوں۔“ اپنے لیے وہ ایک لفظ بھی برداشت نہ کر سکا تھا جبکہ اسے مسلسل سنا رہا تھا۔ وہ صرف سنانا جانتا تھا۔

”بہت شکریہ عشان صاحب اپنے گھر سے اتنی عزت دے کر رخصت کرنے کا۔“ اب اس کا یہاں ایک لمحہ بھی رکنا محال تھا۔

”رکو ساحرہ پلیز، میری بات سن لو صرف ایک دفعہ......“ وہ پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے لپکی۔

”کہاں جاؤ گی تم اس وقت۔“ گھڑی رات کے دس بجا رہی تھی۔ اسے یہی فکر ہو رہی تھی۔

”خدا کے لیے امبر اب نہیں بہت ہو چکا، میں کہاں جاؤں گی یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

”اگر ایسا ہے تو اپنا سامان سمیٹ کر جاؤ واپسی کا ہر خیال بھلا کر۔“ وہ زہر اگلتا مڑا۔ امبر وہیں دروازے کے پاس ساکت ہو گئی تھی اور وہ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ کہاں جانا تھا یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے کوک اٹھا کر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں گھس گیا اور امبر اپنی بے بسی پر کڑھتی رہ گئی، زندگی میں پہلی دفعہ اسے کسی نے اس قدر مجبور اور بے بس کر دیا تھا حد درجہ شرمندہ بھی۔

☆☆☆

”چڑیل ہے وہ کسی سائے کی طرح پھر رہی ہے اس گھر میں، بدروح کی طرح، ہر جگہ...۔ اس گھر میں، تمہارے دل میں، ان تصویروں میں، اس گھر کے ہر کونے میں۔“ وہ پاگلوں کی طرح اس کی تصویریں دیوار سے اتار کر زمین پر پھینک رہی تھی۔

”مت کرو، پاگل ہو گئی ہو تم، احساسِ کمتری کی شکار ہو، مینٹل کیس ہو تم۔“ وہ دوڑتے ہوئے اندر آیا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اس نے تصویریں اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہیں اس کوشش میں ٹوٹے ہوئے فریم کی کرچیاں اس کے ہاتھ میں چبھ گئی تھیں۔ تکلیف کا ایک احساس سا ابھرا اس کی انگلی سے خون بہنے لگا اور فریم فرش پر گر گیا۔ وہ جھک کر تصویر سے ٹوٹے ہوئے فریم کی کرچیاں دیوانہ وار ہٹانے لگا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

”سوری، ساحرہ ... آئی ایم سوری...... میں تمہارا مجرم ہوں، میں تمہارا گناہ گار...... مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو۔“ تصویر اس نے سینے سے لگا لی۔ اس کا شدت سے دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے اسی دن کی طرح جب کچھ دن پہلے اس نے علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی لمحے کی طرح اور وہ واقعی ویسے ہی رو رہا تھا۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر۔

”تمہیں اس سے اتنی ہی محبت ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے، لے آؤ اسے ہمیشہ کے لیے...... لے آؤ۔“ وہ ہنوز اسی انداز میں چیخی۔

”چھوڑ دوں گا تمہیں چھوڑ دوں گا، لے آؤں گا اسے میں، آئے گی وہ، تم دیکھنا وہ ضرور آئے گی۔“ اس نے کلائی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور تصویریں ہاتھ میں لیے فرش سے اٹھا۔

”تو پھر جاؤ اور لے آؤ، آزاد کرو مجھے۔“ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اس نے کھینچ کر ایک دو تین تھپڑوں کی برسات کر دی۔ اس کے گالوں پر اس کی انگلیوں سے ٹپکتا خون لگ گیا، وہ چیخ چیخ کر رونے لگی ساتھ علی بھی۔ اس نے زور سے مٹھی بند کرتے ہوئے بیڈ کی طرف دیکھا، علی نہیں تھا، اس کا بستر نیچے لڑھک رہا تھا اور اس کی چیخیں بلند تھیں وہ فرش پر گر چکا تھا دوسری طرف اس نے تصویریں نیچے پھینکیں اور بھاگتا ہوا علی کے پاس گیا، اسے اٹھا کر ساتھ لگایا شکر ہے وہ گہری چوٹ سے بچ گیا تھا مگر سر پر ہلکا سا نشان نیل کی طرح پڑ گیا تھا سر کے پچھلے حصے میں بھی ضرب آئی تھی۔ وہ اپنی تکلیف بھلا کر اسے ٹٹولنے لگا تھا بدحواسی سے۔

علی کی شرٹ اس کے خون سے سرخ ہو گئی تھی دونوں انگلیوں سے کافی خون بہہ چکا تھا اس نے علی

کو چپ کراتے ہوئے ساتھ میں دراز سے بینڈج نکال کر انگلیوں پر لپیٹی خون کچھ بند ہوا تھا پاؤڈر لگانے اور بینڈج کرنے سے۔ اس کے بعد فوراً اس کے کپڑے تبدیل کیے اور اسے گود میں لے کر منہ میں فیڈر دے دیا۔ علی اب خاموشی سے فیڈر پینے لگا تھا اس کی سسکیاں کم ہو گئی تھیں۔

اس نے زور سے علی کو خود سے لپٹایا ہوا تھا اس وقت ایک لمحے کے اندر اسے سب کچھ بھول گیا تھا یاد تھا تو صرف وہ جو اس کے سینے سے لگا وقفے وقفے سے سسکیاں لے رہا تھا۔ اسے تکلیف سی ہو رہی تھی وہ اسے چپ کرانے کی کوشش میں بہلانے لگا۔

تصویریں فرش پر بکھری پڑی تھیں، جن کو چننے کے لیے اس نے اپنے ہاتھ زخمی کیے لاشعوری طور پر دوبارہ ان تصویروں کو اس نے خود فرش پر پھینکا تھا۔ تصویریں جن میں وہ تھی جس کو اس نے بے حد چاہا تھا۔ مومنہ کمرے سے نکل گئی تھی اس لمحے کمرے میں سوائے اس کے کوئی نہیں تھا، وہ علی کو خود سے لپٹائے تھپکیاں دے رہا تھا۔ اولاد کیا چیز ہے اس سے پہلے اسے پتا نہیں تھا۔

☆☆☆

''اب تو اس کی تصویریں بھی میں کمرے سے نکال چکا ہوں، تم نے کہا تھا اس کا ذکر مت کرو، میں نے ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ اس گھر میں بدروحوں کی طرح نہیں پھرتی، نہ ہی میرے دل میں اب کیا چاہتی ہو تم؟'' پچھلے دنوں اس نے بہت سوچا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آیا مگر جب بھی وہ علی کی طرف دیکھتا اس کا دل پگھل سا جاتا، وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی چھوٹے سے بچے کو اپنی ماں سے جدا کر سکتا تھا، اس لیے اس نے سمجھوتے کا راستہ اختیار کیا، وہ محض علی کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ رہی بات ساحرہ کی تو وہ اسے کبھی بھی چھوڑ نہیں سکتا تھا مکمل طور پر اور یہ بھی پتا تھا کہ وہ اب اسے آسانی سے نہیں قبول کرے گی۔ اس نے وہ فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا تھا۔ فی الحال وہ اپنی زندگی میں سکون چاہتا تھا۔

''مگر وہ آپ کے دل پر حکومت کرتی ہے؟''
اس کا لہجہ مدھم مگر کاٹ دار تھا۔

''میرے دل پر اب خاموشی حکومت کرتی ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم الگ سے اپنی جگہ بناؤ...... تم میرے دل میں اپنا خانہ الگ سے بناؤ، تم اس کو ہٹانے کے چکر میں خود کو بہت پیچھے کر دیتی ہو۔''

''میں شاید کامیاب نہ ہونے پاؤں۔'' لہجے میں تلخی گھلی تھی۔

''اگر تم سچے دل سے چاہو تو اتنا ہو سکتا ہے کہ ہم مل کر اچھی زندگی گزار سکیں، میں تھک چکا ہوں ان جھگڑوں، لڑائیوں اور نفرتوں سے۔ مجھے مزید مت تھکاؤ...... مومنہ اپنے آپ پر نہیں مجھ پر نہیں اس بچے پر رحم کرو، اس کے بارے میں سوچو...... اسے ہماری کتنی ضرورت ہے، ہم دونوں کی ہی...... کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ ہمارا بچہ ایک بھرپور مکمل زندگی گزارے، وہ خوش رہے، ہم اسے خوش رکھیں۔''

''میں اس کی ماں ہوں، آپ مجھے اس کی دشمن کیوں سمجھتے ہیں؟''

''تم اپنے آپ کو اپنا اور اس کا دشمن بنا رہی ہو، تم ایسا مت کرو میں ایسا نہیں سمجھوں گا، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔'' اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا۔

''آپ مجھے معاف کر دیں گے......؟''
ڈرتے ڈرتے پوچھا گیا۔

''معاف کرنے والی خدا کی ذات ہے، میں تو خود خطاکار معافی کا طالب ہوں۔'' اس کے لبوں پر ایک پرسکون مسکراہٹ در آئی۔

''میں کوشش کروں گی آپ کو آئندہ کبھی نہ ستاؤں۔'' وہ ہتھیار پھینک چکی تھی، اس کے دل میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خوشی، جس کی تلاش میں وہ گھر سے نکلی تھی۔

☆☆☆

یہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جو بڑی مشکل سے فوری طور پر اسے کسی جاننے والے کے توسط سے ملا تھا۔ رات اس نے کلینک میں گزاری تھی، صبح ہوتے ہی اس نے خود کو ہر طرح کی صورت حال کے لیے مکمل طور پر تیار کر لیا تھا۔ وہ خوب رو چکی تھی اور اب اس نے کبھی نہ رونے کا فیصلہ کیا تھا، اسے حسن احمد کی طرف سے ملنے والے نوٹس کا انتظار تھا اور بس۔

وہ خود کو تنہا زندگی گزارنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔ اس کا دو کمروں کا فلیٹ، اس کا مختصر سا سامان اور گھر میں خاموشی اور قدرے سکون، اس نے پہلے کی طرح پرانی ڈیوٹی پر جانا شروع کر دیا تھا وہ خود کو بے حد مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ رات گئے جب اس کی گھر واپسی ہوتی تو سوائے تھکن کے اس کے پاس کچھ نہ ہوتا کبھی کچھ کھا پی کر سو جاتی اور کبھی اسے کھانا بھی یاد نہ رہتا اور وہ گھر پہنچ کر یونہی چینج کیے بغیر ہی سو جاتی۔

اس کی زندگی ایسے ہی گزرتی رہتی اگر حسن احمد کی طرف سے اس کے لیے وہ لفافہ نہ پہنچا ہوتا۔ اس نے بے یقینی سے لفافہ کھولا تھا۔ اس کی بے یقینی مزید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ بہت مشکل ہے سعید بہت مشکل، بھول جاؤ اب وہ سب۔ یہاں فون مت کرنا، مر گئی تمہاری مومنہ، کل سے ایک نئی مومنہ نے جنم لیا ہے، جو صرف اپنے بچے کے لیے جیے گی، میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تو کہو نا کہ تم یہ بنگلا، گاڑی یہ ٹھاٹھ باٹھ نہیں چھوڑ سکتیں ہیں تو تمہیں ایک عام سا گھر دوں گا، عام سی زندگی، تم بھلا اتنا بڑا سودا کیسے کرو گی پھر ایک لنگڑے، ایب نارمل شخص کے ساتھ زندگی کیسے گزارو گی جو تمہارا خواب تھا جس کے لیے تم نے دنیا چھوڑی اور اب تم اسے صرف اپنے مفاد کی خاطر چھوڑ رہی ہو، بس یہی بات ہے مومنہ...... بہت آسان ہے تمہارے لیے یہ سب ختم کرنا...... مجھے برباد کر کے، میری زندگی برباد کر کے تم خوش رہ رہی ہو مگر تم خوش نہیں رہ پاؤ گی کبھی نہیں۔'' اس کے دل سے بددعا نکلی تھی۔

وہ کانپ اٹھی۔

''ایسا مت کہو سعید، مجھے بددعا مت دو پلیز...... میں مانتی ہوں میں نے گھر چھوڑا صرف تمہارے لیے۔'' اس کے پیچھے وہ کسی بت کی طرح سانس روکے کھڑا ہوا تھا۔ ''میں نے تمہارے لیے ایک دنیا چھوڑی، میں یہ شادی بھی نہیں کرتی اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ تم بچ گئے...... تم کہاں تھے سعید...... میں بھی تو مشکل میں تھی...... کوئی رستہ نہ تھا میرے پاس...... اور اب تم کہتے ہو میں اس سے طلاق لوں، تم یقین کرو میں نے بہت کوشش کی ہے ہر طرح سے مگر وہ نہیں مانتا اور سعید...... پلیز میری بات سنو...... ہیلو...... ہیلو سعید......'' لائن ساکت ہو گئی تھی، اس کے ہاتھ سے ریسور گر گیا پیچھے سے اسے جاتا دیکھ کر وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتا کمرے کی طرف گیا تھا۔ اس کا دل جیسے بند ہو گیا۔ ''تو وہ سب کچھ سن چکا ہے مگر شاید ادھوری

بات پر اس نے کچھ کہا نہیں ......" وہ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ کمرے میں اس کے پیچھے چلی گئی۔

"یہ...... سب...... نکالو یہاں سے آج کے بعد تمہارا اس گھر سے مجھ سے، کوئی تعلق نہیں۔" وہ ایک ایک کر کے وارڈ روب سے اس کی چیزیں نکال رہا تھا۔ پہلے کپڑے پھر سیف سے جیولری اور دیگر تمام چیزیں فرش پر ایک ڈھیر لگ گیا۔

"یہ نکالو یہاں سے اور چلی جاؤ ابھی کہ ابھی اسی وقت...... میں نے تمہیں غلط سمجھا، پہچاننے میں غلطی کی، میں غلط تھا میں خوش فہم سا ہو گیا تھا۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا۔ تمام خوش فہمیاں بھی...... غلط فہمیاں بھی......"

"مگر میں کہاں جاؤں گی؟" وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

"اسی کے پاس جس کے لیے ایک دنیا چھوڑی، اپنا گھر چھوڑا اور اب مجھے اور اس بچے کو چھوڑنا تھا مگر تم اور تمہارا مفاد، تمہاری سازشیں...... پہلے مجھ سے میری ساحرہ چھینی پھر مجھ سے میرا اپنا آپ چھینا، گھر چھینا...... مگر آج میں تم سے واپس لیتا ہوں سب کچھ اپنا آپ بھی، یہ گھر بھی، یہ بچہ بھی...... نکل جاؤ اپنی تمام ناپاک چیزیں لے کر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ۔"

"نہیں...... میں نہیں جا سکتی...... ہر گز نہیں......" وہ ایک دم سے آگے بڑھی تا کہ اسے روک لے، اس کے پاؤں پکڑ لے معافی مانگ لے۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں......طلاق دیتا ہوں...... طلاق دیتا ہوں......" فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے آگے بڑھتے قدم رک گئے وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ سعید کی بد دعا اس کو لگ چکی تھی۔

"جاؤ، جاؤ اب یہاں سے۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے کمرے سے باہر نکالا، وہ روتے ہوئے خاموشی سے اس گھر سے نکل گئی بغیر کچھ لیے...... وہ سب حسن احمد کا تھا، وہ ساری چیزیں اور وہ بچہ بھی وہ سب کچھ ٹھکرا چکی تھی اپنا اچھا نصیب...... سب کیا دھرا اس کا اپنا تھا...... اور اب اسے ہی بھگتنا تھا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد جیسے زندگی ٹھہر سی گئی، آہستگی سے اوقات چلنے لگے یا پھر اس کا وقت ہی مشکل سے کٹتا تھا۔ اس کی زندگی کی ایک ہی متاع تھی، ایک ہی سہارا اور وہ تھی ایک ننھی کلقاری، اس کی زندگی اس تک محدود تھی، گو کہ اسے سنبھالنا اس کے لیے بے حد مشکل کام بن رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ماں کے رتبے پر رشک آیا تھا۔ ماں کی عظمت کا احساس ہوا تھا۔ اسے پتا چلا کہ عورت کن مرحلوں سے گزر کر ماں بنتی ہے اور کس حیثیت سے ماں کہلاتی ہے۔ لفظ ماں کے پیچھے کیا تعلق ہے، کون سا احساس ہے۔ اس نے علی کو ماں بن کر پالنا چاہا تھا۔ اس کے احساسات ماؤں جیسے ہو گئے تھے، دنیا بھر کی مصروفیات کو آگ لگا کر وہ گھر تک محدود ہو گیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی علی کے لیے فیڈر تیار کرنا پھر اس کے کپڑے چینج کرنا اس کے لیے سیریلیک بنا کر کھلانا، بار بار اس کی فیڈر دھونا اور بہت سے چھوٹے موٹے دن بھر تھکا دینے والے کام...... اتنا تو وہ باہر کی مصروفیت سے بھی نہیں تھکتا تھا۔ اس کے دھیان میں آیا کسی ماں کو پکڑ کر سوال کرے کہ وہ دن میں کتنی مرتبہ تھکتی ہے۔

وہ علی کو تنہا چھوڑ نہیں سکتا تھا مگر وہ گھر تک محدود ہو کر بیزار ہونے لگا۔ اتنے دنوں میں صرف ایک مرتبہ وہ کلینک گیا۔ علی کو مجید کے حوالے کر کے اور جب شام کو لوٹا تو اسے بخار تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ زور زور سے رونے لگا۔ چند دنوں میں وہ کتنا کمزور ہو گیا تھا، اس کے بے حد خیال رکھنے کے باوجود بھی...... وہ بیمار ہو گیا پھر وہ کئی دن تک کہیں نہیں گیا، نہ کلینک نہ اسپتال، علی کی ٹریٹ منٹ کرتا رہا گھر پر مگر وہ روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی دو ماہ پہلے کی تصویر دیکھتا اور اسے تو دل کٹ کر رہ جاتا۔ وہ سال بھر کا ہونے کو آیا تھا مگر اس حساب سے اس نے بڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس کے بھرپور خیال رکھنے کے باوجود بھی وہ اپنے ارد گرد کسی اور کو ڈھونڈتا، تلاش کرتا، ابھی بہت کمی تھی اور اسے اتنے دنوں بعد احساس ہوا کہ اسے ماں کی شدت کے ساتھ ضرورت ہے۔ وہ کس طرح اس کی یہ کمی پوری کرتا جبکہ وہ اس کی زندگی میں کوئی کمی رہنے دینا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

"پیاری ساحرہ، تم سے معافی طلب کر کے یا کسی قسم کی وضاحت کر کے میں تمہارے دل سے اپنے لیے میل نہیں دھو سکتا، نہ ہی تمہارے دل میں اپنا مقام بنا سکتا ہوں، اعتبار بحال کرنا میرے بس کی بات نہیں، تمہیں مجھ سے جتنے گلے، جتنی شکایتیں ہیں سب جائز ہیں۔ میں تمہیں کبھی اپنے ساتھ رہنے پر اب تیار نہیں کر سکتا، یہ حق میں خود کھو چکا ہوں اور نہ ہی تمہارے پاس اب اس کھوکھلی محبت کی گنجائش ہے۔ جانتا ہوں تمہاری زندگی مصروف ہو گئی ہے، تم نے خود کو الجھا کر رکھا ہے اور تمہارے پاس اب پرانی باتوں یا یادوں کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ یہ سب دُہرانا بھی وقت کا زیاں ہی ہوگا۔ میں تمہارے اس بے حد قیمتی وقت میں سے تم سے تمہارے اہم پل مانگ رہا ہوں، اپنے لیے نہیں اپنے بچے کے لیے...... یہ بچہ جسے سگی ماں کی محبت اور ساتھ نصیب نہ ہوا۔ اب مجھے دنیا کے کسی کونے میں اس کے لیے ایسی ماں میسر نہیں جو اسے ماں بن کر پالے اور اس کی کمی پوری ہو...... ہو سکتا ہے تم سے اسے وہ محبت مل سکے، میں اپنی سب سے بڑی ذمّے داری تمہارے کندھوں پر ڈال کر پُرسکون ہونا چاہتا ہوں، اس کے بعد میرا اس بچے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یہ بچہ تمہارا ہوگا، صرف تمہارا اگر تم دل سے قبول کرو اور سمجھو تو خدا نے تمہیں نوازا ہے، تم نے اسے پیدا نہیں کیا مگر تم اس کی ماں کا رتبہ حاصل کر سکتی ہو اگر تمہارے دل میں اس بچے کے لیے گنجائش ہو اگر یہ ذمّے داری تم احسن طریقے سے نبھا سکو...... اگر تم ایک بن ماں کے بچے کو اپنی گود میں پناہ دے سکو تو...... کل اسے مجید تمہارے فلیٹ پر لے کر آئے گا اگر چاہو تو اسے اپنے سینے سے لگا لینا اگر تمہارے پاس وقت، گنجائش اور خواہش نہیں تو اسے واپس لوٹا دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ دونوں صورتوں کے بعد کبھی بھی کسی بہانے سے تمہارا ماضی بن کر تمہارے سامنے نہ آؤں۔ کہیں دور، بہت دور چلا جاؤں۔

صرف تمہارا جو کبھی مکمل تمہارا ہی تھا مگر جواب تک تمہارا ہے۔ حسن احمد۔"

☆☆☆

یہ چھوٹا سا گھر تھا، بہت پرانا اور جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا پلستر، بے رنگ چونا اس نے چھوٹے سے برآمدے کو غور سے دیکھا اور پھر اس کمرے کو جو سائز میں کچھ کشادہ مگر خستہ حال تھا، دو چارپائیاں ایک الماری اور ایک پرانی صندوق اس کمرے کی زینت

تھے۔ وہ سب چیزوں کا جائزہ لیتی اندر آئی۔ وہ بلاشبہ ایک محل سے نکل کر جھونپڑے میں آئی تھی۔ محل سے دارلامان تک کا سفر اور پھر پانچ ماہ بعد اس کے ساتھ ایک نئے رشتے میں جڑ کر اس گھر میں آئی تھی۔ اس کا صدمے سے برا حال تھا۔

''میں کوشش کروں گا اس سے بہتر مکان ڈھونڈ لوں جلد ہی...... مگر تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا، میں نے تھوڑی سی زمین دوست سے قرض لے کر خریدی ہے اسے آباد کرنے اور پھر قرض اتارنے میں وقت لگے گا۔'' وہ اس کی بے چینی سمجھ رہا تھا۔ درحقیقت اسے اب مومنہ پر رحم بھی آ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ اس کے لیے سب چھوڑ چھاڑ کر آ گئی ہے اور مومنہ نے اس کی یہ خوش فہمی دور بھی نہیں کی تھی۔

وہ بہر حال اس کے لیے کوئی بڑے دعوے نہیں کر سکتا تھا مگر اس کے ناز اٹھا رہا تھا اس کا کہا مانتا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔

اب بہر حال اسے یہیں زندگی گزارنی تھی...... سو خاموشی بہتر تھی...... گزرے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں صبر و تحمل کا اضافہ بھی ہوا تھا۔ وہ پوری طرح سے سمجھوتے کے لیے تیار تھی۔ اس کے پاس کوئی اور حل بھی نہیں تھا، نہ چارا...... وہ ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کمرا قدرے ٹھنڈا تھا اسے جیسے سکون سا آنے لگا۔ وہ اس کے لیے کھانا لینے باہر چلا گیا اور وہ جیسے ہی لیٹی نیند آ گئی یہ نیند کم از کم اتنی پُرسکون تھی جتنے سکون کی اس کو ضرورت تھی۔

☆☆☆

انسان نہیں بدلتا نہ اس کی عادتیں، وہ بھی نہیں بدلا تھا نہ اس کی عادتیں...... مگر اس نے خود کو کچھ بدلنے کی کوشش کی تھی۔ اتنی کہ وہ خاموشی سے اسے برداشت کر سکے۔ برداشت جو مشکل تھی مگر وہ کچھ حد تک عادی ہو چکی تھی۔

''کبھی مجھے لگتا ہے تم مجھ سے بیزار ہو کر مجھے چھوڑ دو گی۔'' وہ کام کر رہی تھی، وہ آہستہ سے آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے اور کبھی دل چاہتا ہے ایسا کر کے بھی دکھاؤں۔''

''مگر مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' اس کے انداز میں یقین تھا۔

''تم جو چاہے وہ کرو اور میں اتنا بھی نہیں کر سکتی؟'' وہ شکایتی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم مجھ سے لڑو...... جھگڑو...... مگر ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔''

''اور تمہیں صرف اپنی پروا ہے؟''

''تمہیں تو پتا ہے میں خود غرض ہوں، خود پسند، خود پرست بقول تمہارے اور بہت......''

''اور میں بد تمیز، بد لحاظ، بے صبری ہوں بقول تمہارے اور بہت۔''

''میں جیسا بھی ہوں تم سے محبت کرتا ہوں بقول میرے، بہت، بہت......''

''اسی بہانے تو تمہیں جھیل رہی ہوں بہت، بہت، بہت......'' وہ ریک میں برتن سیٹ کرتے ہوئے اس کی طرف پشت کر کے بولی۔

''اب کچھ کھانے کے لیے دے دو صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔'' وہ محبت سے واپس... بھوک کی طرف آیا۔

''تمہاری بے صبری کی بھی انتہا ہے بہت۔'' وہ جھنجلا کر اس کے لیے کھانا نکالنے لگی۔

''اور تمہارے صبر کی چلو ماننا پڑا، اب آجاؤ کھانا کھا لیں۔''

''ہاں مگر ابھی میری بھی نہیں...... سخت بھوک لگی ہے، کیا کروں۔ تمہارے ساتھ رہ کر تم جیسا بننا پڑے گا۔''

''خود پرست اور خود پسند۔'' وہ چھیڑنے لگا۔

''نہیں...... تم پسند...... اور تم پرست بن گئی ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنے لیے پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ یہ مسکراہٹ ہی تھی جو اتنی لڑائیوں اور نوک جھوک کے بعد بھی ساری تلخی دور کر دیتی اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی چہکتی ہوئی تتلی نے ان کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دیے تھے۔

''امبر، مہر رو رہی ہے جاؤ جلدی سے۔'' وہ نوالہ روک کر اس کی آواز پر کہنے لگا۔

''کیوں، تم جاؤ، تم بھی تو اس کے باپ ہو۔'' وہ مزے سے کھا رہی تھی۔

''باپ ہوں، ماں تو نہیں ناں!''

''تم ماں ہو بھی نہیں سکتے۔'' وہ جھنجلاتی کھانا چھوڑ کر اٹھی اور اسے کمرے سے لے آئی۔

''اٹھ گیا میرا بچہ، آجا پاپا کے پاس۔'' اس نے فوراً مہر کو گود میں لیا۔ وہ منہ بسورتے ہوئے رونے لگی۔

دونوں کھانا چھوڑ کر اس میں لگ گئے۔ اسے بہلانا اتنا آسان نہیں تھا۔ بہت مشکل سے وہ بہلی تھی...... وہ دونوں اسے لے کر کمرے میں آ گئے اس کے سارے کھلونے ڈھیر کر دیے اس کے سامنے بہت دیر بعد وہ کھلونے ہاتھ میں لے لے کر پھینکتے ہوئے ہنسی تھی اور وہ دونوں جی اٹھے۔ اس کی ہنسی میں زندگی تھی۔

☆☆☆

''شاید جتنی بھی تبدیلیاں ہماری زندگی میں آتی ہیں، جن کے ذریعے تقدیر ہمارے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کرتی ہے، ہم جسے قبول نہیں کر پاتے اور جھٹلاتے ہیں، بہت آگے چل کر ہم پر ان واقعات کی افادیت کھلتی ہے۔ حقیقت شاید اتنی تلخ نہیں ہوتی جتنے کہ ہم ہیں۔ میں اور تم...... کاش تم واقعات کو پردہ ڈال کر ڈھانپنے کی کوشش نہ کرتے، کاش میں واقعات کی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے صلح اور صبر کا راستہ اختیار کرتی تو ہم میں اتنے فاصلے نہ پیدا ہوتے۔ غلط ہم دونوں تھے اور غلط ہم دونوں نہیں بھی تھے۔ ہمارا ہر عمل فطرت کے مطابق تھا مگر عقل، حوصلہ اور صبر محبت کے آگے سب چیزیں ہار جاتی ہیں، بس ایک رہتی جو ہے سو محبت ہے۔'' اس نے روشن آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے وسیع القلبی سے کہا تھا۔ وہ سب جو اسے بہت پہلے کہنا چاہیے تھا۔ ''محبت ہی

تو صبر، حوصلے اور تحمل کا ضبط دیتی ہے۔ محبت ہی تو انسان کو انسان بناتی ہے۔'' اس نے اس کے پہلو میں کھڑے ہو کر سب سے روشن ستارہ ڈھونڈا یہ ستارہ شاید محبت کا تھا۔ وہ مسکرانے لگا، اس مسکراہٹ میں اس کے مشکل دنوں کی تھکن بھی شامل تھی اور حال کی پُرسکون خوشی بھی، سب سے بڑی بات محبت بھی۔ جو اسے کھینچ کر یہاں تک لے آئی تھی اس تک...... محبت تک۔ زندگی ستاروں کے جھرمٹ میں جگمگانے لگی تھی۔

''مما...... میں نے باؤل پکڑ لیا......'' دو سالہ علی بہ مشکل باؤل سنبھالے بالکونی میں آیا تھا۔ اس نے جھک کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ اس کی بانہوں میں زندگی آ گئی تھی۔

''پاپا...... اب میں گاڑی بھی چلاؤں گا۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر مگر صاف صاف بولتا تھا۔

''ارے، میرا بچہ تو مجھ سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔'' وہ اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے ہنسا۔

''ہمیں فوراً سے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈنی چاہیے، ایسا نہ ہو یہ بگڑ جائے۔'' وہ ہنسی روکتے ہوئے اس کا گال کھینچنے لگی۔

''لڑکی کیا ہوتا ہے مما؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

''لڑکی، لڑکی ہوتی ہے، لڑکا، لڑکا ہوتا ہے، دونوں آپس میں مل کر رہتے ہیں محبت کے ساتھ اس کے لیے نکاح کرنا لازمی ہوتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اسے گود میں لے کر سمجھانے لگا۔ علی ناسمجھی سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

''توبہ ہے حسن، بات کو نکاح تک لے گئے۔ ہمارا بچہ ابھی سیکھنے کے مراحل میں ہے، تم اسے ایسی ہی باتیں سکھایا کرو، ہر کسی کے سامنے بولنے لگتا ہے۔ مجھے دو میرا بچہ تم اسے خراب کر دو گے۔'' اس نے اس سے علی کو لینا چاہا۔

''مما مت کریں گر جاؤں گا۔'' وہ ایک دن پہلے ہی حسن کی گود سے پھسلا تھا اب اسے ڈر لگتا تھا جس وقت وہ اٹھاتا تھا۔ پاپا گراتا نہیں اور وہ اسے جان بوجھ کر ڈراتا اور تنگ کرتا۔

''گرنے سے بندہ سنبھلتا ہے میری جان!'' وہ ہمیشہ سے ایسی ہی مثالیں پیش کرتا تھا۔

''تم بتاؤ کتنی دفعہ گرے ہو...... دو مجھے میرا بچہ......'' وہ اسے احتیاط سے تھام کر لیتی۔

''وہ دیکھو علی سب سے خوب صورت تارہ دکھاؤں۔'' اس نے اس کی گردن اونچی کرتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''مما وہ کون ہے؟'' وہ حیرانی سے چمکتے ہوئے تارے دیکھنے لگا۔

''وہ میرا علی ہے...... وہی جو سب سے زیادہ چمک رہا ہے۔'' وہ مسکرا کر بتانے لگی۔

''مگر میں تو یہاں ہوں......'' اس کے ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ تھی۔

''ہمارا تارہ ہمارے پاس ہے۔'' حسن اس کے قریب آ کر کہنے لگا۔ وہ تینوں ستاروں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ وہ ان دونوں سے عجیب عجیب سوال کرنے لگا۔

ستارے جو روشنی تھے۔

روشنی، جو زندگی تھی۔

محبت، جو اُن کے درمیان بستی تھی۔

زندگی، جو اُن کے ساتھ تھی اور زندگی گزارنے کے لیے محبت بہت تھی، محبت صبح تھی، رات تھی اور شام تھی۔ اس گھر میں زندگی محبت بن کر چمکنے لگی۔ وہ محبت کے ساتھ تھے۔ زندگی اُن کے ساتھ تھی۔



گھونسلہ

عذرا آفتاب

''برات آ گئی، برات آ گئی۔'' گلی کے نکڑ سے باجے کے شور کے ساتھ آواز آئی۔ سب سہیلیاں دلہن کو چھوڑ کر کمرے سے باہر کی طرف بھاگ گئیں۔ دلہن بنی گٹھری کے دل میں بھی شوق جاگا۔ وہ بھی کمرے سے نکل کر برآمدے کے ایک کونے میں جا کر جھروکے سے دیکھنے لگی۔ سفید پھولوں کے سہرے میں چھپا گھوڑے پر سوار، ناچتے گاتے دوستوں کے ہمراہ آہستہ آہستہ ڈیوڑھی میں

کوئی داخل ہو رہا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ گھوڑا آ کر رک گیا۔ گھوڑے کے آگے ناچنے والے دوست احباب بھی اِدھر اُدھر ہو گئے کچھ وقت کے لیے ڈھول اور باجے والوں نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے۔

بڑے بھیا نے آگے بڑھ کر دولھا کو سہارا دے کر گھوڑے سے نیچے اتارا۔ چھوٹے بھیا نے گلے میں بڑا سا ہار پہنایا۔ ابا نے گلے سے لگایا۔ کچھ خواتین آگے بڑھیں اور دولھا کو کام دار دوپٹے کے سائے میں لے لیا۔ دولھا بہت سارے لوگوں کی سنگت میں اور آگے بڑھا۔ اماں نے پیار سے بلائیں لیں۔ راستے میں کھڑے لڑکے اور لڑکیوں نے دولھا اور براتیوں کے اوپر پھولوں کی پتیاں برسائیں اور گلے میں ہار پہنائے۔ سجے سجائے راستے سے ہوتا ہوا دولھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بڑے چبوترے پر سجی ہوئی مسند پر بیٹھ گیا۔

اس نے دیکھا براتیوں کے پیچھے سجی سجائی ایک سرخ رنگ کی ڈولی بھی آ رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ ”یہ کیا......؟ کیا میں اس ڈولی میں بیٹھوں گی؟ سب کچھ ایسا ہی جیسے میں کبھی خوابوں میں سوچا کرتی تھی۔ گھوڑے پر سوار سفید پھولوں کے سہرے میں ڈھکا ہوا دولھا۔ پیچھے سرخ ڈولی میں سوار دلہن۔ ڈھول اور باجوں کی گونج میں بے شمار چلتے ہوئے براتی۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ...... رہی ؟“ سیڑھیوں پر چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ جھروکے سے ہٹ کر پھر کمرے میں اپنی مسہری پر جا بیٹھی۔

”شاید میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اس زمانے میں کون گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے۔ کہیں مجھے اپنے بچپن میں دیکھی ہوئی کسی شادی کا تو خیال نہیں آ رہا۔ اب تو دولھا کار میں بیٹھ کر آتا ہے اور دلہن بھی کار میں جاتی ہے پر میرا تو ایسی ہی شادی کا ارمان تھا۔ اپنے بچپن میں عشرت باجی کی شادی بھی تو اسی طرح ہوتی دیکھی تھی۔ اس وقت میں چھ سات سال کی ہوں گی۔ اس وقت مجھے سفید پھولوں کا سہرا بہت اچھا لگا تھا اور عشرت آپا بھی پھولوں سے سجی ڈولی میں بیٹھ کر روتے ہوئے رخصت ہوئی تھیں...... تو کیا رسم کے مطابق مجھے بھی اب رونا ہوگا......“ وہ ہنس دی اور پھر ہنستے ہنستے رونے لگی۔

”کیا رونا خود سے آتا ہے......؟ کسی نے ڈانٹا بھی نہیں، اتنے اچھے کپڑے اور قیمتی زیور بھی پہنے ہیں پھر آنسو ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔“ وہ چپکے چپکے گھونگٹ میں روتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں طاہر چچا رجسٹر لیے آ گئے۔ پاس بیٹھی ہوئی لڑکیاں اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ اماں دروازے کے پاس کھڑی تھیں دوپٹے کے پلو سے آنسو چھپا رہی تھیں۔ دادی نے بڑھ کر سر پر ہاتھ رکھا۔ چچی نے چچا کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر اس کی گود میں رکھ دیا۔ چچا کی ہلکی سی لرزتی ہوئی آواز تھی۔

”بیٹا، میں تمہارا وکیل ہوں اور نکاح کی رسم ادا کر رہا ہوں۔ یہ نکاح نامے کے پیپرز ہیں۔ انہیں تم پڑھ لو۔ بہ رضا اور بہ خوشی دستخط کر دو۔ یہ زمانے کا دستور ہے بڑے بڑے بادشاہ اور راجا بھی اس کو نہیں توڑ سکے۔ ہر لڑکی باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر جاتی ہے۔ اس لیے اپنے دل پر کوئی بوجھ مت لو اور خوشی سے سائن کر دو۔“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”جس شخص کو میں نے دیکھا نہیں، جانا نہیں، سمجھا نہیں وہ تین دستخط سے میرے وجود کی خوشی اور ناخوشی کا مالک بن جائے گا۔ میری زندگی کی ڈور اب اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس کی ہر خوشی کو پورا کرنا میرا...... اولین فرض ہوگا۔ چاہے اس میں میری مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ طاہر چچا کی مشفق آواز پھر ہوا میں ابھری۔

”بیٹا کیا سوچ رہی ہو۔ اپنی رضا اور خوشی سے کر دو یہ دستخط، یہ تمہارا حق ہے، یہ دستور ہے زمانے کا۔“ اس وقت اس کے اندر سے خوشی کچھ دیر کے لیے دھوئیں کی طرح اڑ گئی۔ اس نے بے بسی سے اپنے اردگرد دیکھا۔ اماں سر جھکائے نہ جانے کس سوچ میں تھیں۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔

”اس وقت اندر اور باہر معزز لوگوں کو جمع کر کے ایک کونے میں بٹھا کر کہا جا رہا ہے۔ تمہاری رضا، تمہارا حق۔ اس وقت کیا حق کا استعمال کروں۔ چچا کیا یہ رسمی جملہ کہنا ضروری تھا...... ایسے ہی دستخط کرنے کے لیے حکم دے دیا ہوتا۔ میرے جیسی لڑکیوں کی تو پنجرے میں بند چڑیوں سے بھی کم حیثیت ہوتی ہے۔ کم از کم انہیں موقع ملتے ہی اڑ جانے کا حق تو ہوتا ہے اور میرے جیسی لڑکیوں کو زبان پر تالا لگا کر سرخ جوڑے میں، ڈولی میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہر عزیز کان میں آ کر ایک ہی بات مختلف انداز میں کہتا ہے۔ لوگ اتنا زیادہ گھیراؤ کرتے ہیں کہ کب ایک گھر کی مکین کی نظروں سے اس کے در و دیوار جدا ہوئے پتا ہی نہیں چلتا۔ سر اٹھا کر دیکھتی ہے تو اجنبی چہرے اور وہ اکیلی سہمی ہوئی اس چڑیا کی طرح جس کے پر کاٹ دیے ہوں۔ پنجرے کا دروازہ بند...... تنہائی ہی تنہائی...... دل فریاد بھی کرے تو مٹھاس سے، روئے بھی تو ایسے کے آنکھوں سے آنسو نہ بہیں۔“ وہ دکھ سے پہلو بدل کر بیٹھی اور پھر سوچنے لگی۔ ”کیا میں ایک بے جان مورتی ہوں، میرے سینے میں دل نہیں دھڑکتا، میری پسند ناپسند کچھ نہیں۔ اماں چوڑیاں بھی پہناتی تھیں تو رنگ پسند کراتی تھیں اور جب میری زندگی کا فیصلہ کیا تو یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ شخص جس کے ساتھ مجھے پوری زندگی گزارنی ہے وہ کیسا ہے۔ گورا ہے کالا ہے......؟ نرم دل ہے یا پتھر ہے؟ میں اس کے ساتھ جی بھی سکوں گی یا نہیں......؟ چھ مہینے سے گھر میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں لیکن مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا۔ دادی کو ایک دن کہتے سنا۔ لڑکے کا رنگ روپ نہیں دیکھا جاتا، کمائی دیکھی جاتی ہے۔ بیوی اور بچوں کی ذمے داری اٹھا بھی سکتا ہے یا نہیں...... اور بس۔“

”بیٹا کیا سوچ رہی ہو......؟ چچا کب سے کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔“ یہ اماں کی ہلکی سی تنبیہ اور بے چارگی کی آواز تھی اور پھر اس نے بہت بے بسی کے عالم میں قلم لے کر اپنے قسمت نامے پر تین جگہ سائن کر دیے۔ چچا اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے رجسٹر لے کر باہر چلے گئے۔ گھر کی سب خواتین نے گھیراؤ کر کے بہت ساری دعائیں دیں۔ دلی طور پر جہاں خوشی اور اطمینان تھا۔ وہاں دل دکھ سے بھی لبریز تھے۔ آنکھیں نم تھیں، اس کی عزیز ترین دوست اس کے نزدیک ہوئی۔ اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر کیا اور ماتھے پر پیار کرتے ہوئے شرارت سے بولی۔

”اجازت ہے پیار کرنے کی...... یا پھر جملہ حقوق محفوظ۔“ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ نہ جانے جواب میں کیا کہتی...... زخمی ہرنی کی طرح آنکھیں اوپر کر کے بولی۔

”بکی نہیں ہے تمہاری دوست، نئے رشتے کے معاہدے پر صرف سائن کیے ہیں اگر پسند نہیں آیا تو توڑ دوں گی یہ معاہدہ۔“ اس کی دوست نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا پھر وہ غصے سے بولی۔

”دیکھا تم نے، میرے اپنوں نے مجھے کس

طرح بہلا پھسلا کر سائن اس طرح کرا لیے جیسے میرا سودا کیا جا رہا ہو۔ جسے میں نے دیکھا تک نہیں اور میں پاگل پچھلے چھ ماہ سے خاموش تھی لعنت ہو ایسی فرمانبرداری پر، ایک بار بھی نہیں بول سکی کہ میں شادی سے پہلے اس شخص سے ملنا چاہوں گی۔ صدیاں گزر گئیں، مشرقی عورت کی اسیری نہیں ختم ہوئی ایک قید کے بعد دوسری قید۔'' وہ نہ جانے کیا کیا غبار نکالتی کہ پھپو نے آ کر کہا۔

''صائمہ اپنی دوست کو جلدی سے تیار کردو۔ باہر نکاح کی رسم ختم ہوگئی ہے اور کھانا کھاتے ہی روانہ ہونا ہے۔'' صائمہ نے بڑھ کر پھر پیار کیا اور دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی۔

''پیاری دوست غصہ تھوک دو، دلہن پر یہ نہیں سجتا۔ ہلکی سی مسکراہٹ لاؤ چہرے پر اور اب نئے سفر کی تیاری کرو۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، خدا پر یقین رکھو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا برا نہیں ہوگا کیونکہ تم بلاشبہ اچھی لڑکی ہو اور دوست سرپرائز میں تو بہت مزہ آتا ہے۔ تم نے ہی نہیں دیکھا ہے سب بڑوں نے تو دیکھا سمجھا اور پرکھا ہے۔ اچھا ہی ہوگا اور تم بھی خواب دیکھا کرتی تھیں۔ گھوڑے پر سوار سفید پھولوں کے سہرے میں دولھا۔ سجی سجائی ڈولی میں بیٹھی دلہن یہ گئے وقتوں کی شادی تھی پھر بھی تمہارا یہ سپنا پورا ہوا۔ اطمینان رکھو، گھوڑے پر آنے والا دولھا بھی تمہارے خوابوں جیسا ہی ہوگا اور اگر کہیں کچھ کمی ہو بھی تو کاٹ چھاٹ کر لینا۔ اس فن میں تم اچھی خاصی ماہر ہو۔'' صائمہ نے ایک بار پھر اسے خوش کرنے کے لیے گدگدایا۔ دونوں سہیلیاں ہنسنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں رخصتی کا اعلان ہوا اور وہ خریدے ہوئے مال کی طرح ڈولی میں بٹھا دی گئی۔ کہاروں نے ڈولی کاندھے پر اٹھائی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔

''تو یہ تھا میرا خواب جو پورا ہوا۔''

ڈولی اسٹیشن پر ایک ڈبے کے ساتھ جا کر لگی اور کچھ خواتین کے ساتھ وہ ڈبے میں سوار ہوگئی۔ رات کے آخری حصے میں وہ اس گھر کے دروازے پر تھی جس کو کبھی پرایا اور کبھی اپنا گھر بتایا جاتا تھا۔ بچپن سے سنتی آئی تھی۔ پرایا دھن ہے، پرائے گھر جانا ہے، کچھ سلیقہ سیکھو، آج سے پہلے کبھی اس نے پرائے گھر کے لیے سوچا ہی نہیں تھا اور آج وہ پرائے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

''میں پرایا دھن تھی۔ پرائے گھر میں آگئی ہوں، تو میرا اپنا کیا ہے......؟ وہ پرایا کہاں ہے، جس کا میں دھن ہوں......؟ یہ پرایا میرا کب ہوگا۔ کیا میں کوئی خانہ بدوش ہوں......'' نئی دلہن بہت سارے خیالوں میں گھری ستاروں کی چھاؤں میں دو خواتین کے ہمراہ صحن سے گزرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرا پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کسی نے بہت مہارت اور خوب صورتی سے کمرا سجایا تھا ایک لمحے کو وہ حیران رہ گئی۔ اس کی پسند کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا سا کمرا، کریم کلر کی بے داغ دیواریں، درمیان میں بڑا سا ڈبل بیڈ بے داغ سفید بستر موٹے موٹے کشن، پاؤں دھنسنے والا کارپٹ، بیڈ کے ساتھ بھاری بھاری سائڈ ٹیبل، ٹیبل پر بڑے بڑے لیمپ، آمنے سامنے کی دیواروں پر دو خوب صورت پینٹنگز...... کمرے میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک خاتون نے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ کئی گھنٹوں کے ٹرین کے سفر نے اسے کچھ تھکا دیا تھا۔ بال بھی کچھ بے ترتیب ہو رہے تھے۔ دلہن کو پھر نوک پلک سے سجایا گیا اور خاتون اسے آرام دہ بستر پر بٹھا کر چلی گئیں۔ وہ سر جھکائے گھونگٹ میں خود کو چھپائے بیٹھی۔ دل ہی دل میں ہنس بھی رہی تھی۔

''یہ کیا بے وقوفانہ اور بچکانا حرکت ہے؟'' منہ چھپا کر بیٹھنا اسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ''میں صوفے پر تو سلیقے سے بیٹھ سکتی تھی۔ آخر یہ سجا ہوا پلنگ ہی کیوں دلہن کی قسمت میں ہوتا ہے۔ کیا اب مجھے شرما کر آنکھیں بند کرنے کی رسم ادا کرنی ہوگی... جبکہ میری آنکھیں منتظر ہیں اس شخص کو دیکھنے کے لیے جو میرا شریکِ زندگی منتخب ہوا ہے پھر میں سر نیچا کر کے آنکھیں کیوں بند کروں۔'' ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھلا اور بھاری قدموں کی آواز قریب آگئی۔ وہ رسم کے لیے نہیں غیر ارادی طور پر قدرے جھک بھی گئی اور آنکھیں بھی نیچی ہوگئیں۔ دل زور سے دھڑکا جو شخص کل تک اس کے لیے غیر تھا، وہ رات کے اس آخری پہر میں اسی کے کمرے میں تنہا بیٹھی ہے۔ ''یہ اس کا گھر ہے، اس کا کمرا ہے، وہ کسی بھی وقت اپنے کمرے میں آسکتا ہے لیکن یہ کمرا اب میرا بھی تو ہے...... مطلب یہ کہ اب ہم دونوں کا ہے۔ وہ جسے میں نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں۔'' اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ آنے والے کا خیر مقدم کرتی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پشت سے آواز آئی۔

''شریکِ زندگی، آداب۔'' یہ گمبھیر اور پُرکشش آواز تھی۔

''اجازت ہو تو پاس بیٹھ جاؤں؟'' یہ دوسرا جملہ تھا، وہ اجازت کے جواب میں تھوڑا سا آگے کو سرکی۔ کندھے پر ہلکی سی گرفت۔

''جانِ من اگر اجازت ہو تو تمہیں چھولوں۔ اچھا چلیں ہاتھ تو بڑھائیں، دوستی کا ہاتھ، رفاقت کا ہاتھ، ساتھ نبھانے کا ہاتھ۔'' لفظوں میں مٹھاس تھی جادوئی قدرت تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دودھ اور میدے سے گوندھے آٹے سے بنے ملائم ہاتھ دو وزنی اور کالے ہاتھوں کے درمیان بے بسی سے دبے ہوئے تھے۔ چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کسمسا کر پیچھے ہٹی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی خوفناک خواب دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں تھے۔

ہاتھوں کی گرم جوش گرفت اس طرح ڈھیلی ہوئی جیسے کسی پھول کی نازک پتیاں توڑتے ہوئے بکھر جاتی ہیں۔ وہ کچھ قدم پیچھے ہٹا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس نے جگ سے گلاس بھر کر پانی پیا۔ کچھ دیر اور خاموشی رہی۔ وہ بھی بے حس و حرکت بے جان مورتی کی طرح بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد پھر وہی نرم اور میٹھی آواز۔

''ندرت شاید آپ سفر سے تھک گئی ہیں، آرام کیجیے، کل صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔'' اور وہ بھاری قدموں سے باہر نکل گیا۔

ندرت کی زندگی میں تو جیسے بھونچال آگیا تھا۔ وہ بچپن سے کسی خوب صورت شہزادے کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ دادی اسے ہر بار کہانی سنا کر پیار سے یہ کہہ کر سلاتی تھیں۔ ''میری تو شہزادی ہے شہزادی۔ دور دیس سے گھوڑے پر سوار کوئی شہزادہ ہی آئے گا بیاہنے کے لیے۔'' اور وہ تھی بھی تو ایک شہزادی جیسی۔ خاندان کی سب سے خوب صورت اور نازک ترین لڑکی...... اس کے ایک چچا نے اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر پریوں کی بچوں کے لیے کہانیاں لکھی تھیں۔ اکثر اس کی سہیلیاں کہتیں۔

''بھئی ندرت، سارے رنگ تو تمہارے لیے ہی بنے ہیں۔ جو رنگ بھی پہنتی ہو وہ تمہارے رنگ

میں ایسا رچ بس جاتا ہے جیسے خدا نے صرف تمہارے لیے ہی بنایا ہو۔'' وہ تھی بھی بہت سلیقہ شعار بہت سلیقے سے ہر چیز کو میچ کر کے پہنتی تھی۔ مس میچنگ کا تو تصور ہی نہیں تھا۔

''یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ......؟'' وہ قسمت کے اس کھیل پر حیران تھی۔ ''کہاں گیا وہ شہزادہ جو بچپن سے دادی نے میرے لیے منتخب کیا تھا جو میرے خوابوں میں بچپن سے سجا تھا۔'' اتنا زیادہ کالا رنگ تو اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بارہا خود سے ایک ہی سوال کر رہی تھی۔ ''کیا کوئی اتنا کالا ہوسکتا ہے......؟ میرے گھر والوں نے کچھ نہیں سوچا، کچھ نہیں دیکھا۔'' پھر اسے یاد آیا، دادی نے ایک بار کہا تھا۔

''مرد کے رنگ روپ سے زیادہ اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔ نکھٹو تو شہزادہ بھی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔''

''تو کیا دادی مجھے اس طرح سمجھوتا کرنا سکھا رہی تھیں اور اب مجھے سمجھوتا ہی کرنا ہوگا۔ پر کیسے؟'' باغی دل نے کہا۔ ''نہیں ہرگز نہیں۔ آج تک میں نے مس میچنگ کے کپڑے تک نہیں پہنے تو پھر زندگی بھر کا ساتھ کیسے رہ سکتا ہے۔'' باغی ندرت، رنج اور غصے سے اندر ہی اندر چیخ پڑی۔ ''یہ میری زندگی ہے، اس پر میرا حق ہے اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا، پر کیا......؟'' یہ سوال ایک ہتھوڑے کی طرح اس کے اعصاب پر گرا۔ وہ بستر سے اٹھی، باتھ روم میں جا کر پانی آنکھوں پر بہت دیر تک ڈالتی رہی۔ آنکھوں کی جلن کچھ ختم ہوئی۔ منہ اوپر کر کے دیکھا تو شیشہ بھی اداس نظر آرہا تھا۔ اس نے بہت دکھ سے سوچا۔

''تو ندرت بی بی، یہ ہے تمہاری قسمت اور یہ تھا تمہارے گھر والوں کا پیار انہوں نے صرف اپنا فرض پورا کیا اور کوئی حق کوئی اختیار دینا بھی تمہیں مناسب نہیں سمجھا۔ سو لوگوں کو جمع کر کے تین دستخط کروائے اور بٹھا دیا ڈولی میں۔'' وہ کھڑے کھڑے تھک رہی تھی۔ کمرے میں واپس آئی سب کچھ بھول کر کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہتی تھی۔ ایک گھنٹے کی کوشش کے باوجود بھی وہ سو نہیں سکی۔ اٹھ کر پھر بیٹھ گئی، کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ سائڈ ٹیبل پر بڑے سے خوب صورت لیمپ کے پاس سفید پھولوں کا بڑا سا بوکے اور ایک لفافہ نہ جانے کب سے اس کا منتظر تھا۔ وہ بہت دیر تک خلاؤں میں دیکھتی رہی پھر لفافے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لفافہ اٹھایا پھر واپس رکھ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے......؟ اور کس سے کہے؟ قسمت نے کیسی شکست دی ہے۔ چیزوں کو نوک پلک سے میچ کرنے والی لڑکی آج اس طرح پریشان تھی کہ سوائے کالے رنگ کے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کا اجالا پھیلا، وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی، ذہن اس طرح ماؤف تھا جیسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو اور سوچنے سمجھنے کی سدھ بدھ ہی نہ رہے پھر وہ دل بہلانے کے لیے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرے کی سجاوٹ اور اس کے رنگوں کی ترتیب اس طرح سے تھی کہ بے اختیار داد دینے کے لیے الفاظ تڑپ جائیں، وہ ایک ایک چیز کو پسندیدگی سے دیکھنے لگی۔ اب اس کے حواس بیدار ہو رہے تھے ہر چیز اسے اچھی لگ رہی تھی۔ سب کچھ ایسا تھا جیسے اس نے ہی اپنی پسند سے سب کچھ سیٹ کیا ہو۔ سائڈ ٹیبل پر سفید گلابوں کا بڑا سا بوکے اور ایک کارڈ اس کا ابھی تک منتظر تھا۔ اس نے کارڈ اٹھایا لیکن دینے والا سامنے نہیں تھا۔ اس نے بغیر کھولے واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ سید گھرانے کی سات پردوں میں پلنے والی مکمل طور پر مشرقی لڑکی تھی۔ جس کے دوپٹے کا پلو تک کبھی کسی غیر شخص نے نہیں دیکھا۔ تعلیم ہوئی تو گھر پر قابل ترین استادوں سے، کپڑے خریدنے ہوتے تو اچھے سے اچھے کپڑوں کے تھان گھر پر آکر کھل جاتے۔ ضرورت کی ہر چیز ہمیشہ گھر پر ہی میسر آئی۔ جیون ساتھی کا انتخاب بھی گھر والوں نے ہی کیا۔ اس کی اپنی پسند کو کب اور کہاں کسی نے دیکھا۔ بچپن سے وہ پابند تھی، اپنے گھر کے بڑوں کی فرمانبرداری اس گھر کی روایت تھی۔ باپردہ اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والی خواتین، حیا اور شرم اس گھر کا زیور تھا۔

''اب میں کیا کروں اور کیسے کروں...... بغاوت، مذہب اور خاندانی وقار کے مطابق شوہر کی اطاعت جیسے مذہب کی پاک کتابوں میں لکھ دی گئی ہے۔ ایمان لاؤں تو دین اور دنیا روشن، دل کی مانوں تو بے چینی، ضمیر کی مار...... اب میں کروں تو کیا کروں۔ خود کو کیسے بچاؤں، کہیں بھی پناہ نہیں، نہ دین میں اور نہ دنیا میں۔ معاشرے کی الگ مار، خود کو چھپاؤں تو کہاں چھپاؤں۔ اِدھر دل ہے تو وہ مرجھایا جا رہا ہے۔ کہاں گیا وہ شہزادہ جس کے خیال سے ہی میں شرما جایا کرتی تھی۔ رات اس کی خیالی سنگت میں اس طرح گزار لیتی تھی جیسے ٹھنڈے درخت کے سائے میں جھولا جھول رہی ہوں۔ کون سی ہوا اسے پل بھر میں اڑا کر لے گئی۔'' ذہن نے ایک بار پھر خوش فہمی کا دروازہ کھول دیا۔ ''اگر پھر کہیں کوئی بھولا بھٹکا وہ شہزادہ سامنے آگیا تو ندرت بی بی، کیا کرو گی......؟ کیا من کے دروازے کھول دو گی...... پر تمہارے دروازے پر تو اب تاحیات چوکی دار تعینات کر دیا گیا ہے۔ کیا سب کچھ چھوڑ کر نکل سکو گی......؟'' اس نے اس خیال کو گیلے کپڑے کی طرح جھٹک دیا۔ دل گھبرا رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل آئی۔

سامنے ہی ایک اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے پردے ہل ہل کر خوش آمدید کہنے لگے۔ وہ آگے بڑھی، یہ کھانے کا کمرا تھا اس کمرے کی آرائش بھی بہت سلیقے سے کی گئی تھی۔ بڑی بڑی کھڑکیوں پر بانس کی تیلیوں سے بنے پردے لٹک رہے تھے۔ آمنے سامنے کی دیواروں پر بہت ہی انٹلی اکیچویل قسم کی دو بڑی بڑی پینٹنگز۔ ایک پینٹنگ میں دور سے آتا ہوا بہت ہی خوب صورت اور توانا گھوڑا۔ گھوڑے پر ایک سوار اور پشت سے کچھ اڑتے ہوئے پرندے۔ دوسری پینٹنگ میں جھرنوں سے بہتا ہوا پانی اور آسمان پر اڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے...... کچھ عجیب سا سحر تھا ان دونوں پینٹنگز میں۔ وہ دونوں پینٹنگز میں کھو گئی۔ بہت دیر تک دیکھتی رہی پھر اس کی نظر کونے میں چھوٹے سے سائن پر پڑی۔ بہت چھوٹا سا سائن تھا۔ 'وجاہت'۔ ندرت کچھ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھ کر کمرے کی دوسری چیزوں کو دیکھنے لگی۔ کمرے کے درمیان میں ایک درمیانے سائز کی ٹیبل، کھدر کا پیچ کلر کا ٹیبل کلاتھ سینٹر میں تازہ سفید للی کے پھولوں کا گلدستہ، پیچ کلر کی پلیٹیں، بانس کی تیلیوں سے بنے میٹس پر بہت سلیقے سے سجی تھیں۔ ٹیبل بالکل کھڑکی کے سامنے تھی۔ اس کا درمیان کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پوری کھڑکی کو چھوٹے چھوٹے سفید گلاب کی بیل نے ڈھکا ہوا تھا۔ کمرے کی دوسری سائڈ پر ایک درمیانے سائز کا دیوان اس پر بھی پیچ کلر کا صاف ستھرا جھالر والا دیوان پوش بچھا

تھا۔ بڑے بڑے گاؤ تکیے رکھے تھے ایک سائڈ ٹیبل پر چاندی کا چمکتا ہوا خاص دان۔ دیوان کی دوسری طرف ایک بک شیلف جس میں کتابیں اور فوٹو البم خوب صورتی سے سجے تھے۔ فرش پر ایک جوٹ کا قالین بچھا تھا۔ کونوں میں تانبے کے بڑے بڑے پوٹس میں خوب صورت رنگوں کے کروٹن لگے ہوئے تھے۔ سامنے ایک دروازہ تھا اور دروازے میں لٹکی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں۔ گھنٹیاں دیکھ کر اسے لگا جیسے وہ کسی مندر کا دروازہ دیکھ رہی ہو۔ وہ ہاتھ لگائے گی تو گھنٹیاں بول پڑیں گی اور کسی بھی کونے سے نکل کر ایک پجاری آجائے گا۔ وہ خوب صورتی کی عاشق تھی۔ رات کی کوفت بھول گئی۔ باہر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ اس نے بڑھ کر ڈائننگ روم کا باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا۔ اب وہ سرسبز لان میں تھی۔ ابھی تک شبنم کے قطرے گھاس پر چمکے ہوئے تھے۔ وہ جوتے اتار کر بہت دیر تک گھاس پر ٹہلتی رہی۔ سب کچھ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''بیٹا ناشتا تیار ہے میز پر آجاؤ۔'' ایک درمیانی عمر کی خاتون نے آکر بہت پیار سے کہا۔

ندرت آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹیبل پر گرم ناشتا اس کا منتظر تھا۔ آج اس کا اپنے گھر میں پہلی صبح کا پہلا ناشتا تھا، وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے مدِمقابل کی خالی کرسی ٹیبل پر میٹ کے اوپر خالی پلیٹ اور خالی کپ کسی کا منتظر تھا۔

''لیکن وہ کہاں ہے......؟ کیا وہ میرے ساتھ ناشتا نہیں کرے گا......؟'' اسے بہت عجیب لگا۔ دکھ کی ایک لہر اس کے سراپا میں دوڑ گئی۔ پھر کانوں میں میٹھی اور گمبھیر آواز گونجی۔

''ہاتھ بڑھائیں، دوستی کا، رفاقت کا، ساتھ نبھانے کا۔'' ذہن نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑا۔

''ندرت تم نے یہ کیا، کیا......؟ تم تو پھول بھی بہت احتیاط سے سجایا کرتی تھیں اور رات تم نے اس کا دل توڑ دیا۔ یہ گناہ تم سے کیسے سرزد ہوا۔ آج تم اپنے ہی گھر میں اکیلی بیٹھی ہو۔ کوئی بھی ساتھ نہیں۔ اب کیا ہوگا۔'' خالی کرسی کو پھر حسرت سے دیکھا اور کچھ اداس ہوگئی۔

''کہاں ہے وہ......؟ جو اس خوب صورت گھر کا مالک ہے اور تمہارا شریکِ حیات بھی۔ دل نے کہا ندرت کا سر احساسِ ندامت سے قدرے جھک گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''اب کیا کروں اور کس سے کہوں۔'' وہی خاتون پیار بھری مسکراہٹ لیے اندر آگئیں۔

''بیٹا تم نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''جی ابھی کرتی ہوں۔'' وہ قدرے شرمندگی کے انداز میں بولی۔ ''آپ کون ہیں......؟ میرا مطلب ہے کہ میں آپ کو کیا کہوں......؟''

''بیٹا وجاہت مجھے خالہ کا درجہ دیتے ہیں، تم مجھے خالہ ہی کہو۔'' وہ نزدیک آئیں اور سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خدا بخشے تمہاری ساس اور میں بچپن سے بہنوں جیسے ہی رشتے میں بندھے تھے۔ وہ جنت کو سدھاریں...... اور میں ان کا گھر سنبھالے بیٹھی ہوں۔ کل برات میں جتنے لوگ تھے سب ہی وجاہت بیٹے کے احباب تھے۔ اس لیے رات کو ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ گاؤں سے صبح ہی آدمی آگیا۔ کوئی ضروری کام تھا۔ اس لیے وجاہت بیٹا صبح ہی اس کے ساتھ چلے گئے اور وہ جاتے ہوئے یہ لفافہ ٹیبل پر تمہارے لیے رکھ گئے تھے۔'' خالہ نے ٹیبل پر ایک سفید پھول کے ساتھ لفافے پر توجہ دلائی۔ ندرت کا دل کسی خوف سے دھڑکا۔ دل نے سوال کیا۔

''اس میں کیا ہوگا......؟'' شوق جاگا۔ ''محبت نامہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ پڑھو تو۔'' ندرت نے لفافہ اٹھایا۔ ''خالہ میں کمرے میں جا کر ابھی واپس آتی ہوں۔'' دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔

''جانِ من آداب

بغیر بتائے میں جارہا ہوں اس کے لیے معذرت...... گاؤں کی زمینوں پر اچانک کام نکل آیا ہے۔ پریشان مت ہوجائیے گا۔ گھر میں خالہ ہیں، وہ ہر طرح کا خیال رکھیں گی۔ باہر شرافت میاں ہیں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک منگوا لیجیے گا۔ ندرت ہمارا ابھی کوئی تفصیلی تعارف نہیں ہوا...... شاید میں تھوڑا سا مختلف ہوں۔ آپ کو کچھ عجیب لگے گا لیکن انشاء اللہ اپنی ذات سے کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ ضرور یہ سوچیں گی ایک رات کی دلہن کو اکیلا کئی دنوں کے لیے چھوڑ کر جانا عجیب ہی نہیں بد اخلاقی بھی ہے۔ مجبوری ہے ورنہ میں ایسا کبھی نہیں کرتا۔ روایت کے طور پر تو آج ہمارے ولیمے کی دعوت ہونی چاہیے تھی، آپ دوبارہ سے دلہن بنتیں بہت سارے مہمان آتے۔ میں گلے میں ہار پہن کر سب کو خوش آمدید کہتا۔ گہما گہمی ہوتی رات گئے تک شور اور ہنگامہ رہتا۔ میں تھوڑا سا امن پسند واقع ہوا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ مجھے ہنسنا نہیں آتا لیکن جب دل شاد ہو، من میں خوشی ہو، تب کھلکھلا کر ہنسو تو کائنات کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ بناوٹی قہقہے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ویسے بھی ولیمے کی رسم مجھے کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ پہلے دن کی تھکاوٹ ابھی اتری نہیں ہوتی، دولہا دلہن نے ابھی تک ایک دوسرے کو ٹھیک سے دیکھا نہیں ہوتا، سمجھا نہیں ہوتا کہ پھر سے گھر میں ہنگامہ...... جب بھی میں کسی کی دعوت ولیمہ میں گیا یہی سوچا یہ کیا بے جا اسراف ہے۔ اس خرچ میں ایک شادی اور ہوسکتی ہے۔ چونک گئیں......؟ ارے بھئی میری نہیں...... کسی اور منتظر فرد کی۔ خوشیاں تو مل بانٹ کر ہی منائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہوتا ہے تو صرف اس لیے نہیں کہ اپنے اوپر ہی لٹایا جائے بلکہ اس لیے دیا ہوتا ہے کہ کچھ ضرورت مندوں پر بھی خرچ کرو۔ اس لیے میں یہ رقم گاؤں کے کچھ لوگوں کے گھروں کی چھتیں بنوانے میں خرچ کروں گا۔ رہی بات دوسرے دن تمہارے گھر جانے کی تو میں آپ کے بڑے بھیا سے کہہ آیا تھا کہ میں اور ندرت کئی دن کے بعد اکٹھے آئیں گے اور آنے سے پہلے آپ کو اطلاع ضرور دیں گے اور ہم دونوں یعنی میں اور تم سب کو ایک ڈنر اپنی طرف سے کرائیں گے اور آپ کے گھر والوں نے یہ بات خوشی خوشی مان لی تھی۔ اس لیے آپ بالکل برا مت منائیے گا۔ ایک اور اہم بات وہ یہ کہ جس طرح آپ نے مجھے نہیں دیکھا تھا بالکل اسی طرح میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میں خالہ کو اپنی ماں کی جگہ سمجھتا ہوں انہوں نے ہی آپ کو پسند کیا اور میں نے ہاں کی۔ بچپن میں خالہ کہا کرتی تھیں کہ میں اپنے بیٹے کے لیے ایسی دلہن لاؤں گی جو اندھیرے میں اجالا کردے اور میں ہمیشہ کہا کرتا تھا تو خالہ پھر تو اندھیرے میں، میں اسے نظر ہی نہیں آؤں گا۔ یہ تو اور بھی مزے دار بات ہوگی اور یہ بات سچ ہوگئی...... تو ندرت وجاہت علی خان اس طرح سمجھو جیسے تم کھلتا ہوا گلاب کا پھول اور میں بھونرا جو نظر اتارنے کے لیے پھول کھلتے ہی آتا ہے۔ طواف کر کے نظر اتارتا ہے اب میں جیسا بھی ہوں دل سے قبول کرلو تو زندگی خوب صورتی سے گزر جائے گی۔ یقین کیجیے میں من کا ایسا اجلا ہوں کہ آپ کا دل تعریف کرتے نہیں تھکے گا۔ پہلی گفتگو اور اتنی

طویل، یقیناً بور ہوگئی ہوگی۔ دراصل تمہارے پاس سے اٹھا تو نیند نہیں آرہی تھی صبح سفر پر بھی جانا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ قلم اور کاغذ کے سہارے ہی آپ سے کچھ باتیں ہوجائیں تاکہ دل میں کوئی غلط فہمی جنم نہ لے۔ میں کام ختم کرتے ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ تنہائی میں آپ ضرور بور ہوں گی۔ بک شیلف میں کئی اچھی کتابیں اور ڈائری ہے۔ پڑھیے گا۔ البم بھی رکھے ہیں دیکھیے گا۔ میری ڈائری بھی ہے پڑھیں گی تو مجھے جان جائیں گی۔ کافی حد تک تعارف بھی ہوجائے گا۔ ملیں گے تو اجنبیت کم ہوچکی ہوگی...... اور ایک آخری بات چلتے چلتے اور کہہ دوں...... ندرت یہ گھر اب آپ کا ہے۔ اس کی ہر چیز آپ کی ہے اس کے درو دیوار آپ کی آہٹ کے منتظر تھے، میں آپ کا محافظ اور تابعدار...... مشرقی لڑکی کی یہی دو چیزیں میراث سمجھی جاتی ہیں۔ مجھے آپ ہر موڑ پر اپنے ساتھ سائے کی طرح پائیں گی اور ہاں دوسرے کمرے میں میرا واحد شوق ہارمونیم رکھا ہے۔ غزلوں کی ایک ڈائری بھی ہے اگر شوق ہو تو طبع آزمائی کیجیے گا۔ سچ مچ بہت مزہ آتا ہے چاندنی راتوں میں سُر ملا کر گایا کریں گے اور بھی بہت ساری باتیں ہوں گی لیکن ملنے پر۔

وجاہت علی خان، آپ کا۔"

"کیا جادوئی شخصیت پائی ہے حضرت نے۔" ندرت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے سراپا میں ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "رات سے صبح تک کا وقت بہت بے چینی اور کرب میں گزرا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔" اس نے سوچا۔

"تھوڑی ہی دیر میں یہ مجھے کیا ہوا ہے۔ سر ٹکراتی لہروں کو جیسے قرار آگیا ہو۔ ایسا بھی کیا ہوا ہے جو یوں تبدیلی آرہی ہے۔ ایک سلجھے ہوئے انسان کا سمجھداری سے لکھا ہوا خط ہی تو پڑھا ہے۔ پل میں ہی رائے بدل گئی۔ باغی دل بغاوت بھول کر انجانی خوشی سے آشنا ہوا چاہتا ہے۔ یہ سب کیا ہے......؟ یہ کون سا سحر ہے جو مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے......؟" دل نے پھر بہکایا۔

"وہ سامنے جو نہیں اس لیے ایسا ہورہا ہے۔ سامنے جب آئے تو دل پھر بغاوت پر اتر آئے گا۔ شاید ایسا پھر نہ ہو تو پھر کیوں نہ وجاہت صاحب کی کسی تصویر سے مل لیا جائے ابھی تک تو چہرہ نہیں دیکھا۔" ندرت انجانی خوشی اور شرمندگی سے بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ خالہ پھر فروٹ کی پلیٹ لیے کمرے میں آئیں۔

"خالہ آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

"بچوں کے لیے کچھ کرنے میں تکلیف کیسی......؟ آج اس گھر میں تمہارا پہلا دن ہے۔ تم ایک رات کی دلہن ہو، آج تو تمہارے سارے ناز نخرے اٹھانے کا دن تھا لیکن قسمت کا کھیل میرے علاوہ کوئی اور ہے ہی نہیں۔ سارے براتی دوست احباب ہی تھے رات کو ہی اپنے گھر رخصت ہوگئے اور قسمت دیکھو کہ وجاہت بیٹے کو بھی کسی کام سے آج ہی باہر جانا پڑا لیکن تم فکر نہیں کرو، میں جو تمہارے پاس ہوں یوں سمجھو کہ تمہاری ساس کی جگہ ہوں خدا کے پاس جاتے ہوئے وہ جنتی سب کچھ مجھے سونپ کر سکون سے سوئی تھیں۔ آج ہمارے گھر میں تم آئی ہو، خوشی کا پہلا دن ہے کیا سوگوار باتیں کروں پھر کبھی داستان سناؤں گی۔ کیسے ہندوستان سے ہجرت کرتے ہوئے پاکستان پہنچے تھے۔ کیا کیا ہوا...... کتنی مشکلیں اٹھائیں...... میں تمہاری ساس کی سہیلی کیا بہن ہوں ہر لمحے کا ساتھ تھا۔ تمہارے سسر

بھی بیچ میں ہی چھوڑ گئے۔ ہم دونوں نے ہی وجاہت بیٹے کی پرورش کی۔ جب خوشیوں کا وقت آیا...... تو میری دوست نے جنت جانے کا فیصلہ کرلیا۔ شکر ہے خدا کا آج یہ گھر آباد ہوا۔ اب تم آگئی ہو گھر میں خوشی آگئی ہے۔ میرا بیٹا وجاہت ذرا سنجیدہ مزاج ہے، اس کے اپنے ہی شوق اتنے ہیں کہ اپنے میں ہی مگن رہتا ہے۔ جب میں نے تم کو ایک شادی میں دیکھا تھا تو پہلی ہی نظر میں مجھے لگا تھا تم ہی وہ لڑکی ہو جس کا میرے بیٹے کو اور اس گھر کو انتظار تھا۔ تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے کے مزاج کو سمجھ کر اس گھر کا سکون کو گہوارہ بنا دوگی پھر اس گھر میں ہنستے کھیلتے بھاگتے دوڑتے ننھے منے وجود ہوں گے۔ ہر رات شبِ برات اور دن عید کی خوشیاں لے کر آئے گا۔" ندرت، خالہ کی باتیں بھی سن رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی۔ خالہ پھر بولیں۔

"بیٹا! کیا سوچ رہی ہو تم نے تو اچھی طرح سے ناشتا بھی نہیں کیا۔ کیا گھر والے یاد آرہے ہیں؟"

"نہیں خالہ، ایسا نہیں ہے میں نے ناشتا بھی اچھی طرح سے کیا ہے۔" اس نے بہت سمجھداری سے بات کو سنبھالا۔

"تو پھر بور ہورہی ہو......؟ چلو تمہیں میں تصویروں کے ذریعے ہی گھر کے افراد سے ملواؤں۔" خالہ اسے ایک گیلری نما کمرے میں لے گئیں وہ بھی کسی آرٹ گیلری کی طرح ہی سجا تھا۔ دیواروں پر چھوٹی بڑی تصویریں بہت سلیقے سے لگی تھیں۔ خالہ تصویروں سے تعارف کراتی جارہی تھیں، سب سے آخر میں وہ تصویر تھی جسے وہ خاص طور سے دیکھنا چاہتی تھی۔ گھوڑے پر سوار ایک تندرست اور توانا متوالا پوری شان سے آرہا تھا۔ اسے لگا جیسے تصویر بول رہی ہو۔

"کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی تصویر اسے بہت اچھی لگی۔

"خالہ میں کچھ دیر آرام کرلوں کچھ تھکاوٹ ہورہی ہے۔"

"ہاں بیٹا، کیوں نہیں جاؤ آرام کرلو۔" ندرت کمرے میں آئی، کچھ دیر ایسے ہی کروٹیں بدلتی رہی۔ کئی بار خط پڑھا، دل کو جیسے قرار سا آگیا تھا۔ تھوڑی سی شرمندگی ضرور تھی۔

"اب کیا کروں؟" تصویر کے ذریعے ملاقات ہوگئی تھی۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ پھر سامنے آکھڑا ہوا۔

"کوئی بات نہیں دوست، کئی بار ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوں گی۔ درگزر کرنے اور معاف کرنے سے ہی فاصلے کم ہوتے ہیں اور دوستی بڑھتی ہے۔ بہت تھک گئی ہو اب سو جاؤ۔" اسے سچ مچ لگا جیسے اسے کوئی یہ کہہ کر گیا ہے۔ اب وہ سکون سے سو رہی تھی۔

☆☆☆

سو کر اٹھی تو دوپہر گزر چکی تھی۔ نیند پوری ہوئی تو تھکان بھی کافی حد تک کم ہوگئی۔ تازہ دم ہوکر باہر نکلی کچن سے قورمے اور گرم چپاتیوں کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ خوشبو سونگھتی ہوئی کچن میں چلی گئی...... خالہ نفاست سے سلاد بنارہی تھیں۔

"ارے بیٹی، تم پہلے ہی دن کچن میں کیوں آگئیں؟"

"خالہ آپ کے قورمے کی خوشبو ہی ایسی ہے کہ رہا نہیں گیا۔" وہ تھوڑی سی بے تکلف ہوئی۔

"ہاں بیٹے، وجاہت کو بھی قورمہ بہت پسند ہے گھر کے باہر سے ہی اس کو پتا لگ جاتا ہے۔"

"تو یہاں بھی پسند ملتی ہے۔" وہ زیرِ لب گویا

ہوئی۔

''مجھ سے کہا بیٹا......؟''

''ہاں خالہ، میں آپ کا کچن گارڈن دیکھنا چاہ رہی ہوں چلی جاؤں۔''

''ضرور بیٹے لیکن پہلے کھانا کھالو پھر چلی جانا۔''

''بس خالہ میں تھوڑا سا ٹہلوں گی اور آجاؤں گی اور کھانا میں اور آپ ساتھ کھائیں گے۔ صبح بھی آپ نے ناشتا میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔'' یہ کہہ کر ندرت کچن کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

''جگ جگ جیو بچی' کیا اچھی تربیت پائی ہے۔'' ندرت کچن سے نکل کر کچن گارڈن میں آگئی۔ کچن کی کھڑکی کے ساتھ موتیا اور چمبیلی کی بیلیں سجی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر لوکی اور کریلے کی بیلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سلیقے سے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ جس میں ٹماٹر، ہری مرچیں، سلاد اور بینگن کے پودے لگے ہوئے تھے۔ اس میں سفید اور جامنی بینگن بہت خوب صورتی سے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف دو بھٹے کے پودے بھی لگے تھے۔ بھٹے پودوں کے ساتھ اس طرح چپکے ہوئے جیسے بندر کے بچے ماں کی کمر سے چپکے ہوئے دانت دکھا رہے ہوں۔ ندرت کھڑے ہو کر بہت محویت کے ساتھ دیکھتی رہی۔ سارے پودے کس خوبی سے الگ الگ اپنے آپ میں مگن کھڑے تھے۔ بھنڈی کے پودے تھے تو وہ بھی سر جوڑے کھڑے تھے۔ نیبو کے پودے بڑے بڑے گملوں میں کونے میں لگے ہوئے تھے۔ کیاریوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا ہیٹ پہنے بونا جو چڑیوں کو ڈرانے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ کچھ پھولوں کے پودے بھی نظر آرہے تھے۔

ندرت کے پاؤں زمین سے جڑ گئے۔ چھوٹا سا کچن گارڈن کس قدر نفاست اور ترتیب سے سجا تھا۔ کچن کے دروازے کے دوسرے کونے میں کین کا ایک جھکیے والا جھولا لٹکا تھا۔ ندرت تو جیسے دم بخود، کیا دیکھے اور کیا نہ دیکھے اور کتنی تعریف کرے، ان ہاتھوں کی جنھوں نے یہ سب کیا ہے، وہ وہیں جھولے پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ خالہ بہت دیر سے ندرت کا انہماک اور پسندیدگی کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ وہ کب دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں اسے پتا ہی نہیں چلا، وہ تو اس دنیا میں کھوئی ہوئی تھی جو اسے اچانک بغیر خدا سے مانگے مل گئی تھی۔ رات کا اپنا رویہ اسے پھر یاد آیا۔ اس بار شرمندگی سے آنکھیں نم ہوگئیں...... تو خالہ کے پیار بھرے لہجے نے موقع ہی نہیں دیا کہ آنسو نکلیں۔

''بیٹا کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا آؤ دونوں ماں بیٹی اس کچن گارڈن کے چھپر میں کھا لیتے ہیں۔'' وہ چونک کر جھولے سے اتری۔

''کیا خالہ، کیا کہا آپ نے؟''

''ہاں بیٹے یہ دیکھو، شاید تمہاری نظر نہیں پڑی۔'' خالہ نے بڑھ کر ایک بانس سے بنا دروازہ کھولا۔ وہ بہت ہی اشتیاق سے نزدیک گئی تو دیکھا چھوٹا سا ہشت پہلو بانس کی دیواروں سے بنا ایک کمرا۔ چھپر ٹائپ چھت، درمیان میں پتھر سے بنی گول ٹیبل اور اس کے گرد چھوٹے چھوٹے تین اسٹول، وہاں بھی دیوار پر بانس کی تیلیوں سے بنی ڈانس کرتی ہوئی دو گڑیا لٹکی ہوئی تھیں۔ جو کسی...... تجریدی آرٹ کے نمونے سے کم نہیں تھیں۔

''بیٹا تم یہاں بیٹھو، میں اپنا اور تمہارا کھانا یہیں لے کر آتی ہوں۔'' وہ اس جادوئی اثر رکھنے والی دنیا میں پھر کھو گئی۔ خالہ کب گئیں اور کب دو کھانے کی

تھالیاں لا کر ٹیبل پر رکھیں اسے پتا ہی نہیں چلا۔

''بیٹا کھانا شروع کرو۔'' ندرت چونک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ چمکتی ہوئی تھالیاں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں دال، قورمہ، رائتہ۔ سائڈ میں سفید چاول، خوب صورتی سے کٹی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور پودینہ کا کچومر۔ کچھ پتے سلاد کے، سفید دسترخوان میں لپٹی ہوئی چپاتیاں۔ اتنا اچھا سجا ہوا کھانا جو دیکھا تو بھوک اور چمک گئی۔ خالہ نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔

''دلہن کھانا شروع کرو۔ یہ کھانا وجاہت بیٹے اور تمہاری ساس کا مرغوب کھانا ہے۔'' پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ ''چھٹی والے دن دونوں ماں بیٹا صبح کا ناشتا یہاں بیٹھ کر کرتے تھے اور جب موسم ابر آلود ہوتا تھا تو دوپہر کا کھانا بھی ہم یہیں کھاتے تھے اور پھر دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے، ہنستے رہتے لگتا تھا جیسے دنیا یونہی مکمل ہے۔ جب سے وہ گئیں ہیں وجاہت کو تو چپ ہی لگ گئی ہے۔ کبھی کبھار ہنستے ہیں اکثر یہاں آکر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ میں اسی طرح کھانا سجا بنا کر دیتی ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ وہ خوش رہیں لیکن خوشی تو جیسے ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئی ہے۔ وہ اور بھی اداس ہو کر کہتے ہیں۔ ''خالہ اگر آپ نہ ہوتیں تو میں تو پاگل ہو جاتا۔'' ندرت کے دل میں ہمدردی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بے چین ہو کر بولی۔

''کیوں خالہ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں؟''

''بیٹا، وجاہت کی زندگی میں کوئی ہے جو نہیں، نہ بھائی نہ بہن، ابا چھوٹا سا ہی چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ رشتے داروں نے بھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑا۔ ایک ماں ہی تو تھیں۔ اسکول میں جاب کی شام کو گھر میں ٹیوشن سینٹر چلایا۔ انتھک محنت کر کے اپنے بیٹے کی پرورش کی، تعلیم دلائی۔ یہ گھر ہی ایک کل اثاثہ تھا۔ گاؤں میں کچھ زمینیں بھی تھیں لیکن جب سر پر سایہ نہ ہو تو دنیا سے لڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بھولے بھٹکے کوئی مزارع کبھی کوئی اناج اور کبھی کوئی سبزی دے جاتا تھا۔ ساتھ ہی پریشانی کی جھوٹی سچی کہانی سنا کر ہمدردی کی پوٹلی لے کر بہت دنوں کے لیے غائب ہو جاتا۔ ہائے کیا ہمدرد اور پیار کرنے والی ہستی تھیں، یہ گھر کا سلیقہ، یہ رکھ رکھاؤ سب ہی کچھ تو ان کا ہے۔ بیٹے کی نگہداشت انہوں نے ایسے کی جیسے کوئی بیٹیوں کی کرتا ہے۔ ہر وقت گھر میں کوئی نہ کوئی شغل، آج یہ بن رہا ہے تو کل کچھ اور بن رہا ہے۔ دونوں ماں بیٹے ہر وقت نئے نئے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ دو چار بچپن کے دوست جو گھر میں ایسے ہی رہتے تھے جیسے گھر کے بچے ہوں، اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک انہی کا ساتھ رہا۔ اب شادی میں بھی وہی سب لوگ تھے۔''

''خالہ کیا ہو گیا تھا ماں کو؟'' اب ندرت سے رہا نہیں گیا۔

''ارے بیٹا کیا بتاؤں کیا ہوا تھا۔ بس جیسے نظر ہی کھا گئی تھی۔ کوئی بیماری بھی ایسی نہیں تھی ایک دم سے کمزور ہونے لگی تھیں۔ دوا، دعا، ٹونے ٹوٹکے بھی کچھ کیا۔ اس شہر کا کوئی ڈاکٹر کوئی طبیب نہیں چھوڑا... لیکن کمزوری تھی کہ ہر وقت بڑھ رہی تھی۔ تعویذ گنڈے وہ مانتی نہیں تھیں۔ چپکے چپکے دعائیں کرواتیں رہتی تھی۔ ایک دن بولیں۔

''حسنہ، میں سب جانتی ہوں، تم میرے لیے ہر جتن کر رہی ہو۔ لیکن میں جان گئی ہوں میری زندگی کی ڈور کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ دنیا سے جانے کو ابھی دل تو نہیں چاہتا لیکن خدا کی رضا شاید یہی ہے جو میں ٹھیک نہیں ہو رہی ہوں۔ ابھی تو وقت

آیا تھا خوشیوں کا..... معلوم نہیں اس میں اللہ کی کیا مصلحت ہے۔ اس لیے مجبور ہوں، میرے ماں باپ بھائی بہن سب ہی پاکستان ہجرت کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ رشتے دار سب اپنی اپنی مصروفیتوں کے ساتھ اپنی اپنی راہ پر چلے گئے۔ زندگی کے ساتھی کو بھی جانے کی جلدی تھی۔ خدا کے بعد صرف ایک تمہارا ہی سہارا ہے۔ میں اس بھرے گھر کے ساتھ وجاہت کو تمہاری سپردگی میں دیتی ہوں۔ میری بہو ڈھونڈ کر ایسی لانا جو اس گھر کی حفاظت کر سکے اور میرے بیٹے کو وہ رفاقت دے جو صحیح معنوں میں ایک مشرقی لڑکی کا شیوا ہے۔ میرے سارے طور طریقے اسے ایسے سکھا دینا بالکل ایسے جیسے میں اس کے اندر تحلیل ہوگئی ہوں۔ میرا وجاہت تب ہی خوش رہ سکتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو میرا کام تم اس طرح سے کرو گی جیسے میں کرتی۔ وعدہ کرو حسنہ، یوں سمجھ لو یہ میری آخری خواہش ہے اور جنتی باتیں کرتے کرتے سوگئیں۔ صبح جب میں ان کے کمرے میں آئی کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ پاس آکر دیکھا تو وہ دور جا چکی تھیں۔ رات کے نہ جانے کس پہر چلی گئیں۔ پتا ہی نہیں چلا، میں تو کمرے میں ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔'' یہ کہہ کر خالہ زار و قطار رونے لگیں۔ ندرت کا بھی دل بھر آیا۔ وہ بھی خالہ کے گلے لگ کر ایسے روئی جیسے اس کا کوئی بہت اپنا چلا گیا ہو۔ اور خبر ابھی ابھی ملی ہو۔ جب دونوں کا دل کچھ ہلکا ہوا تو خالہ کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''خالہ میرا آپ سے وعدہ ہی نہیں خود سے یہ وعدہ ہے، میں آپ کا یہ وعدہ ٹوٹنے نہیں دوں گی۔ جیسا آپ نے وعدہ ماں سے کیا تھا اور آپ قائم ہیں ایسا ہی وعدہ میں آپ سے کر رہی ہوں۔ میرے اندر ماں کی روح سرایت کرتی جا رہی ہے۔ میں بدلنے لگی ہوں۔ میں ویسی ہی بن جاؤں گی جیسی وہ تھیں یا جیسا وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھیں مگر ایک وعدہ آپ کو بھی مجھ سے کرنا ہوگا۔ میں آپ کی بہو نہیں بیٹی ہوں۔ آپ مجھے وہ سب سکھائیں گی بھی اور سمجھائیں گی بھی۔ میں نے ماں کو دیکھا نہیں، آپ نے انہیں ساری عمر دیکھا ہے۔ وجاہت صاحب کو بھی میں نہیں جانتی۔ وہ کیا پسند اور ناپسند کرتے ہیں۔ یہ سب مجھے سمجھنے میں وقت لگے گا، کئی مرتبہ غلطیاں بھی ہوں گی۔ آپ مجھے ماں بن کر سمجھائیں گی تبھی میں اس خوب صورت گھر کی حفاظت کر سکتی ہوں۔'' خالہ نے بڑھ کر ندرت کا ہاتھ چوم لیا۔

''شکر ہے میرے مولا کا۔ دلہن، تم اور تمہاری خوشیاں سلامت رہیں۔ واقعی، تم وہی لڑکی ہو جسے دیکھ کر میرے دل نے کہا تھا۔ یہی ہے وہ لڑکی، جس کا اس گھر کو انتظار تھا۔'' وہ تیزی سے اٹھیں۔

''خالہ بیٹھیں، باتیں کریں، مجھے آپ سے باتیں کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''بیٹا میں شکرانے کے دو نفل پڑھ کر آتی ہوں۔ کل سے میں بہت فکرمند تھی۔'' خالہ شکرانے کے نفل پڑھنے چلی گئیں۔ ندرت کا بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ بڑے لان میں جا کر ٹہلنے لگی۔ خالہ سے باتیں کر کے اور کچن گارڈن کی خوب صورتی سے وہ بہت مرعوب ہوگئی تھی۔ لان کی ہر ہر چیز کو بہت اپنائیت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے جیسے اور جس طرف بھی دیکھتی تھی، وہ خود کو بہت ہی منفرد دنیا میں پاتی تھی۔ اسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے وہ کسی خیالی دنیا میں گھوم رہی ہو۔

لان کے ایک کارنر میں درخت کے ایک موٹے تنے کو چوڑائی میں دو حصوں میں کاٹ کر الگ الگ بینچ کی شکل دی ہوئی تھی۔ ٹیبل بھی پتھر سے بنی

ہوئی تھی۔ ایک سائڈ پر سفیدے کی شاخوں کو کاٹ کر ایک مالی کا اسکیچ بنایا تھا۔ سر پر بانس کی تیلیوں سے بنا ہیٹ تھا۔ وہ ہاتھوں سے ایک گاڑی کھینچ رہا تھا۔ جس پر چھوٹے چھوٹے بہت سارے مختلف رنگوں کے پنیری سے بھرے گملے رکھے ہوئے تھے۔ وہ بہت دیر تک خوب صورتی اور آرٹ کے نمونے میں کھوئی رہی۔ پھولوں کے رنگ اس قدر خوب صورت تھے اور ایسی ترتیب سے رکھے تھے کہ وہاں سے اس کا ہٹنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ آم کے درخت پر کوئل زور سے کوکی۔ وہ چونکی اور بے چین ہوگئی۔ پھر وہ لان کے ساتھ ساتھ چلنے والی راہ داری پر تیز تیز چلنے لگی۔ وہاں املتاس کے اونچے اونچے درخت پھولوں سے لدے اس کے منتظر تھے۔ وہ بچپن سے ان پھولوں کی شیدائی تھی۔ لگانے والے نے کیا ذہانت اور خوب صورتی سے یہ درخت لگائے تھے۔ دونوں درختوں کے درمیان فاصلہ تھا اور اس فاصلے میں چار آئی وی سے ڈھکے خوب صورت پلرز اور ان پلرز پر ایک خوب صورت مچان جس کی چھت بھی آئی وی نے بہت خوب صورتی سے ڈھک لی تھی۔ املتاس کے دونوں درختوں نے بھی اوپر جا کر اپنے اپنے گدھے اس طرح سے نزدیک کر لیے تھے جیسے پھولوں کی ٹوکریاں اٹھائے دو دربان کھڑے ہوں۔ پھولوں کے گچھے ہل ہل کر ایک عجیب روحانی ماحول پیدا کر رہے تھے۔ ندرت اس قدر خوش ہوئی کہ اسے لگا جیسے وہ بھی پھولوں کے ساتھ ساتھ جھوم رہی ہے۔ وہ اس خوب صورت مچان پر چڑھنے کے لیے راستہ ڈھونڈنے لگی۔ اسے چھپی ہوئی ایک بانس کی سیڑھی نظر آئی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سیڑھی پر چڑھ گئی۔ اب وہ مچان کے اندر تھی۔ لکڑی کے فرش پر ایک سفید بالوں والا غالیچہ پڑا تھا۔ کونے میں ایک راکنگ چیئر، کچھ کشن اور ایک سائڈ ٹیبل پر رکھی ایک ڈائری اور ایک کونے میں خوب صورت بانسری۔ ندرت نے بانسری اٹھالی۔ بانسری کی دھنوں کے لیے وہ ہمیشہ سے ہی پاگل تھی۔ اس کے کانوں میں بانسری کی دھنیں رس گھولنے لگیں۔ املتاس کے پھول جھمکوں کی شکل میں کھڑکی سے آکر تاک جھانک کرنے لگے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اونچائی سے اسے اور بھی سب کچھ بہت اچھا لگنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک جادوئی کیفیت اس پر طاری تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی شہزادی ہو اور انجانے راستوں پر نکل آئی ہو۔ راستے میں ہر طرف جادوئی نظارے اس کے ارد گرد گھوم رہے ہوں۔ شام بھی نزدیک ہی تھی۔ صبح سے اب تک اس پر نئے نئے انکشاف ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خواب میں ہے یا حقیقت میں اس کی دنیا بدل گئی ہے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کی دنیا اس قدر خوب صورت اور رومان سے بھر جائے گی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ بے خودی میں کرسی پر ہی سو گئی اور نیم خوابی میں بولنے لگی۔

''اے خدا یہ کیا ہے...... اگر یہ خواب ہے تو میرا خواب نہ ٹوٹے، میں اسی کیفیت میں سوتی رہوں۔ مجھے سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ یہ دنیا بہت خوب صورت ہے، میں اس دنیا سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔ کیا میں اتنی خوش قسمت تھی کہ مجھے بن مانگے اتنا کچھ مل گیا۔ میں ایسی ہی دنیا تو چاہتی تھی۔''

''واقعی کیا یہ سچ ہے؟ اور تم اتنی خوش ہو۔'' آنکھیں بند کیے کیے اسے لگا جیسے وہ کسی مضبوط ہاتھوں کے حصار میں ہے۔ پھر ایک بہت ہی خوب صورت خوشبو اس کی سانسوں سے ٹکرائی۔ وہ اس جادوئی اور رومانوی دنیا کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ حصار

میں قید ہوتی چلی گئی۔ وقت بھی کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ درختوں پر چڑیوں کے گھونسلے تھے۔ شام بھی نزدیک تھی۔ چہچہاتی ہوئی چڑیوں کے غول آ کر شاخوں پر بیٹھنے لگے۔ ایک دم سے ہی اتنا شور، خوشی اور اطمینان کا شور۔ باہوں کا حصار ڈھیلا ہوا۔

''تو دوست پسند آیا میرا آشیانہ......؟''

''کہاں چلے گئے تھے آپ......؟'' ندرت نے سیڑھی سے اترتے ہوئے کہا۔ اس کا پاؤں پھسلنے کو ہی تھا۔ وجاہت نے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھیں آپ، ایک بار پھر سے کہیے۔''

''یوں اچانک کہاں چلے گئے تھے آپ؟''

''سچ بتا دوں......؟''

''ہاں بالکل سچ۔'' ندرت نے اس بار آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ڈھٹائی سے اپنے رفیق سفر کو دیکھا۔ وہ آنکھوں کے جادوئی سحر میں ڈوبتی چلی گئی۔ اتنی اپنائیت اور محبت کی وہ تاب نہیں لا سکی۔ آم کے درخت پر بیٹھی کوئل پھر زور سے کوکی...... اس نے گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

''ہم سفر میں تو کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ ایک رات کی دلہن کو چھوڑ کر میں کہاں جا سکتا تھا۔ میں اسی مچان پر تھا، یہی تو میرا گوشۂ عافیت ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک جب بھی تنہائی مجھے مارتی ہے، میں یہاں آ کر پناہ لے لیتا ہوں۔ میں اور میری بانسری کے سُر مل جاتے ہیں اور کل کی رات تو میں اکیلا بھی نہیں تھا۔ تمہارا خیالی پیکر میرے ساتھ تھا۔'' ندرت اپنے رات کے رویے پر پھر پشیمان تھی۔ وہ بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی، الفاظ تھے کہ کھوئے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں ندامت تھی۔ وہ نظریں نیچی کیے کھڑی تھی۔

''ندرت کیا خیال ہے......؟ مچان پر جا کر پھر بیٹھیں......؟ اوپر سے چاند کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔'' ندرت اس ذو معنی جملے پر شرما کر خوشی سے بولی۔

''ہاں ضرور۔''

''اچھا تو پھر اوپر جاؤ، میں ابھی آیا۔'' وہ مچان پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس بار وہ جگہ اور بھی اچھی لگی۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ بادل چاند کے اردگرد... بھاگ رہے تھے۔ چاند کبھی چلتا ہوا لگتا تھا تو کبھی ٹھہرا ہوا۔ وہ بچپن سے بادلوں اور چاند کی اس آنکھ مچولی کو دیکھتی آئی تھی۔ بڑی ہوئی تو چاند راتوں سے اسے عشق ہو گیا۔ ذہن کے کسی گوشے میں بانسری کے سُر راج کرنے لگے تھے۔ نہ جانے کون تھا وہ اور کہاں تھا...... وہ کہاں تھا جو چاند راتوں میں بانسری بجایا کرتا تھا۔ اس نے اسے کبھی دیکھا نہیں گرمی کی راتوں میں صحن میں لیٹ کر اپنا باریک دوپٹا منہ پر ڈال لیتی اور تھوڑی دیر میں آنکھیں کھولتی تو چاند بادلوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھوم رہا ہوتا۔ ساری ساری رات وہ اس آنکھ مچولی کے کھیل میں جاگتی رہتی۔ نہ جانے کون تھا جو بانسری بجا کر اس کے من کے تار جھنجوڑ دیتا تھا۔ اس کا کبھی اس کو دیکھنے کے لیے من نہیں کیا بس آنکھیں بند کیے سنتی رہتی تھی اور آج وہی چاند رات اس کی زندگی میں حقیقت بن کر اتر آئی تھی۔ بانسری بجانے والا بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وجاہت اس کے سامنے تھے، سفید کلف والا کرتہ پاجامہ پہنے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا بہت وجیہہ لگ رہے تھے۔

''ندرت آپ چائے شوق سے پیتی ہیں یا پھر پینے کے لیے پی لیتی ہیں۔'' چائے کا تھرماس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اگر خوب صورت ساتھ ہو تو چائے بہت شوق سے پیتی ہوں۔'' ندرت نے ذرا شوخی سے جواب دیا۔

''اس وقت میں کیا سمجھوں......؟ آپ چائے شوق سے پئیں گی......یا......؟'' وجاہت نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

''کچھ باتیں سمجھنے کی ہوتی ہیں...... کہہ دیا جائے تو...... جانتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

''کیا ہوتا ہے......؟'' وہ بالکل اس کے مدِ مقابل تھے۔

''خوشی کم ہو جاتی ہے۔'' ندرت نے آنکھیں نیچے کیے کیے کہا۔

''اس کا مطلب میں یہ سمجھوں، آپ میری سنگت میں خوش ہیں۔''

''جی۔''

''کیا میں یقین کرلوں کہ آپ میرے ساتھ خوش ہیں، اپنے دل و دماغ دونوں سے صلاح لے کر مجھے بتایئے گا۔'' اس بار ندرت نے بہت سمجھداری سے بات کو سنبھالا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''وجاہت صاحب میں اس چاند کے سامنے اقرار کرتی ہوں کہ میں آپ کا ساتھ دل و دماغ دونوں کی رضا سے یہ خوشی قبول کرتی ہوں اور یہ خدا جانتا ہے اس میں کسی مصلحت کو دخل نہیں ہے، رات بہت تھک گئی تھی۔'' ندرت نے نظریں نیچی کر کے کہا۔

''چلیں مان لیتے ہیں کہ آپ تھک گئی تھیں لیکن اتنا ضرور جان لیجیے کہ کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں۔'' پھر اور شوخی سے کہا۔ ''اور ہاں میرے وجود سے آپ کی نظر ٹوٹتی رہے گی۔'' ندرت پھر شرمندگی سے بولی۔

''پلیز ایسا مت کہیں، میں شرمندہ ہوں اپنے رویّے کے لیے۔ اپنے دل سے ہر کدورت کو نکال پھینکیں۔ آپ بہت عظیم ہیں اور مجھے فخر ہے کہ مجھے آپ جیسا ساتھی ملا۔ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بخدا میں نے ایسی ہی زندگی کی تمنا کی تھی۔ میں آپ کی دوست بن کر آپ کی زندگی سے ہر تنہائی کو ختم کردوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے، خالہ نے جب سے مجھے ماں کے بارے میں بتایا ہے، میں ان کو اپنے اردگرد محسوس کر رہی ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ان کی روح کو کبھی مایوس نہیں کروں گی۔ میں ویسی ہی بن جاؤں گی جیسا وہ مجھے چاہتی تھیں۔ اب آپ اپنے ساتھ ان کی بھی پسند اور ناپسند بتائیں گے۔ میں ان کی ہر بات ہر طریقہ اپنانا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر ممّا بننا پڑے گا۔'' وجاہت شرارت سے مسکرائے۔

''مطلب......؟ مطلب کیا ہے......؟''

''مطلب یہ کہ میری ماں اپنا گھر معصوم قہقہوں اور چھوٹے چھوٹے لڑائی جھگڑوں سے بھرا دیکھنے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ اب بتاؤ کیا خیال ہے؟'' وجاہت شرارت سے پھر مسکرائے۔

''بننا چاہو گی میرے لڑتے جھگڑتے بچوں کی ممّا؟ میں اکیلا تھا نا اس لیے میری ماں ایسے خواب دیکھا کرتی تھیں، ابا بھی بہت ہی جلد ہم سے جدا ہوگئے۔ میری ماں بہت ہی بہادر اور صابر خاتون تھیں۔ کبھی خدا سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ صبر سے وقت گزارہ۔ ہم دونوں ماں بیٹے سے زیادہ اچھے دوست تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ اس طرح دیا کہ مجھے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ آج جو یہ سجا سجایا گھر دیکھ رہی ہو۔ انہی کا بنایا ہوا ہے۔ ہم نے خود کو اتنا مصروف کرلیا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں

اس طرح مگن ہوئے کہ ہر دن بہت خوب صورت لگا۔ وقت بہت خوبی سے آگے بڑھا۔ اب تم آگئی ہو، مجھے یقین ہے کہ آئندہ وقت بھی سکون سے گزرے گا اور میری ماں کی روح بھی مطمئن ہو جائے گی لیکن ندرت، خالہ کو بھی تھوڑا سا بھی ناخوش نہیں کرنا میں خالہ کو ماں کی پرچھائی سمجھ کر پہچانتا ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ یہ گھر میری ماں کا بنایا ہوا گھونسلہ ہے۔ انہوں نے بہت محنت کی، اسکول میں بھی گھر میں بھی بچوں کو پڑھاتی رہیں اور تعلیم کے اخراجات برداشت کرتی رہیں۔ خالہ بھی ان کے شانہ بشانہ ساتھ تھیں۔ نہ تو انہوں نے اپنی زندگی کا سوچا اور نہ خالہ نے۔ دونوں کا مقصد میں تھا۔ میں نے اپنی ماں کو تن اور من سے اس گھر کا دیکھا ہے۔ میں تمہیں بھی ایسے ہی دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ گھر تب ہی مکمل ہوتا ہے جب اس میں پیار ہو۔ گھر کے ماحول میں محبت کی چاشنی ملی ہو، تب ہی خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔ خوب صورت رنگوں کی تتلیاں اڑتی ہیں اور رحمت کے فرشتے کچھ خوشی بکھیر جاتے ہیں گھر چاہے چھوٹا ہو یا بڑا...... بس گھر ہوتا ہے۔ خوشی ہو تو گھونسلے میں بھی آرام اور خوشی نہ ہو تو محل بھی ویران، میں اپنی ماں کے بنائے ہوئے گھونسلے کی حفاظت اب تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں اور یہ بندۂ ناچیز تمہارا نگہبان اور چوکیدار...... ہر دم تیار۔'' وجاہت نے بہت تابعداری سے سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھک کر اس طرح سے کہا کہ ندرت کو بے اختیار ہنسی آگئی...اور دونوں قہقہے لگاتے ہوئے مچان سے نیچے اتر آئے۔

☆☆☆

وجاہت اور ندرت خوشیوں سے سرشار وقت کے ساتھ چلتے رہے۔ گھر میں خوشیاں آئیں، ایک نہیں دو نہیں تین نہیں پانچ بچوں کی زندگیاں وجود

میں آئیں۔ وہ ہنستے، کھیلتے، لڑتے جھگڑتے بڑے ہوئے۔ تعلیم حاصل کی، ترقی کی دوڑ میں شامل ہوئے۔ وقت کے تقاضے کے ساتھ ایک کے بعد ایک اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جاتے رہے۔

گھونسلے کے مکیں اپنی ہی چھت کے نیچے بچوں کے جانے اور آنے کے انتظار میں دعاؤں کے لیے ہاتھ پھیلائے بیٹھے رہے۔ محنت اور ان تھک محنت کے نتیجے میں پانچوں بچے اپنی اپنی جگہ سیٹ ہوگئے۔ سب بچوں کے زندگی کے ساتھی آئے اور اپنے اپنے رنگ کے ساتھ اپنا اپنا مزاج بھی لائے۔ آنا اور جانا لگا رہتا تھا۔

بانسری کے سُر اب بھی فضا کو خوشگوار بناتے تھے لیکن اکثر لے درد کا، جدائی کا گیت الاپنے لگی تھی۔ وجاہت اور ندرت ہنستے ہنستے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کی چادر میں لپٹ جاتے تھے۔ دونوں جدا جدا، اکیلے اکیلے، ساتھ ساتھ۔ ایک دوسرے سے بے نیاز۔ دل وہ کچھ مانگتا تھا جو کھو گیا تھا۔ جوانی کے ساتھ بہت کچھ کھو دیا تھا انہوں نے۔ جسم سفر کرتے کرتے تھک رہے تھے۔

☆☆☆

ایک شام بانسری کے سُر دھیمے ہوتے ہوتے ایسے ٹوٹے کہ خود ندرت کو بھی پتا نہیں چلا۔ جب ہوش آیا تو بانسری کی خوب صورت دُھن بجانے والا ابدی نیند سو گیا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی تھی، بچے سات سمندر پار دوسرے ملک میں اور وہ تنہا...... کوئی آسکا اور کوئی نہیں آسکا۔ جو آیا وہ بھی چند دنوں کی چھٹی کے بعد چلا گیا۔

ندرت حیران اور پریشان سفید دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی اب وہ تھی اور خالی گھونسلہ تھا۔ تمام دن خالی گھر میں اِدھر سے اُدھر پھرا کرتی۔ کچھ بچے تھے جو پڑھنے آیا کرتے تھے اور ایک دن سب سے بڑا بیٹا آیا۔ ماں کا پاسپورٹ بنایا، کچھ کاغذی کارروائی کی اور ولایت لے گیا۔ ندرت کا اپنے گھر کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مانتا تھا لیکن پانچوں بچوں کا اصرار تھا۔

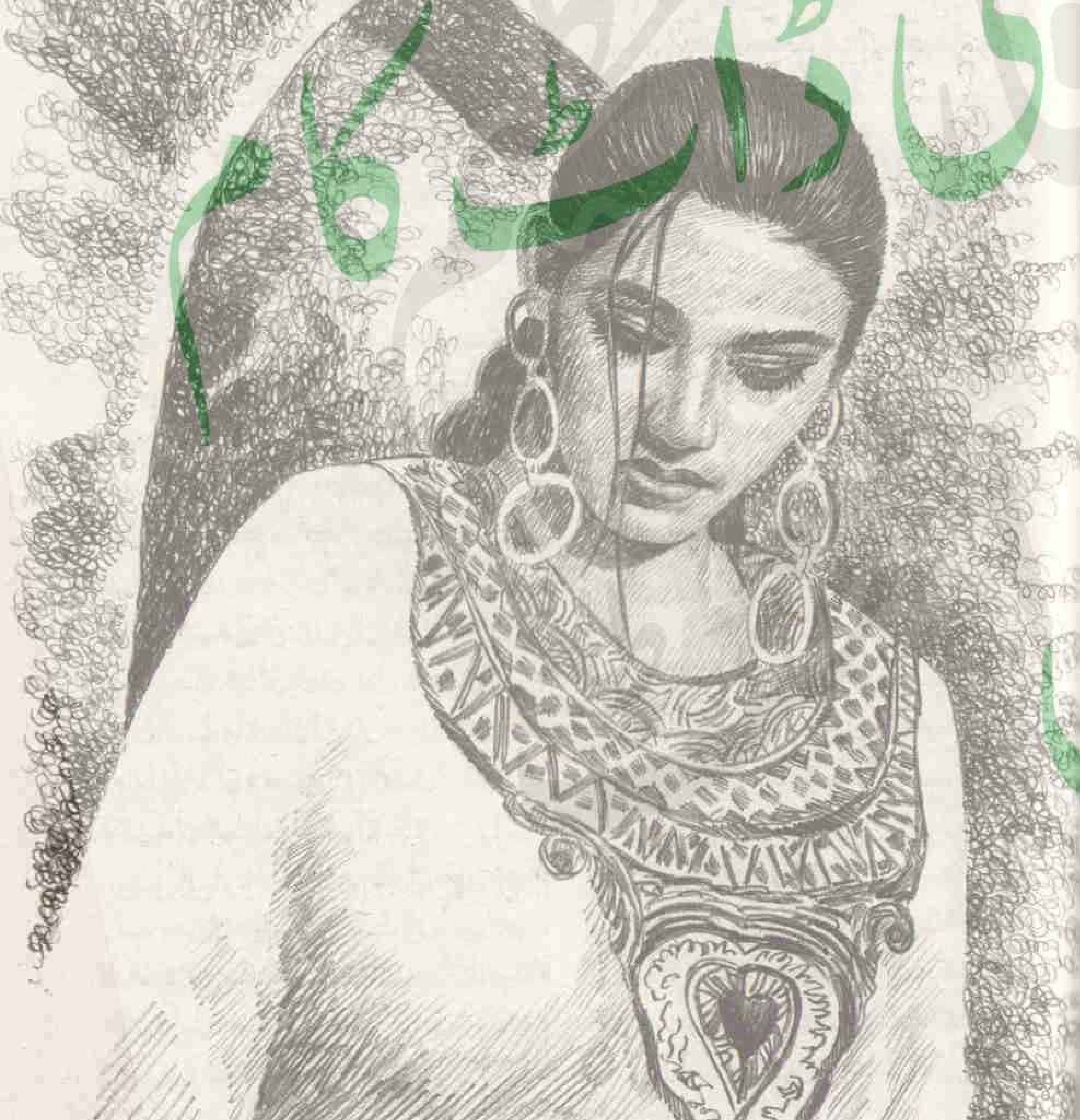
''ماں ہم نہیں آسکتے تم آجاؤ۔ یہاں کی دنیا مختلف ضرور ہے لیکن ہم یہاں ہیں۔'' اور ندرت دل پر پتھر رکھ کر چلی گئی۔ اس دنیا کو بہت خوب صورت پایا لیکن اپنی دنیا بدل گئی تھی۔ باری باری سب کے پاس رہی لیکن وہ سب بچوں کے گھر تھے۔ ہر کمرا کسی نہ کسی بچے کا تھا۔ کہتے تو تھے سب دادی لیکن نہ تو کسی کے پاس وقت تھا اور نہ کوئی ایک الگ کمرا۔ بیگ اٹھائے اٹھائے کبھی ایک گھر تو کبھی دوسرے گھر۔

پھر طے یہ ہوا کہ سب سے چھوٹی بیٹی بقول بڑی بہو کے اماں کو سب سے زیادہ پیاری بھی ہے اور اس کے پاس وقت بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ندرت کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔ چار بیٹوں کی اماں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اس بیٹی کے گھر میں بھی جگہ نہ بنی تو کہاں جاؤں گی......؟ وہ آزردہ تھی کچھ دیر کے لیے سو گئی۔ وجاہت خواب میں کہہ رہے تھے۔

''ندرت دکھی کیوں ہو......؟ کیا حقیقت کو نہیں سمجھتیں، یہ گھر تمہارے بچوں کے ہیں یہاں تو ملنے کے لیے آئی ہو۔ آؤ اپنے گھر، تمہارا یہ گھونسلہ تمہارا یہ گھر...... اس کے در و دیوار تمہارے منتظر کھڑے ہیں پھول کھلتے ہیں تو تمہارے لیے خوشبو بکھرتی ہے تو تمہارے لیے اور میں بھی تمہیں یہاں نہ پا کر اداس ہو جاتا ہوں۔ آجاؤ، میں ہوں نا...... میں کروں گا تمہاری حفاظت......'' اور دوسرے ہی ہفتے ندرت نے اپنا بیگ پیک کر لیا۔ یہ کہہ کر کہ تمہارے ابا کی پہلی برسی ہے، میں اپنے ہی گھر میں ہی فاتحہ کراؤں گی۔

ناشکری

سلمیٰ غزل



وہ بلاشبہ خوب صورت تھی سرو قد، گورا رنگ، لمبے سیاہ بال اور نازک سراپا اسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ ملنے جلنے والے اور آنے جانے والوں نے جانے کیسے اس کے دماغ میں یہ خناس بھر دیا تھا کہ شوہر اس کے مقابلے میں زیرو ہے...... کم رو...... معمولی شکل۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ناشکری اس پر ختم تھی جب اس کی شادی ہوئی تو اس کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا جہاں صورت سے زیادہ سیرت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لیے گھر والوں نے فاخر کی صورت سے زیادہ اس کی تعلیم، رکھ رکھاؤ شائستگی اور سیرت کو فوقیت دی اور اسے فاخر کے سنگ رخصت کر دیا۔ جو بے حد نیک سیدھا سادہ اور بے ضرر انسان تھا ہاں شکلاً اس کا اقرا سے کوئی مقابلہ نہیں تھا کہ اس کا رنگ ذرا دبتا ہوا اور معمولی نین نقش تھے پھر اسے اوڑھنے پہننے اور خود کو ٹپ ٹاپ میں رکھنے کا کوئی خاص شوق بھی نہیں تھا...... لیکن اقرا سے اسے والہانہ محبت تھی اور خود سے زیادہ اس کو اقرا کے آرام و آسائش اور بننے سنورنے کا خیال رہتا تھا لیکن اقرا کو اس کی قدر نہ تھی وہ جب بھی آفس سے آتا وہ ننگی شمشیر بنی رہتی مسکراہٹ تو جیسے عنقا تھی، چڑچڑاہٹ اس کے چہرے سے عیاں ہوتی اور اس کے بیزاریت بھرے چہرے پر پیار کی ایک نظر ڈال کر فاخر پیار سے پوچھتا۔

"کیوں بھئی، دن کیسا گزرا؟"

"وہی بیزار کن...... دن بھر کولھو کے بیل کی طرح گھر کا کام کرتے ہوئے خود تو مزے سے باہر نکل جاتے ہیں اور میں بچوں اور گھر میں گھن چکر بنی رہتی ہوں۔" وہ تڑخ کر جواب دیتی، تیوریوں پر بل ڈال کر۔

"بھئی ناراض کیوں ہوتی ہو، میں کون سا تفریح کرنے جاتا ہوں آخر اس گھر کی بچوں کی اور تمہاری آسائش کے لیے ہی تو نوکری کرتا ہوں۔" فاخر کے تحمل میں کوئی فرق نہیں آتا۔

"ہاں تو بڑا احسان کرتے ہیں چار پیسے کما کر...... ساری دنیا کے مرد کماتے ہیں آپ کون سا انوکھا کام کرتے ہیں۔" وہ غصے اور جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتی اور فاخر کی ہمت نہ ہوتی کہ اس کو احساس دلائے کہ گھر کا کام تو ساری دنیا کی عورتیں کم و بیش کرتی ہیں بلکہ وہ کوشش کرتا کہ گھر کے کاموں میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا دے۔

☆☆☆

اس دن شام کو جب فاخر تھکا ہارا گھر پہنچا تو گھر پانی پت کا میدان بنا ہوا تھا۔ اقرا چیخ رہی تھی اور چاروں بچے سہمے ہوئے کونے میں کھڑے تھے۔

"کیا ہوا......؟" فاخر نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا......" وہ چمک کر بولی۔ "کس گنوار اور اجڈ محلے میں تم نے گھر بنایا ہے...... کوئی بھی محلے والا جب دیکھو...... لڑنے مرنے کو تیار...... اب دیکھو ذرا کھیلتے ہوئے پڑوس میں بچے کی بال چلی گئی تو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا، میں نے بھی جا کر دس سنا دیں انہیں، بڈھے بڑھیا کے ہوش ٹھکانے آگئے خود تو دونوں لاولد ہیں اور دوسروں کے بچے بھاتے نہیں...... اب کیا ان کی وجہ سے بچے گلی میں کھیلنا چھوڑ دیں۔" وہ ہاتھ چلا چلا کر زور سے بولی۔

"دیکھو اقرا پڑوس کے لوگ عمر رسیدہ ہیں، اب تمہارے بچے ہر تھوڑی دیر بعد بال ان کے گھر میں پھینکیں گے تو وہ کب تک دیتے رہیں گے، غلطی تو تمہارے بچوں کی ہے گراؤنڈ میں جا کر کیوں نہیں کھیلتے......؟"

"کیا روڈ ان کے باپ کی ہے۔ پانچ مرلے کے گھر میں بچے کیا کھیلیں؟" وہ غصے سے دہاڑی۔ "وہ کون ہوتے ہیں روکنے والے میں تو ایسا سنا کر آئی ہوں کہ سات پشتیں یاد رکھیں گی بولتی بند ہو گئی، بڑے میاں بڑی بی کی۔"

فاخر پر گھڑوں پانی پڑ گیا، پڑوس کے انکل سے اس کی اچھی خاصی ہیلو ہائے تھی، بڑے باوقار، مدبر اور مرنجاں مرنج...... اولاد نہ ہونے کے باوجود دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی رفاقت میں خوش تھے۔ پورا محلہ ان کے خلوص اور اخلاق کا گرویدہ تھا اور اقرا نے دو منٹ میں ان کی عزت دو کوڑی کی کر دی تھی۔ وہ تھکا ہارا آفس سے آیا تھا، اقرا کی باتوں نے اسے نڈھال کر دیا۔ اسے لگا دنیا بھر کا بوجھ کسی نے اس کے کندھوں پر ڈال دیا ہو پھر بھی جلی بھنی بیوی کو تسلی دینا اور خوش رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا اس لیے اس نے حوصلے اور ضبط سے کام لیتے ہوئے پُرسکون لہجے میں اقرا کو سمجھایا۔

"دیکھو اقرا تم پڑھی لکھی سمجھدار ہو کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتی ہو، تھوڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا کرو، پڑوسیوں سے وہ بھی بوڑھے الجھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ سارا دن آفس سے تھک کر آؤ تو دل چاہتا ہے تمہاری حسین شکل دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہو جائے مگر تمہیں غصے سے ہی فرصت نہیں۔ پتا ہے غصہ انسان کی خوب صورتی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔" اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر ہی فاخر اس کا غصہ ٹھنڈا کر پاتا تھا لیکن یہ اثر صرف وقتی ہوتا تھا اس کی بلاوجہ کی بڑبڑاہٹ جاری رہتی، ہر جملہ طنز میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ کبھی کبھی فاخر کو لگتا اس نے اس سبجیکٹ میں پی ایچ ڈی کر رکھا ہے اور جب کبھی فاخر کو کوئی جواب نہیں سوجھتا تو وہ اقرا کی باتوں کا قائل ہو جاتا۔

"ٹھیک تو کہتی ہے بے چاری، چار بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن...... ماں باپ نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا یہاں میرے پاس آکر اسے کیا ملا۔ پانچ مرلے کا گھر چار بچوں کا ساتھ...... ہوشربا مہنگائی اور روز، روز کی دانتا کل کل...... غصہ نہ کرے تو کیا کرے اس گھر میں آکر اس کے حسن کو گہن لگ گیا، پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔" وہ چور سا بن جاتا اور معذرت بھرے انداز میں اقرا کو سمجھانے لگتا۔

"دیکھو تھوڑا صبر کرو میرا پرموشن ہونے والا ہے پھر ہم یہ گھر بیچ کر کسی پوش ایریا میں اپارٹمنٹ لے لیں گے اور اس محلے سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ میری تو دلی خواہش ہے کہ ہر سکھ اور راحت تمہیں دوں مگر مجبور ہوں تنخواہ ربڑ نہیں جو کھینچ کر لمبا کر لوں۔"

"بس، بس......" اقرا کا غصہ کم ہونے میں نہیں آتا۔ "سالوں سے سن رہی ہوں پرموشن ہونے والا ہے...... پرموشن ہونے والا ہے جو آج ہوا نہ کل ہوگا اور ہو بھی گیا تو کون سے لاکھوں بڑھیں گے، چند ہزار روپے اور مہنگائی کے لحاظ سے اونٹ کے منہ میں زیرہ...... میں نے تو اب اچھے دنوں کے خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیے ہیں...... پتا نہیں اماں ابا نے میرے لیے کیا دیکھا تھا بس یہی کہ لڑکا شریف ہے، اپنا گھر ہے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں، بیٹی راج کرے گی......" اقرا نے منہ ٹیڑھا کر کے ماں باپ کی نقل اتاری۔

"اب آکر دیکھیں بیٹی کیسے گھر میں ماسی بنی ہوئی ہے۔ ابا کے کاروبار نے ترقی کی اور چاروں بھائی اور ان کی بیویوں کے عیش ہو گئے۔ جھوٹے منہ بھی کہہ دوں تو ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیج ہی دیں مگر تمہاری تو ناک بڑی لمبی ہے۔"

فاخر سب کچھ برداشت کر سکتا تھا لیکن سسرال کے آگے ہاتھ پھیلانا اسے منظور نہیں تھا۔ اس کی غیرت بلبلا اٹھتی، لگتا تھا کسی نے زناٹے دار تھپڑ مار دیا ہو۔ نہ وہ خفا ہوتا نہ ناراض ہوتا کیونکہ یہ وہ آئینہ تھا جو اقرا اسے وقتاً فوقتاً دکھاتی رہتی تھی اور وہ صبر سے اچھے دنوں کے انتظار میں اور زیادہ محنت کرنے لگتا کبھی کبھی وہ سوچتا کاش اس نے بھی کسی مشہور یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہوتا تو اس کی تنخواہ بھی بہت اعلیٰ ہوتی اور یوں اقرا سارا دن اپنے باپ اور بھائیوں کی امارت کے گُن نہ گاتی ان کی دولت کی دھونس نہ جماتی، سارا جھگڑا پیسے کا تھا اگر وہ ہر مہینے اس کو بوریاں بھر بھر کر پیسے دیتا تو وہ خوش رہتی۔ اس کو حسن کے زعم اور بھائیوں کی دولت نے مغرور اور خود پسند بنا دیا تھا۔

اول تو ان کے گھر کوئی آتا نہیں تھا اور اگر کبھی کوئی بھولے بھٹکے آ بھی جاتا تو فاخر کے لیے مصیبت ہو جاتی۔ اقرا کو یہ غم کھائے جاتا کہ اس قدر چھوٹا گھر دیکھ کر وہ ان کی حیثیت کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔

”میرے گھر کراچی جا کر میرے گھر والوں کو میری مالی حالت بتائیں گے تو ان کو کس قدر شرمندگی ہوگی۔“ کبھی کبھی فاخر کا دل چاہتا اپنا بیمہ کرا کے خود کشی کرلے تاکہ اقرا کو ڈھیر سارا روپیہ مل جائے مگر بچوں کی محبت آڑے آجاتی جن میں اس کی جان تھی کبھی کبھی جب غصے میں اقرا کہتی۔

”دس سال میں تم نے مجھے دیا ہی کیا ہے، چار بچے......؟“ تو وہ شرارت سے کہتا۔

”کم ہیں اور کوشش کریں، میں تو تیار ہوں تم نے ہی ہتھیار پھینک دیے۔“ تو اقرا کا غصے سے برا حال ہو جاتا کیونکہ بچے یوں بھی ماں سے زیادہ باپ کے قریب تھے بالکل باپ کا پرتو صابر، شاکر اور معصوم...... ضد کرنا اور فرمائشیں کرنا تو جیسے ان کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اقرا، فاخر کے مقابلے میں خوش شکل تھی مگر ہر وقت کی چڑ چڑاہٹ، جھنجلاہٹ اور غصے نے اس کے چہرے کو کرخت بنا دیا تھا۔ جبکہ فاخر کے چہرے پر ہمہ وقت ایک نرم سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ پورا محلّہ اس کے اخلاق کا گرویدہ اور اقرا کے غصے سے خائف تھا مگر اقرا اسے جانے کس نظر سے دیکھتی تھی کہ اسے اس میں سوائے نقص کے کوئی خوبی نظر نہیں آتی تھی۔ جب دونوں کبھی ساتھ باہر نکلتے تو اقرا کے کپڑے فاخرانہ اور فاخر کے غریبانہ ہوتے تھے۔ اقرا ناقدانہ نظر سے دیکھتی اور اس کی بڑبڑاہٹ شروع ہو جاتی تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ فاخر خوشی خوشی تنخواہ کا بڑا حصہ اس کی آرائش اور زیبائش پر خرچ کر دیتا ہے۔

کبھی کبھی غصے میں آ کر وہ اپنے ماں باپ کو بھی برا بھلا کہنے سے نہ چوکتی جنہوں نے اسے اس جہنم میں دھکیل دیا...... آخر فاخر میں انہوں نے دیکھا ہی کیا تھا شرافت اور ایمانداری، جس کا کوئی مول نہیں اور جس سے زندگی کی آسائشیں اور خواہشیں خریدی نہیں جاسکتیں...... وہ سمجھتی تھی کہ وہ دنیا کی عظیم ترین عورت ہے جو فاخر جیسے کمزور مرد کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے۔ کبھی کبھی فاخر اسے مذاق میں چھیڑتا۔

”بھئی حدیث ہے کہ جہنم میں زیادہ تر ”ناشکری“ عورتیں جائیں گی۔“ تو وہ تڑاخ سے جواب دیتی۔

”تمہارے جیسے مرد کے ساتھ گزارہ کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ ویسے ہی مجھے جنت میں بھیج دے گا۔“ فاخر کا احساسِ کمتری بڑھ جاتا اور وہ سوچنے لگتا۔

”صحیح تو کہتی ہے اس جیسی خوب صورت عورت کو تو کسی محل میں ہونا چاہیے تھا، یہ چھوٹا سا گھر اس کے شایانِ شان تو نہیں...... یہ تو اس کا دل گردہ اور حوصلہ ہے جو وہ میرے ساتھ نبھا کر رہی ہے۔“ سوائے غصے اور بدمزاجی کے فاخر کو اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی...... کبھی کبھار وہ اسے اور بچوں کو درمیانے درجے کے ہوٹل میں لے جاتا تو یہاں بھی اقرا مبالغہ آرائی کی حد کر دیتی۔

”میں شادی سے پہلے کبھی ایسے ہوٹلوں میں نہیں گئی، میرے چاروں بھائی ہر سال مجھے سالگرہ پر علیحدہ علیحدہ ہوٹلوں میں لے جاتے تھے کبھی پی سی، کبھی شیرٹن کبھی لال قلعہ اور کبھی ولیج......“ اور فاخر بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ البتہ بچے بڑے جوش وخروش سے ہر چیز کے ساتھ انصاف کرتے، خوش ہو کر کھاتے، خوشی کا اظہار کرتے، باپ سے لپٹ جاتے اور فاخر کی تمام کلفت یکلخت ختم ہو جاتی اور وہ ایک دم ہلکا پھلکا مسرور ہو جاتا۔

☆☆☆

ایک دن تو حد ہو گئی فاخر بڑی چاہ سے اس کے لیے ایک سوٹ خرید کر لایا لیکن اس نے اسے درخود اعتنا نہ جانا بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے بھائیوں کے ذوق کی تعریف شروع کر دی اس نے یہیں تک بس نہیں کیا بلکہ اس نے فاخر کو صاف صاف بتا دیا۔

”میں جب چاہوں اپنے بھائیوں کے پاس جاسکتی ہوں اور عیش و آرام سے رہ سکتی ہوں کیونکہ میرے چاروں بچے اور میں بھائیوں پر بھاری نہیں ہوں گے بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں گے۔ میرے بھائی ساری زندگی مجھے بٹھا کر کھلا سکتے ہیں۔“ اس نے غرور سے سر اٹھا کر فاخر کی طرف حقارت سے دیکھا۔ فاخر کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میکے کی تعریف سن سن کر اس کے کان پک چکے تھے، اس کی شرافت، نیکی اور بیوی، بچوں سے والہانہ اور بے لوث محبت انتہائی قدم اٹھانے سے باز رکھے ہوئے تھی مگر آج اقرا نے حد کر دی تھی اور روز روز کے ان نت نئے جھگڑوں نے اسے عاجز کر دیا تھا اس لیے اس نے بھی کہہ دیا۔

”اگر تم سمجھتی ہو کہ تم میکے میں زیادہ خوش رہ سکتی ہو تو جب چاہے چلی جاؤ، یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے مگر میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔“ اقرا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بچے باپ سے بے تحاشا محبت کے باوجود کراچی جانے کے لیے خوشی خوشی تیار ہو گئے۔ شدید گرمی کی وجہ سے فاخر نے ٹرین سے بچوں کو بھیجنا مناسب نہیں سمجھا اور جیسے تیسے پلین کے ٹکٹوں کا بندوبست کیا وہ سب کی جدائی کے خیال سے رنجیدہ اور پریشان تھا لیکن اس نے انہیں زبردستی روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☆☆☆

جس وقت جہاز نے قائداعظم ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اپنے ہوش میں بچوں کا یہ پہلا فضائی سفر تھا قدرتی طور پر وہ بے حد خوش اور پُرجوش تھے جبکہ اقرا یہ سوچ سوچ کر خوش تھی کہ اب فاخر کو آٹے دال کا بھاؤ پتا لگے گا نہ وقت پر ناشتا نہ کھانا، نہ دھلے دھلائے کپڑے، نہ صاف ستھرا گھر۔ وہ گھر پہنچنے کے لیے بے تاب تھی اس نے جس طرح فاخر کے سامنے اپنے گھر والوں کے گُن گائے تھے قدم قدم پر اپنے میکے والوں کی بڑائی سامنے رکھ کر فاخر کی تضحیک کی تھی اس کی غربت کا مذاق اڑایا تھا اب ان کا سامنا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ اس کو معلوم تھا اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا...... چلنے سے پہلے اس نے موبائل پر اماں کو اطلاع دے دی تھی تاکہ ایئرپورٹ کوئی لینے آجائے اور اس کو یقین تھا چاروں بھائی ایئرپورٹ پر موجود ہوں گے...... سامان ٹرالی میں رکھ کر جیسے تیسے وہ بچوں کو لے کر باہر نکلی تو اس کی متلاشی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں، بے پناہ ہجوم میں اسے اپنے بھائیوں کو ڈھونڈنا مشکل لگ رہا تھا۔ تمام مسافر روانہ ہو چکے تھے، بچے الگ پریشان کر رہے تھے کہ جن ماموؤں کی وہ سارے راستے تعریف کرتی آئی تھی ان کا دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ ابھی وہ موبائل پر بات کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اس کو اپنا بھائی احتشام نظر آیا۔ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

”دیکھو وہ رہے ماموں......!“ احتشام نے قریب آ کر بے تابی سے بہن کو گلے لگایا بچوں کو پیار کیا پھر معذرت بھرے انداز میں بولا۔

”یار پارکنگ میں دیر ہو گئی ورنہ کب سے ایئرپورٹ پہنچ گیا تھا۔“ پھر اس نے استفسار کیا۔

''فاخر نہیں آیا؟ چلو اچھا ہوا بلاوجہ اس کے چونچلے اٹھانے پڑتے' داماد جو ہوا۔'' بچے ہونڈا سٹی میں بیٹھ کر بہت خوش تھے۔ اپنے ہوش اور شعور میں پہلی مرتبہ کراچی آئے تھے اور شاہراہِ فیصل کی کشادہ اور چوڑی روڈ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ فلائی اوورز تو لاہور میں کافی بن گئے تھے لیکن کراچی میں جو قدم قدم پر فلائی اوورز کا جال بچھا تھا وہ ان کے لیے حیرت کا باعث تھا...... بھائیوں نے ناظم آباد سے ڈیفنس کا سفر کب اور کیسے طے کیا اس سے اقرا بھی لاعلم تھی...... ڈیفنس کے ایک کشادہ بنگلے کے گیٹ پر ماں اس کے استقبال کو موجود تھیں انہوں نے محبت سے سب کو گلے لگا کر پہلا سوال فاخر کے بارے میں کیا۔

''کیوں چندا، فاخر کیوں نہیں آیا اس سے ملے عرصہ ہوگیا؟''

''نام مت لیجیے اس کا میرے سامنے۔'' وہ بھنا کر بولی۔ ''چھوڑ آئی ہوں میں اسے ہمیشہ کے لیے اب کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' اماں پرانے وقتوں کی عورت...... ان کا دل دھک سے ہوگیا۔

''صحیح کہہ رہی ہوں' نہ جانے کیا دیکھ کر آپ نے مجھے اس جہنم میں جھونک دیا، نہ اچھا کھانے کو نہ پہننے کو...... ترس ترس کر زندگی گزارتے گزارتے تھک گئی ہوں...... اس پر فاخر کی شکل مجھے تو کہیں ساتھ جاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''بری بات ہے بیٹا، دنیا میں سب ایک جیسے نہیں ہوتے، شکل صورت کو کیا چاٹنا ہے، سیرت اچھی ہونی چاہیے اور سیرت کے لحاظ سے فاخر لاکھوں میں ایک ہے۔ ہیرا ہے ہیرا میرا داماد......''

اماں کے لہجے میں فاخر کے لیے مان اور فخر تھا۔ اقرا اماں کی تعریف سے بجھ سی گئی' بچے بھی اجنبی جگہ گھبرائے ہوئے تھے نانا بھی فالج کی وجہ سے بستر کے ہو کر رہ گئے تھے اس نے بجھے دل سے پوچھا۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے کیا' احتشام بھائی بھی راستے میں خاموش، خاموش تھے؟''

''اصل میں چاروں بھائیوں کا تمہارے آج فیملی کے ساتھ پکنک کا پروگرام تھا، وہ سب چلے گئے احتشام تمہاری وجہ سے رک گیا تھا اب وہ بھی چلا گیا ہو گا۔'' اماں کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ اقرا الجھ سی گئی کیا وہ اس کی خاطر رک نہیں سکتے تھے اکلوتی بہن کو انہوں نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ شام کو چاروں لوٹ آئے بڑی گرمجوشی سے سب کو گلے لگایا۔ چاروں بھاوجوں نے بھی اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا لیکن یہ سن کر کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگئی ہے سب کے منہ بن گئے۔ کسی نے بھی اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں کرلیا۔ فاخر سے کس بات پر جھگڑا ہوا۔ بچے جو ماموں کے انتظار میں سوکھ رہے تھے۔ خوش ہوگئے اور ماموؤں کے بچوں کے ساتھ گھل مل گئے۔

☆☆☆

اس نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں دکھ اور خفت محسوس کی۔ وہ کیا سوچ کر آئی تھی اور کیا نظر آرہا تھا۔ ابا، اماں کی حیثیت گھر میں عضوِ معطل کی سی تھی، چاروں بھائیوں اور ان کی بیویوں میں بڑا ایکا اور اتفاق تھا۔ انہوں نے اماں ابا کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔ ابا بستر پر تھے اور اماں بھائیوں کی نظرِ کرم کے محتاج، کسی نے بھی اس کو اور بچوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ بھاوجوں کا بھی رویہ روکھا پھیکا تھا اور بھائیوں کو کاروباری جھمیلوں سے فرصت نہیں تھی۔

اب وہ حالات کے رخ کو سمجھنے لگی تھی یہ گھر اس کا نہیں تھا۔ ہر چیز کو استعمال کرنے...... اور کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے اسے سوچنا پڑتا تھا۔ روپے پیسے کی فراوانی تھی مگر خون سفید اور ہاتھ تنگ تھے، اے سی ہوتے ہوئے بھی چلانے کی اجازت نہیں تھی جبکہ لاہور میں اقرا ہر وقت روم کولر چلائے رکھتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا اس کی بھابیوں کے کپڑے اس کے مقابلے میں معمولی تھے۔ فاخر ہمیشہ گرمیوں میں اس کے لیے گل احمد، الکرم اور فائیو اسٹار کلاسک کے جوڑے ضرور لاتا تھا...... آتے جاتے وہ بریزے سے کپڑے خرید لیتی تھی اس دن تو وہ حیران رہ گئی جب بھابی نے کپڑے بنانے کے لیے ضرغام بھائی سے پیسے مانگے تو انہوں نے تین ہزار پکڑا دیے۔

''چار جوڑے بنالینا۔''

''کیسے چار جوڑے بنالوں' ہزار بارہ سو سے کم تو معمولی لان بھی نہیں پھر سلائی الگ۔'' بھابی نے احتجاج کیا۔

''ہاں تو کس نے کہا ہے کہ مہنگے کپڑے بناؤ، سستے خرید لو......'' وہ بے پروائی سے بولے۔

''ضرغام بھائی آپ خود تو برانڈڈ کپڑے پہنتے ہیں، کھادی، جنید جمشید، امیر عدنان اور جانے کون کون سے مشہور بوتیک کے۔'' اقرا سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بول پڑی۔

''ہاں تو کیا ہوا، ہم باہر نکلتے ہیں دس لوگوں سے ملتے ہیں' خود کماتے ہیں اچھے اچھے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ہماری تو مجبوری ہے، خواتین کون سا نوکریاں کرتی ہیں اس قدر فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے۔''

''اور آپ کی یہ بہن ایک سے ایک قیمتی کپڑے پہنتی ہے، کیا نوکری کرتی ہے۔'' بھابی نے جل کر اقرا کی طرف اشارہ کیا جس نے گل احمد کا ایک بہت ہی نفیس اور خوب صورت سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

''بھئی اس کا میاں افورڈ کرسکتا ہے میں نہیں......'' ضرغام بھائی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اقرا حیران رہ گئی فاخر بے چارہ کہاں اس قابل تھا اس کے پاس چند ہی جوڑے تھے دو تین پتلون اور مختلف کلرز کی چند شرٹیں اس کی محدود تنخواہ جبکہ بھائیوں کا بزنس اور اس کے باوجود فاخر اقرا کی ہر فرمائش جیسے تیسے پوری کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آج اسے فاخر کی قدر ہو رہی تھی اور دل میں شرمندگی بھی۔ فاخر کا دل کس قدر کشادہ اور وسیع تھا۔ چاروں بھائیوں کی اولادیں سارا دن آپس میں گتھم گتھا رہتیں' سکون نام کی کوئی شے اس گھر میں نہیں تھی۔ تین بھائیوں کے تین تین اور بڑے بھائی کے چار بچے تھے اس طرح اقرا کے چار بچے ملا کر سترہ بچے سارا دن گھر کو سر پر اٹھائے رکھتے پھر اسکولوں کی بھی چھٹیاں تھیں۔ اقرا کو اپنے بچوں پر بڑا پیار آتا جو بھائیوں کے بچوں کے مقابلے میں تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھے اور اس سلیقے اور تمیز میں بڑا ہاتھ فاخر کی طبیعت کا تھا۔ ہر طرح کے حالات میں اس کا رویہ نرم' مشفقانہ اور دلآویز ہوتا، وہ اپنے بچوں کا بہترین دوست تھا کبھی کبھی تو اس کے صبر و تحمل پر اقرا کو حیرت ہونے کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی ہونے لگتی تھی۔

''یہ کس مٹی کا مادھو ہے جس پر گرم و سرد کا اثر ہی نہیں ہوتا۔'' مارے باندھے اماں کے کہنے پر ایک دو مرتبہ بھائی اس کو گھمانے لے گئے سینڈز پٹ، سی ویو، الہ دین پارک اور سفاری پارک مگر اقرا کی طبیعت بجھی بجھی رہی۔ اس کا غصہ، چونچال اور جھنجلاہٹ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ وہ سہمی سہمی اور ڈری ڈری رہنے لگی تھی۔ وہ حیران تھی اپنے بھائیوں اور بھابی کے رویے پر وہ جب بھی آتی تھی تو پہلے اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کا نخرہ عروج پر ہوتا تھا اور وہ سب اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے' بچے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ چاروں بچوں کی پیدائش اس کے میکے میں ہی ہوئی تھی۔ ان میں سال سال بھر کا فرق تھا

لیکن سوا مہینے کے دوران اقرا کو کبھی زمین پر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ صرف پیدا کرنے کی ذمے دار تھی، بچے کون سنبھال رہا ہے کون پال رہا ہے، کون کھلا رہا ہے، کون سلا رہا ہے...... اقرا اس سے بے بہرہ تھی اکثر رات کو کوئی بچہ نیند میں کلبلاتا تو اماں اس کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے دوسرے کمرے میں لے جاتیں اور وہ سوتی تو دوپہر بارہ بجے کی خبر لاتی تب کوئی نہ کوئی بھابی پیار سے کہتیں۔

''لو بھئی اقرا اب اپنے بچوں کی فکر کرو، ہماری ذمے داری ختم۔'' ایک دن تو اس کا یہ نخرہ دیکھ کر اس کی بے تکلف دوست نے کہہ بھی دیا۔

''بری بات ہے اقرا، تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے، لگتا ہے تم مہارانی ہو اور وہ تمہاری باندیاں...... چھوٹی ہو کر بھی یوں ان پر حکم چلاتی ہو، رعب ڈالتی ہو جیسے یہ ان کا نہیں تمہارا گھر ہے۔''

''ہاں تو ان کا کہاں سے آیا، میرے باپ کا گھر ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔''اور دیکھو میں اکلوتی بہن ہوں ان کی۔''

''کیوں، کیا اکلوتی بہن کے سر پر سینگ نکل آتے ہیں جو وہ ہر کس وناکس کو مارتی رہتی ہے۔'' تو بیہ جل کر بولی۔

اور آج اسی اقرا کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ ابا بستر کے ہو کر رہ گئے تھے اور اماں اپنے گھٹنوں سے مجبور تھیں، ان کو تو چلنا پھرنا بھی مشکل لگتا تھا۔

''اماں آخر ابا نے سارا کاروبار بھائیوں کے حوالے کر کے خود کو پیسے پیسے کا محتاج کیوں کر لیا اور بھائیوں کو کیا ہوا پہلے تو ایسے نہیں تھے۔'' اقرا نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''بس بٹیا......'' اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''تمہارے ابا بیمار ہوئے تو خود بخود سارے اختیارات بیٹوں کے ہاتھ میں آ گئے ویسے بھی وہ کاروبار سنبھالنے کے قابل بھی کہاں رہے تھے، حالات تو اب بھی برے نہیں ہیں۔ تمہارے بھائی اب بھی بہت خیال رکھتے ہیں لیکن جانو بوند بوند گرے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ بہوؤں نے سکھا پڑھا کر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ ہم ان سے بگاڑ کر کہاں جائیں گے۔ عزت کرتے ہیں ہمارے لیے یہی بہت ہے۔''

''اماں میں بھائیوں سے بات کروں؟'' اقرا نے پوچھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اور دل برے ہوں گے، تم اپنے گھر کی فکر کرو اور ہیرے جیسے شوہر کی قدر کرو ورنہ... نہ گھر کی رہو گی نہ گھاٹ کی۔ بچے الگ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح محسوس کر رہے ہیں، ہم تو خود بڑھاپے کی وجہ سے دوسروں کے محتاج ہیں تمہیں کیا آفت پڑی ہے جو بنے بنائے گھر کو اجاڑنے پر تلی ہو...... اپنا گھر پھر اپنا ہوتا ہے چاہے مٹی گارے کا بنا ہو۔ میں نے تو دس جماعتیں پڑھی ہیں مگر بقول تمہارے تم چودہ جماعت پاس ہو عاقل ہو، بالغ ہو خود کو عقلِ کل سمجھتی ہو سو سوچو دوسروں کے دست نگر رہ کر گزارہ کرنا اچھا ہے یا اپنی سلطنت کی بلا شرکت غیر ملکہ بن کر رہنا اچھا ہے۔''

''یاد رکھنا!'' انہوں نے تنبیہ کی۔ ''عورت کے قدم ایک مرتبہ گھر سے باہر نکل جائیں تو واپسی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں...... جانے تم کوئی در کھلا چھوڑ بھی آئی ہو کہ نہیں۔'' اقرا کو اماں کے دکھائے ہوئے آئینے میں اپنی شکل بڑی مکروہ نظر آ رہی تھی جس خوب صورتی اور حسن پر اسے ناز تھا وہ میکے میں آ کر رُل گئی تھی۔ کوئی پرسانِ حال نہیں تھا بچوں نے الگ واپسی کی رٹ لگا رکھی تھی اور اس دن بلا ارادہ بھائی جان اور بھابی کی باتیں سن کر اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔

''دیکھ لیا نا اپنی بہن کو، نیک اور شریف شوہر چھوڑ آئی۔ ساری عمر پچھتائے گی کون برداشت کرے گا اس کی عادتوں کو... یہ تو فاخر کا ہی حوصلہ اور ضبط ہے کوئی اور ہوتا تو اب تک تین لفظ پکڑا چکا ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں اپنے پالنے مشکل ہیں غیر کے کیوں پالیں...... فاخر کو دے دیجیے گا بچے اور اقرا کی ہم دوسری شادی کر دیں گے۔''

اقرا کے قدم لڑکھڑا گئے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا...... مگر اس میں قصور کس کا تھا وہ دوش کس کو دیتی۔ ماں، باپ اور بھائیوں کو جنہوں نے عادتیں بگاڑنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس کو ''نہ'' سننے کی عادت ہی نہیں ڈالی اس کی ہر خواہش اور ہر ضد آنکھ بند کر کے پوری کی یا وہ پھر خود تھی۔ عاقبت نا اندیش، تھڑدلی اور بڑبولی، غرور اور تکبر کے عفریت میں جکڑی ہوئی۔ وہ نادم تھی، شرمندہ تھی، پشیمان تھی خود سے اپنے شوہر سے اور بچوں سے جن کو اس نے کبھی اپنا نہیں سمجھا اور ان کے خلوص و محبت کو دولت کے ترازو میں تولتی رہی۔ ''بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان۔'' اس کو فیصلہ کرنے میں لمحہ نہیں لگا۔

''اماں میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔'' اس نے صبح اٹھتے ہی اعلان کر دیا ناشتے کے لیے، سب ہی میز پر جمع تھے۔

''اے کیا باؤلی ہوئی ہو، پندرہ دن تو آئے ہوئے ہیں کچھ دن اور رہ لو۔'' اماں نے فوراً کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی، ابھی تو ہم نے گھومنے پھرنے کے بہت سے پروگرام بنانے تھے۔'' احتشام چونک کر بولا۔

''کوئی بات نہیں وہ پروگرام آپ میرے جانے کے بعد پورے کر لینا۔''

''لیکن یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سوجی......؟'' چھوٹی بھابی حیرت سے بولیں۔

''نہیں خیر اچانک تو نہیں سوجھی، بس خیال آ گیا کہ بقر عید قریب ہے اور فاخر ہر سال بچوں کی فرمائش پر بکرے کی ہی قربانی کرتے ہیں فرض کے ساتھ بچوں کی خوشی بھی پوری ہو جاتی ہے۔''

''بھائی صاحب آپ ہمیں جلد از جلد ٹرین کی بکنگ کرا دیں۔'' اس نے شرمندگی سے کہا کیونکہ جہاز کے لیے اس کے پاس ٹکٹوں کے پیسے نہیں بچے تھے۔

''پاگل ہوئی ہو ٹرین سے جاؤ گی، بارہ بارہ گھنٹے لیٹ ہو رہی ہیں اور پھر فاخر کیا سوچے گا۔ اس بے چارے نے تو تمہیں ہوائی جہاز سے ہی بھیجا تھا۔''

''اصل میں بھائی صاحب میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' شرمندگی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چاروں بھائی بے چین ہو گئے، اماں بے ساختہ اضطرابی کیفیت میں اٹھ کر کمرے سے چلی گئیں۔ چاروں نے بڑھ کر اقرا کو گلے سے لگا لیا۔

''پاگل پنے کی باتیں مت کرو، ہم کیا تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔'' بھاوجیں بھی چاپلوسی کرنے لگیں۔

''ہونہہ، سب سمجھتی ہوں معلوم ہو گیا نا کہ میں واپس جا رہی ہوں اس لیے دکھاوا کر رہی ہیں ورنہ دل میں تو خوش ہو رہی ہوں گی۔ اچھا ہے مجھے آئینے میں سب کی اصلی شکلیں نظر آ گئیں۔'' اس نے اب تک ایک مرتبہ بھی فاخر سے رابطہ نہیں کیا تھا البتہ بچوں سے موبائل پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نمبر ملایا تو فاخر نے فوراً ہی اٹھا لیا۔

''کیسی ہو میری جان! کب آ رہی ہو؟ میں بہت اداس ہوں......'' نہ شکوہ نہ گلہ نہ طنز نہ طعنہ اقرا کا دل بھر آیا پہلی مرتبہ اس نے دل سے کہا۔

''فاخر میں اور بچے آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں بالکل دل نہیں لگ رہا، ہم کل شام کی فلائٹ سے آ رہے ہیں PK.702 آٹھ بجے رات پہنچ جائے گی۔''

''سچ...... میرا تو دل سن کر ہی بلیوں اچھل رہا ہے تمہارے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا......'' پھر کافی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ پیار سے بولا۔

"ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے میری ترقی ہوگئی ہے، منیجر بن گیا ہوں گاڑی بھی ملی ہے اور گیس پٹرول فری......" اس کی آواز سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی اقرا ندامت اور شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

☆☆☆

"اقرا گھر پہنچ گئی ہوگی نا......؟" ابا کی بے تابی حد سے سوا تھی وہ پیرالائز تھے اور زبان میں لکنت بھی تھی مگر مصلحتاً اقرا کے سامنے گونگے بنے ہوئے تھے۔

"ابا آپ کیوں اتنے بے چین ہو رہے ہیں، میں نے فاخر کو فون کر دیا تھا وہ ائرپورٹ لینے پہنچ گیا ہوگا گھر پہنچتے ہی وہ اطلاع دے گا۔" چاروں بیٹے بہوئیں سب ابا کے کمرے میں جمع تھے بہویں اماں کو گھیرے بیٹھی تھیں اور چاروں بیٹے ابا کے پاؤں دبا رہے تھے اماں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔

"میری بچی خوشی خوشی آئی تھی بڑے مان، فخر اور غرور کے ساتھ...... تم باپ بیٹوں نے مل کر سب خاک میں ملا دیا۔" بڑے بھیا نے اشارہ کیا چاروں بہوؤں نے انہیں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا پھر بولیں۔

"سچ پوچھیں تو اماں جبراً... یہ ایکٹنگ کرتے کرتے ہم تھک بھی گئے تھے اور ندامت، شرمندگی علیحدہ...... ہمیں کیا ہماری اکلوتی نند بھاری تھی مگر کیا کریں آپ کے چاروں بیٹوں کی یہی رضا تھی۔"

"اماں آپ ہی تو کہتی تھیں اقرا کو بگاڑنے میں ہم چاروں بھائیوں کا زیادہ ہاتھ ہے کہ سب سے زیادہ ابا اور ہم نے ہی اس کے لاڈ نخرے اٹھائے تھے اب اس بگاڑ کو سدھارنا بھی تو ہمارا فرض تھا۔" احتشام نے پیار سے ان کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اماں آپ جانتی ہیں فاخر کو میں بچپن سے جانتا ہوں، نوکری کی وجہ سے وہ لاہور شفٹ ہوا لیکن میری دوستی برقرار رہی، وہ بے شک دولت میں ہمارا ہم پلہ نہ تھا مگر اقرا جیسی خودسر اور خود پسند لڑکی کے لیے اس سے بہتر شوہر کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

"اماں......! زخم پک جائے تو مواد نکالنے کے لیے چیرا لگانا ہی پڑتا ہے جونہی اقرا لاہور سے نکلی فاخر نے مجھے تفصیل سے بتا دیا تھا اور جب ہی ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم نے اسے ذرا سا ٹیلر دکھایا تھا تاکہ اپنی زندگی کے بارے میں انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے وہ سوچ لے اور اپنے شوہر کی قدر کرے، اس کی عزت اور عظمت کو پہچانے۔ اس کو اس کا وہ مقام دے جس کا وہ حقدار ہے۔ ہمیں یقین ہے اسے عقل آ گئی ہوگی ورنہ ہم بھائی بھی روزانہ اس سے چھپ چھپ کر اس کے لیے آنسو بہاتے تھے۔"

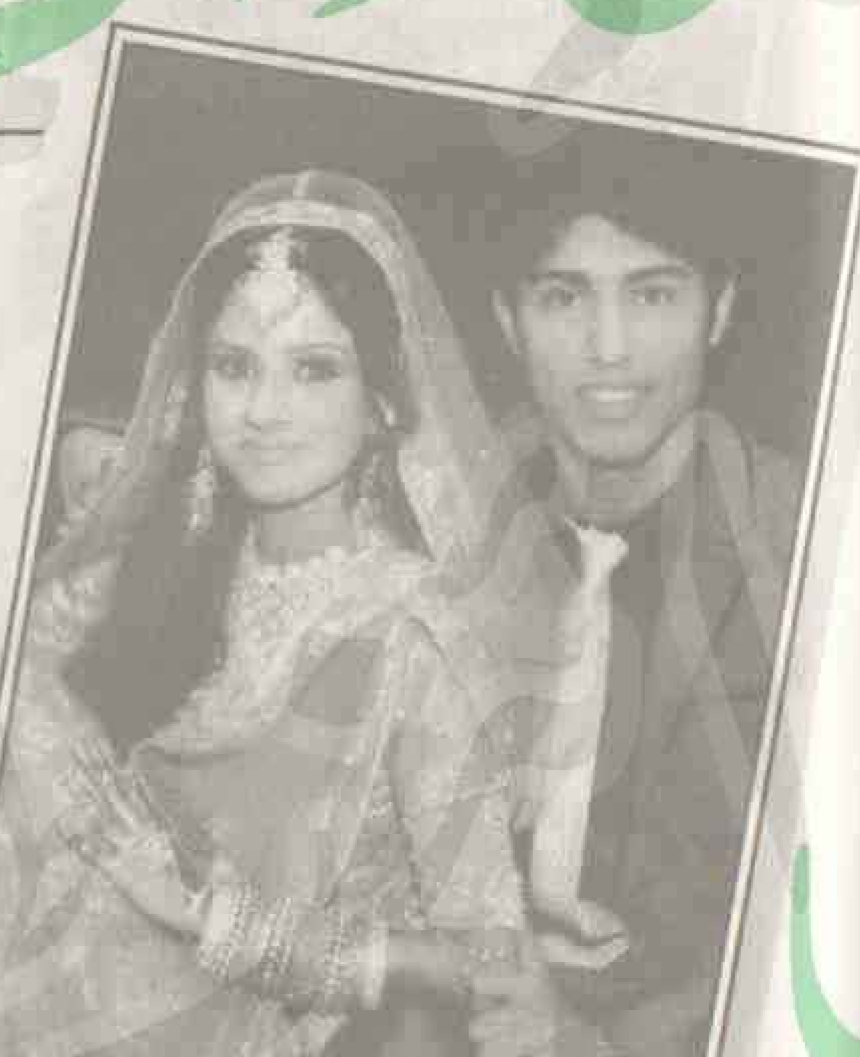
"اپنی بیٹی کو دکھی دیکھ کر میرا دل بھی چاہتا تھا تسلی کے دو بول ہی بول دوں، ہاتھ پاؤں سے معذور ہوا تھا مگر زبان تو بند نہیں تھی مگر میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بکھر جائے گی...... ٹوٹ جائے گی اور میرے ارادے کمزور پڑ جائیں گے۔ میں اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا...... تم لوگوں کے رویے نے اسے احساس دلایا کہ اس کا اصل گھر وہ ہے یہ نہیں۔ اس کی ہر جا اور بے جا خواہش پر سر جھکانے والا، تاعمر اس کا ساتھ نبھانے والا اس کا شوہر ہے۔ یہاں آ کر اسے مایوسی ضرور ہوئی...... اس کا فخر، اس کا مان اور اس کا ایقان ٹوٹا...... مگر اس کے قدم اب اس زمین پر سختی سے جمے رہیں گے جو اس کی اپنی ہے۔" ابا کی آواز بھرا گئی۔

"اور اماں ابا آپ خوش ہو جائیں فاخر کا پرموشن ہو گیا ہے گاڑی تو اسے مل گئی ہے اور ہم ڈیفنس کا دس مرلے والا گھر بھی اسے دے رہے ہیں، فرنشڈ کرا کے آخر اس کا شرعی حق ہے اس پر فاخر کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔" چاروں اماں ابا کو تسلیاں دینے لگے۔



شادی عمیر اور ثمینہ کی

سعدیہ سلیم



پیاری بہنو! آج آپ کو ایسی شادی میں شرکت کے لیے آسٹریلیا کے شہر سڈنی لے جانا چاہتی ہوں...... جہاں جا کر آپ یقیناً انجوائے کریں گی۔

سڈنی میں ہونے والی یہ ایک یادگار شادی تھی...... جس میں شریک ہونے والوں نے اپنی جاب سے چھٹیاں کر کے خوب انجوائے کیا اور اس شادی میں کئی ملکوں اور مختلف علاقوں کی رسومات ہوئیں۔

اور ابھی تک اس شادی کو لوگ یاد کر رہے ہیں مگر پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں پاکیزہ کی قاری اور انجم انصار کی فین تو شروع سے ہی تھی یعنی اپنے زمانہ طالب علمی سے...... مگر میری شادی انجم انصار کے سب سے چھوٹے بھائی...... سلیم انصار سے ہوئی جو آسٹریلیا میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد میں بھی آسٹریلیا آ گئی مگر آپ کی باجی انجم انصار...... میری ایسی نند ہیں جو مجھے صرف اپنی چھوٹی بہن ہی نہیں بلکہ ایک بیٹی کی طرح پیار کرتی ہیں۔ گو کہ ان کا رشتہ اور سبھاؤ...... اپنی ہر بھاوج کے ساتھ بے حد محبت بھرا ہے مگر میں ان کی لاڈلی بھاوج ہوں ہاں تو میں ذکر کر رہی تھی اس شادی کا جس کا ہر مہمان خود کو میزبان تصور کر رہا تھا۔

یہ شادی آپ کی باجی انجم انصار کے چھوٹے

بیٹے عمیر صدیقی کی شادی تھی...... جو پاکستان میں ہونا
تھی...... مگر کراچی کے حالات کے باعث ملتوی ہوئی
پھر انجم باجی اور عبدالرب بھائی کو آسٹریلیا آنا تھا......
مگر وہ بھی سڈنی نہیں آسکے...... تو انجم باجی نے یہی
کہا کہ شادی میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ بچے شادی
کے بعد پاکستان آجائیں گے۔ یہ پسند کی شادی تھی
کہ ثمینہ نے عمیر کو پسند کیا اور عمیر نے ثمینہ کو...... مگر یہ
شادی باقاعدہ بزرگوں کی مرضی سے ہوئی۔ ثمینہ......
آسٹریلیا میں پیدا ہوئی وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے
ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہی ہے مگر آسٹریلیا کی
نیشنل ہونے کے باوجود نہ صرف کھانا پکانا جانتی ہے
بلکہ سلائی اور کڑھائی کی بھی ماہر ہے...... اس کے
ساتھ ساتھ وہ ایک اچھی ہاؤس ڈیکوریٹر بھی ہے۔
اپنے گھر کا چپا چپا اس نے انتہائی خوب صورتی اور
مہارت سے سجایا اور سنوارا ہوا ہے۔

ثمینہ کے والد شجاع صاحب کراچی
یونیورسٹی کے سابقہ طالبِ علم رہے ہیں، وہاں
سے انہیں اسکالرشپ ملا تھا...... تو وہ آسٹریلیا پی
ایچ ڈی کرنے آئے تھے۔ پی ایچ ڈی کرنے
کے بعد انہوں نے نیشنلٹی حاصل کی اور یہیں
درس و تدریس میں مصروف ہونے کے ساتھ
درسی نوعیت کی انگریزی میں کئی کتب لکھیں۔
جو امریکا کے کئی کالجز میں شاملِ نصاب بھی
ہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح کی فیملی انجم انصار کی ہے
کہ تعلیم یافتہ ماحول ہے اسی طرح کا انہیں سمدھیانہ بھی
ملا۔ یہ خیر قطعی دوسری بات ہے کہ ثمینہ اپنی ساس کی
کوئی کتاب بھی نہیں پڑھ سکے گی...... کہ وہ اردو بولنا تو
ضرور جانتی ہے مگر اردو پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتی......
اور یہ حالت یہاں کے تمام پیدا ہونے والے ایشیائی
لڑکے لڑکیوں کی ہے کہ وہ صرف انگریزی کی پڑھ اور لکھ
سکتے ہیں۔

میں چونکہ عمیر کی ممانی ہوں...... اس لیے شادی
کی رسومات میں، میں نے ساس کا رول ادا کیا
سلیم...... نے سسر کا اور میری بیٹی رابعہ...... نند بن
گئی...... اور ضیا تو تھے ہی اصلی جیٹھ۔
شادی ہوٹل میں ہونا تھی...... مگر شادی سے پہلے
ہم نے اپنی اپنی جاب سے چھٹی کر کے گھر پر پہلے
رت جگے کا اہتمام کیا۔
اس شام سے ہی نجمہ آنٹی اور عارفہ بھابی کے
ساتھ بیٹھ کر ہم نے نکاح



میں بانٹی جانے والی تھیلیوں میں میوہ رکھا۔ یہ میرون
شنیل کی بجی سجائی تھیلیاں انجم باجی نے کراچی سے
بھجوائی تھیں۔ ثمینہ کی نند یعنی رابعہ نے عارفہ بھابی
کے بچوں کے ساتھ گھر کی سجاوٹ کی۔ مہندی کے
کمرے کی خوب صورت ربن اور غباروں سے سجاوٹ
کی، فاطمہ آنٹی نے ڈھول کی تھاپ کے ساتھ گھر
میں انٹری دی۔ اتنی لمحے عارفہ بھابی بھی آگئیں

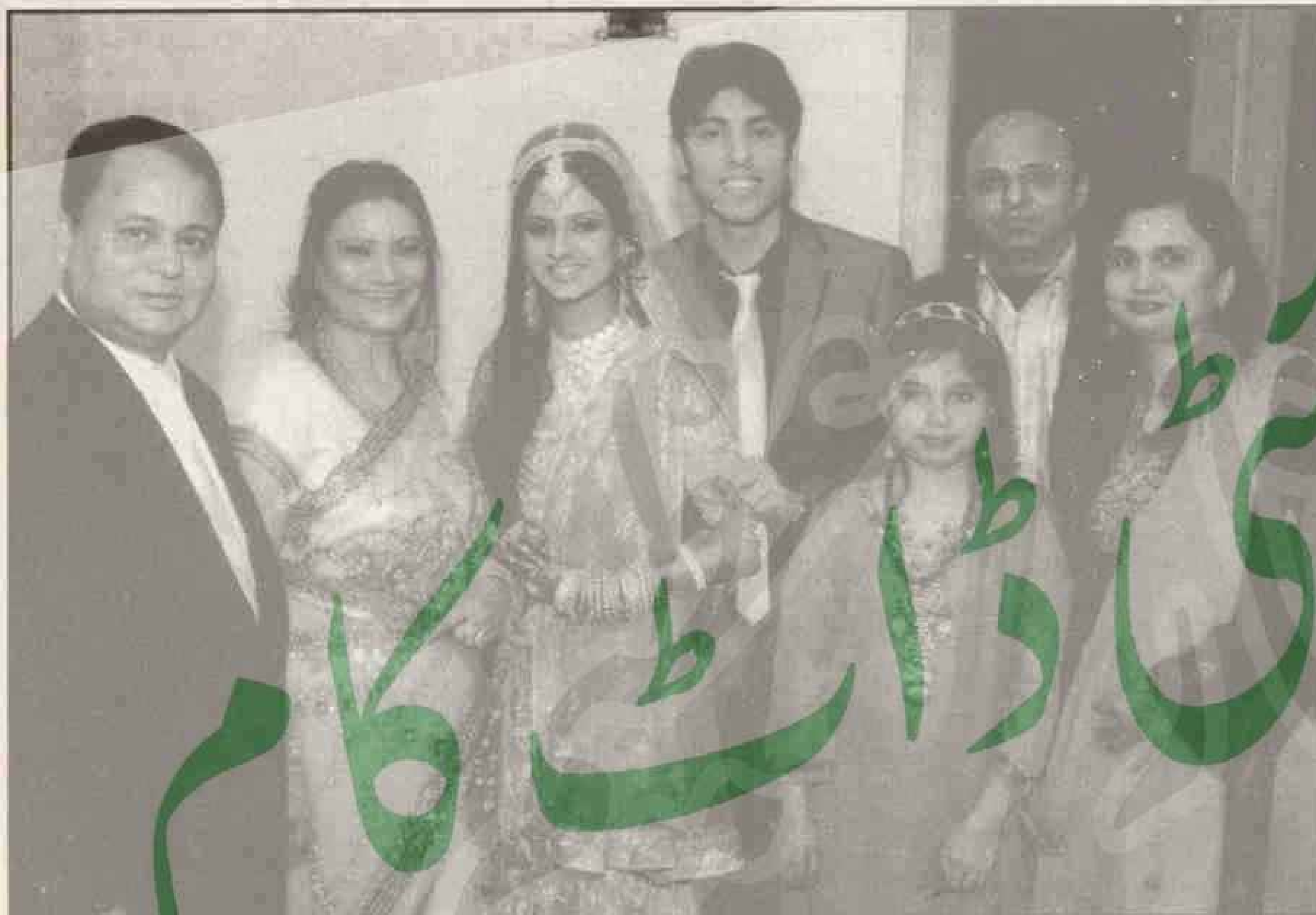
وہ سب کے لیے گرما گرم پکوڑے اور رول بنا کر لائی
تھیں...... مہمان خواتین کی آمد جاری تھی...... مہندی
کے تھال سجاتے ہوئے، نجمہ آنٹی نے میرے بنے کی
بات ہے نرالی گا کر خوب داد حاصل کی۔
عمیر میرا بھانجا ضرور ہے مگر مجھے ہمیشہ اپنے
چھوٹے بھائی کی طرح لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس
وقت میرے احساسات بالکل ایسے ہی ہو رہے تھے
کہ جیسے کسی بھی بہن کے ہوا کرتے ہیں۔
انجم باجی کے نہ پہنچنے کا دکھ...... بار بار میری
آنکھوں میں آنسو لا رہا تھا اور میری یہ خواہش تھی کوئی
کمی نہ رہ جائے...... اس وقت کمرے میں صرف
خواتین کا ہی راج تھا۔ میں نے کمپیوٹر کے توسط سے
انجم باجی سے رابطہ کیا...... اب وہ اپنے کمرے میں
بیٹھی ہم سب کو نہ صرف دیکھ رہی تھیں بلکہ سب سے
باتیں بھی کر رہی تھیں۔ فاطمہ آنٹی...... جن کا پورا نام
شاہ تاج فاطمہ ہے جو اپنی طبیعت خرابی کے
باوجود...... نہ صرف اس تقریب میں پیش پیش تھیں
بلکہ عمیر اور ضیا کے ساتھ شاپنگ پر بھی گئی تھیں وہ بھی
عمیر سے بہت محبت کرتی ہیں...... حیدر آباد دکن انڈیا
سے تعلق رکھنے والی فاطمہ آنٹی نے کمالِ محبت سے
ڈانس کرنا شروع کیا...... ان کو دیکھ کر مجھے بھی جوش
چڑھا...... تو میں نے اور عارفہ بھابی نے خوب
زبردست بھنگڑا ڈالا۔ ایسے میں ثمینہ کی نند کس طرح
پیچھے رہتی...... رابعہ نے مہندی لگا کے رکھنا...... پر خوب
ہاتھ پیر مارے اور میری چھوٹی سی بیٹی کا یہ ڈانس سب
نے بے حد پسند کیا کہ یہ عمیر اور ضیا کی بہت لاڈلی سی
بہن ہے۔ رات گئے تک خوب ڈھول پر گیت گائے
گئے...... کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلتا
رہا۔ اگلا دن مہندی کا تھا...... صبح سے ہی ہمارے
میاں جی سلیم کے ساتھ ضیا اور عمیر مرغیوں کو مسالا
لگا رہے تھے کہ باربی کیو کا بھی اہتمام تھا۔

لان کی گھاس کاٹنے میں اسد بھائی کا ہاتھ بھی
کٹ گیا تھا مگر وسیع و عریض لان نہ صرف چم چم چمک
رہا تھا بلکہ اسے خوب ڈیکوریٹ بھی کیا گیا تھا۔ کہیں
ڈیک بج رہا تھا، کہیں کپڑوں پر استری غرض پورا دن
ہنستے مسکراتے گزرا...... اور ایسی خوشی ہر طرف چھائی
ہوئی تھی کہ جس کی تصویر لفظوں میں نہیں کھینچی جاسکتی۔
فاطمہ اور نجمہ آنٹی نے ایک تھال کو پان، چھالیا،
صندل، مصری، چندن اور ابٹن سے بڑی مہارت کے
ساتھ سجایا تھا۔ مٹھائی کے تھال علیحدہ سجے ہوئے تھے
اور مہندی کے علیحدہ اور ایسی سجاوٹ میں نے تو اس
سے قبل کہیں نہیں دیکھی تھی...... مغرب کے بعد مہندی
کے اس گھر کی رونق مزید بڑھ گئی۔ رابعہ نے چھوٹے
چھوٹے مٹی کے دیے...... نہ صرف باہر کی جانب بلکہ
جگہ جگہ خوب صورتی سے سجائے تھے اور جلتے ہوئے
دیے بے حد خوب صورت لگ رہے تھے اور پھر شور اٹھا
کہ دلہن آگئی ہے تو رابعہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر
بھاگی...... کہیں پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں تو کوئی
بجھنے والے دیوں کو دوبارہ جلا رہا تھا۔ سب خواتین شمع
جلتی ہوئی قندیلوں کے پاس استقبال کو کھڑی
ہوگئیں...... پیلے لباس میں ملبوس نازک اندام ثمینہ
ہولے ہولے چلتی نظر آئی...... آج کا یہ جوڑا
جیولری، سینڈل، پرس، چوڑیاں انجم انصار نے کراچی
سے بھجوائی تھیں۔ میرے ساتھ بشریٰ، عارفہ بھابی،
نجمہ آنٹی اور فاطمہ آنٹی لال دوپٹے لے کر کھڑی
ہوگئیں...... اس کے نیچے سے دولہا عمیر...... دلہن ثمینہ
گزرتی ہوئی آئی۔ رابعہ اس استقبالیہ میں سب سے
آگے دیے کے تھال لے کر کھڑی تھی اور عارفہ بھابی
اور ان کے بچے پھلجڑیاں چھوڑ رہے تھے۔ مرد
حضرات کے بیٹھنے کا انتظام علیحدہ ہال میں کیا گیا تھا۔

پہلے مہمانوں کو پُر تکلف کھانا کھلایا گیا۔۔ باربی کیو
..... کے علاوہ بریانی، نہاری، ہری مرچوں کا سالن،
سموسے، پکوڑے مختلف قسم کی چاٹ، رول، سلاد
میٹھے میں رس ملائی، کسٹرڈ، فالودہ، آئس کریم ..... یہ
تمام کھانا گھر میں بنایا گیا تھا۔ باربی کیو کی ذمے داری
مرد حضرات پر تھی سلیم کے ساتھ ان کے دوست شامل
تھے۔ ساجد، اسد، غفار، فیروز، رضوان اور زبیر بھائی
کا شمار بھی میزبانوں میں ہی تھا۔ نجمہ آنٹی کی پیاری سی
بیٹی ڈاکٹر سمیعہ شیخ بھی اس تقریب میں پوری طرح
ان تھیں...... مہندی کی تقریب میں ایک جانب کھانا
کھایا جا رہا تھا تو دوسری جانب ڈھول بج رہا تھا اور
تیسری جانب ضیا اور عمیر کے دوستوں کے بھنگڑے
اور ناچ گانا چل رہا تھا۔ سب ہی ہنستے مسکراتے نظر
آ رہے تھے۔ خواتین کے مہندی کے گیت سب پر
سبقت لے گئے کہ مہندی کی رات آئی کے گیت کی
تان اتنی اونچی رہی کہ سب ہی اس کے ساتھ شامل
ہو گئے۔ عمیر کی ساس یعنی ثمینہ کی امی اور پاپا اتنے
سارے لوگوں کے ساتھ اتنا بہترین انتظام دیکھ کر
بے حد خوش ہو رہے تھے اور کیوں نہ خوش ہوتے کہ ان
کی صرف ایک ہی بیٹی تو ہے...... ہاں ..... ثمینہ کا نہ
کوئی بھائی ہے اور نہ کوئی بہن...... اس لیے والدین
کی لاڈلی بیٹی ہے اور اب اپنی سسرال کی بھی لاڈلی
بہو...... کیونکہ عمیر بھی اپنے گھر کا سب سے چھوٹا اور
لاڈلا بیٹا ہے اور آج تو عمیر ماشاء اللہ شہزادہ سا لگ رہا
تھا۔ ڈارک نیوی بلو کلر کا کُرتہ شلوار جس کے گلے پر بڑا
خوب صورت کام بنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی
ہوئی مسکراہٹ اور سرخی...... اس کی دلی خوشی کا اظہار
کر رہی تھی۔

کھانے کے بعد رسموں کا سلسلہ شروع ہوا جس
میں پاکستان، بنگلہ دیش سے لے کر گجراتی، پنجابی،
حیدر آبادی، دکنی، کلکتہ کی اور بمبئی تک کی رسمیں کی
گئیں...... میں نے تو پاکستان کی رسموں میں دلہن کو
چندن اور صندل لگاتے نہیں دیکھا...... مگر یہاں
خوب دولہا، دلہن کے ابٹن لگایا گیا...... ثابت
چھالیا رکھی گئی کہ دولہا، دلہن ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔
ہاتھ پر پان اور مصری رکھی گئی...... دعائیں پڑھی گئیں
...... بشریٰ بھابی، عشرت، شیریں، عارفہ بھابی، ڈاکٹر
سمیعہ شیخ، نجمہ آنٹی اور ہم سب کی ایڈمنسٹریٹر شاہ تاج
فاطمہ آنٹی ہر رسم اور ہر کام میں پل پل آگے تھیں۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی...... مگر
کسی کا اپنے گھر میں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا......
اکثر لوگوں نے اگلے دن کی چھٹی کی ہوئی تھی...... اب
ثمینہ کی امی نے ڈھول بجانا شروع کر دیا...... اور میں
حیران رہ گئی...... وہ بڑا اچھا ڈھول بجا رہی تھیں تب
مجھ میں پھر جوش بھر گیا اور میں نے گیت گانا شروع
کر دیا۔ کچی کلی توڑ لانا ..... گایا ..... ماشاء اللہ میری
آواز ویسے بھی بہت اچھی ہے، آہم ..... اور پھر
گیتوں کی اٹھان پھر سر اٹھانے لگی اور ہاں ایک خاص
بات بتانا تو بھول ہی گئی...... جب رسم کا آغاز ہوا تو
فاطمہ آنٹی کے ہاتھ سے بنائے ہوئے ہار...... دولہا،
دلہن کے گلے میں ڈالے گئے اور سب نے خوب بھر
بھر مٹھائی کھلائی...... جسے عمیر نے تو خوب کھائی مگر
ثمینہ نے بہ مشکل کھائی...... اور یوں رات گئے مہندی
کی تقریب کا اہتمام ہوا...... مگر ہمارے گھر میں رات
تین بجے تک ڈھول بجتا رہا۔ کسی کو نیند ہی نہیں آ رہی
تھی...... اور پھر شادی کا دن آ گیا۔ صبح سے ہی گھر
میں ایک شادی والا ہنگامہ جاگ رہا تھا۔ ضیا کی شرٹ
کے کف لنکس نہیں مل رہے تھے تو اس نے انجم باجی کو
پاکستان تک فون کر دیا...... امی آپ نے میرے
بریف کیس میں میرے کف لنکس کہاں رکھے تھے



دائیں سے سعدیہ سلیم۔ سلیم انصار۔ رابعہ۔ دولہا عمیر۔ دلہن ثمینہ۔ دلہن کی والدہ مسز شجاع اور شجاع (دلہن کے والد)

اور وہ بے چاری پریشان ہو گئیں...... بہر حال عمیر کام
دار شیروانی، کھسے میں شہزادہ لگ رہا تھا۔ ضیا نے سیاہ
سوٹ پہنا تھا اور بہت پیارا لگ رہا تھا اب سب اس کو
چھیڑ رہے تھے کہ تم بھی کوئی لڑکی پسند کر لو...... تاکہ
تمہاری شادی بھی جلدی سے ہو جائے...... اور ضیا
مسکرا کر کہہ رہا تھا کہ میرے لیے میری امی میری آپی
(عظمیٰ آفاق) اور میری سعدیہ مامی خود کوئی لڑکی
دیکھیں گی میرے قانون کچھ الگ ہیں۔

ضیا اتراؤ نہیں...... جب تمہاری شادی کا وقت
آئے گا تو سارے قانون دھرے کے دھرے رہ
جائیں گے...... میں نے اسے چھیڑا...... تو وہ مسکرا کر
بولا...... ظاہر ہے ایسے میں تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ سب
ملنے والے احباب جو عزیزوں کی طرح ہیں...... وہ
برات میں شرکت کے لیے آ چکے تھے سڑک پر گاڑیوں
کی قطار لگی تھی۔ برات جانے سے پہلے دولہا کے
ماموں سلیم اور بھائی ضیا نے بھنگڑا ڈالا...... میں نے
جانے سے پہلے راستہ روکا...... تو دولہا کے ماموں نے
50 ڈالر نکال کر مجھے دیے کہ ہٹ جاؤ ہمارے بھانجے
کے راستے سے اور پھر دعاؤں کے سنگ برات روانہ
ہوئی اور جب ہم مقررہ ہوٹل پہنچے تو دلہن کی سہیلیوں
نے برات۔ کے دولہا کا راستہ روکا اور کہا...... پانچ ہزار
ڈالر دو...... اور اندر جاؤ میں نے ہنس کر کہا...... پانچ
ہزار ڈالر کے بجائے پاکستانی پانچ ہزار لے لو لڑکا
پاکستانی ہے...... مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں...... ضیا
نے چند سو ڈالر ایک لفافے میں ڈال کر کہا...... چلیے
لے لیجیے...... اور راستہ دیجیے...... لڑکیاں لفافہ لے کر
ہوا ہو گئیں...... ہم ہوٹل کے ہال میں داخل ہوئے تو وہ
بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا...... میں ایک بات

کی وضاحت کردوں یہاں ہوٹل اگر سجایا جاتا ہے تو از خود سجانا پڑتا ہے...... ہوٹل والے سجا کر نہیں دیا کرتے ہیں۔ دولھا والوں کا پُر جوش استقبال ہوا اور میرے ذہن میں تا حال وہ منظر تازہ تھا کہ برات کو روانہ ہوتے دیکھ کر انگریز لوگ بڑی حیرت سے اپنی کھڑکیاں کھول کھول کر دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ کیسے ناچتے گاتے جا رہے ہیں اور ان کی اس حیرت کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی کہ ہمارے ہاں برات اپنی روایتی انداز میں جایا کرتی ہے...... دولھا کے صدقے اتارے جاتے ہیں اور نظر اتاری جاتی ہے اور آج تو ایک پیارا سا دولھا...... برات کا سپہ سالار تھا۔

اسٹیج پر دلہن پنک لباس میں ملبوس نظر آئی...... مہمانوں کی جوسز اور مٹھائی سے تواضع جاری تھی تب ضیا نے عمیر سے مسکرا کر کہا جس کے دل میں خود لڈو پھوٹ رہے ہوں اس کو لڈو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ماشاﷲ...... عمیر شیروانی، لال صافہ اور کلا لگا کر غضب ڈھا رہا تھا...... ہر کوئی دولھا کی وجاہت کا ذکر کر رہا تھا...... اور یہ حقیقت ہے کہ کم عمر چاہے دلہن ہو یا دولھا دونوں ہی اچھے لگا کرتے ہیں...... اور یہ دونوں ہی ماشاء اللہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ ضیا کے آئی فون سے جس طرح تقریب کو براہِ راست انجم باجی کی فیملی دیکھ رہی تھی، اسلام آباد میں سہیل بھائی کی فیملی دیکھ رہی تھی اور اسلام آباد کے دوسرے گھر میں دولھا کی نانی اور ندیم بھائی کی فیملی یہ کوریج براہِ راست دیکھ رہی تھی۔

قاضی صاحب موجود تھے۔ فوراً ہی نکاح ہوا تو مبارک سلامت کے ساتھ دعائیں...... دی جانے لگیں...... اب سب ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے اور اس وقت مجھے بے حد پیار کرنے والی انجم باجی، ہنستی مسکراتی اور شرارتی سی عظمیٰ آفاق بے حد یاد آ رہی تھیں...... اور ان کی کمی بے حد محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کمی...... ثمینہ کی امی کو بھی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی...... دولھا...... دلہن کے ساتھ ساتھ وہ بھی بار بار پاکستان میں انجم انصار، عبدالرب بھائی عظیم، آرزو اور عظمیٰ سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہم نے کہا...... ثمینہ اب ہماری ہوگئی اور ثمینہ کی امی نے کہا کہ عمیر میرا بیٹا بن گیا۔

نکاح کے فوراً ہی بعد کھانا کھایا گیا...... جو بہت پُرتکلف تھا...... ملائی کوفتہ، بریانی، تکہ، سیخ کباب، مٹن قورمہ، چکن تندوری، پراٹھا، رس ملائی آخر میں چائے اور پان تک تھے۔ اگلے دن سب کو جاب پر جانا تھا مگر میری سلیم اور ضیا کی چھٹی تھی مگر رخصتی جلدی کرائی گئی اور دلہن رخصت ہو کر سسرال یعنی اپنے دولھا کے ماموں کے گھر آئی۔ یہاں سمیعہ اور رابعہ نے دولھا کا راستہ روکا...... اور عمیر سے 50، 50 ڈالر وصول کیے آخر میں، میں نے بھی مٹھائی کھلا کر جب عمیر سے نیگ مانگا تو ان کے سلیم ماموں نے اپنے والٹ سے 50 ڈالر نکال کر مجھے دیے۔

ہم لوگ تو خوب گانے گانا چاہتے تھے مگر ضیا نے کہا ممانی ان لوگوں کو ہوٹل جانے دیں۔ ان لوگوں نے ہوٹل بک کروا رکھا ہے خوامخواہ پیسے ضائع جائیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور عمیر کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

اور پھر ڈھیر سارے لوگ...... دولھا، دلہن کو ان کو ہوٹل چھوڑنے گئے...... جہاں انہیں دو دن رہنا تھا۔

اس کے بعد یہ خوب صورت کپل ہنی مون منانے کے لیے کوئنز لینڈ روانہ ہوگیا...جو آسٹریلیا کا خوب صورت ترین مقام ہے۔

میری دعا ہے اور آپ سب بھی یہ دعا کریں کہ یہ محبت کرنے والا جوڑا ہمیشہ خوش و خرم اپنی زندگی بسر کرے، آمین۔



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو...... السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو...... مہنگائی کا آسیب بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے...... اب گھر کے ایک فرد کے کمانے سے اکثر گھروں کا حساب کتاب چلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو رہا ہے...... اکثر خواتین کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ وہ گھر سے باہر جا کر کچھ کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں رکھتیں...... تو پیاری بہنو بہت سارے کام ایسے ہیں جو آپ اپنے گھر میں بھی بیٹھ کر کر سکتی ہیں...... بچوں کو ٹیوشن پڑھانا، سلائی کرنا...... اگر جیولری بنانے کا شوق ہے تو آپ گھر میں بیٹھ کر بنا کر انہیں بیچ سکتی ہیں...... ہم مغرب کی بہت سی باتوں کی نقالی کرتے ہیں...... مگر ان کی اچھی باتوں کی نقالی نہیں کرتے...... ان کے بچے اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچتے ہی جاب اسٹارٹ کر دیتے ہیں اور انہیں محنت کرتے ہوئے کوئی شرم یا جھجک محسوس نہیں ہوتی...... جب کہ پاکستان میں پچیس سال کے لڑکے بھی اگر پڑھ رہے ہیں تو ان کے سارے خرچے ان کے والدین برداشت کرتے ہیں۔

اپنے ملک میں کوئی بھی کام کرنے میں ذلت اور ہتکی محسوس مت کیجیے...... اور اپنے گھر کو سپورٹ کیجیے...... کہ آگے بڑھنے کے لیے ہم سب کو کام کرنا ہوگا۔ (کیا خیال ہے......؟)

ایک بہن کے خط سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ بچوں کے چپس کے پیکٹس، چاکلیٹس اور بسکٹس کے ڈبوں پر ان کے اجزا پڑھ کر استعمال کرنے کی عادت ڈالیں...... کیونکہ یہاں پر بہت سی چیزیں ایسی مارکیٹس میں عام ہیں جن میں سور کی چربی شامل ہے۔

☆☆☆

آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل درودِ ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں (ابھی پڑھ لیں) آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظالمین

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی شاعرہ، افسانہ نگار اور تبصرہ نگار...... شگفتہ کنول جواں عمری میں چل بسی...... کھنکتی ہوئی آواز کی شگفتہ بے حد ٹیلنٹڈ تھی۔ مجھ سے اکثر فون پر باتیں کرتی تھی...... کون سا کام تھا جو اسے نہیں آتا تھا......

کڑھائی، بُنائی اور کروشیے کے کام کی ماہر تھی۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی اور بالآخر...... اس نے ایک بہت بڑا کام کر ہی لیا...... اس نے ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا پڑھنے کے بعد قرآن پاک لکھا...... اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو شگفتہ نے حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ اس پیاری سی لڑکی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے...... میں اور میرا ادارہ شگفتہ کنول کو کبھی نہیں بھول پائے گا۔

☆ پاکیزہ کی ایک پیاری سی تبصرہ نگار صبا نور، لیہ ان دنوں اپنے امتحان کی تیاری خوب محنت سے کر رہی ہیں...... اور ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ پیاری صبا ہمارے کہنے پر میٹرک کا امتحان دینے کے لیے راضی ہوئی ہیں۔ (دعا آپ لوگوں نے کرنی ہے)

☆ گزشتہ دنوں جناب و بیگم فضل الدین احمد کی پیاری اور اکلوتی بیٹی منیزہ احمد کی رخصتی محمد طالب الرحمان کے ساتھ مقامی لان میں ہوئی، جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور شاعرہ رخسانہ ریاض رخشی' یو اے ای ان دنوں اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ ریڈیو پاکستان کراچی کی معروف پروڈیوسر سیمار ضا ردا کو ان کی اعلیٰ کارکردگی پر ایک ایوارڈ دیا گیا ہے۔

☆ گزشتہ دنوں FM-93 پر معروف شاعرہ شگفتہ شفیق کا انٹرویو نشر ہوا۔ جس کی پروڈیوسر سیمار ضا ردا تھیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عنبرین ندیم کراچی ایک پیارے سے بیٹے کی امی جان بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ہماری نئی مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد تا حال بسترِ علالت پر ہیں، ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ شاعرہ، افسانہ نگار خالدہ نسیم ان دنوں لندن سے پاکستان آئی ہوئی ہیں اور ان دنوں راول پنڈی اور لاہور کی شادیوں میں شرکت کر رہی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ ہماری پیاری مصنفہ نوشین ناز اختر، لاہور ان دنوں ٹی وی کے لیے سوپ لکھ رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی دیرینہ تبصرہ نگار اور شاعرہ عالیہ تصور طاہر، لاہور کا بیٹا ان دنوں علیل ہے اس کی صحتِ کاملہ کے لیے دعا کریں۔

☆ گزشتہ دنوں میرے بیٹے عمیر صدیقی کی شادی ثمینہ شجاع کے ساتھ سڈنی میں ہوئی۔ ان دونوں کے پاکستان آنے پر انشاءاللہ ہماری جانب سے ایک تقریب منعقد ہوگی۔ آپ دعا کیجیے گا کہ میرا بیٹا اور میری بہو ہمیشہ خوش و خرم رہیں، نظرِ بد سے محفوظ رہیں اور ان کی زندگی کا سفر محبت اور کامرانی کے ساتھ بسر ہو۔ (آمین)

☆ پاکیزہ کی قاری سلمیٰ نیاز کا نکاح لندن سے آئے ہوئے ان کے کزن راحیل کے ساتھ کراچی میں ہوا۔ رخصتی انشاءاللہ آئندہ سال ہوگی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سہالہ والی پھر بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے

لیے آپ سب دعا کریں۔

☆ حکومتِ پاکستان نے آئندہ سال سے حج کرنے والی تمام خواتین کے لیے کوٹ' عبایا پہننے کی پابندی عائد کردی ہے۔ واضح رہے اس پابندی کے لیے قیصرہ حیات نے اپنے مضمون میں آواز اٹھائی تھی جو پاکیزہ میں شائع ہوا تھا۔

☆ ہماری مایہ ناز مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ ان دنوں سندھی میں ناول لکھ رہی ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہو گا۔ (ماشاءاللہ)

☆ مصنفہ عذرا آفتاب خان اسی ہفتے اپنے بچوں کے پاس لندن جا رہی ہیں۔

☆ معروف صحافی شائستہ زریں کراچی ان دنوں اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ معروف شاعرہ اور مصنفہ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا ان دنوں اپنا دوسرا مجموعۂ کلام ترتیب دے رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ ہماری دوست امت الصبور...... حج کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (دلی مبارک باد)

☆ جناب پرویز اقبال صدیقی اور نائلہ پرویز کے پیارے سے بیٹے فہد اقبال کی شادی مسٹر اینڈ مسز خواجہ اعجاز احمد کی بیٹی ثنا کے ساتھ پشاور میں ہوئی۔ ولیمے کی تقریب روپ گارڈن کراچی میں ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب میں بہت سے مہمان سعودی عرب اور دبئی سے آئے۔ (بے حد مبارک باد)

☆ بفضلِ خدا ہمارا نیا ناول محبت ہم سفر میری کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ یہ ہماری پندرھویں کتاب ہے۔ اس کا انتساب ڈاکٹر شمیم فاطمہ صدیقی کے نام ہے۔ اس ناول میں ہماری مایۂ ناز شاعرات کے ساتھ ساتھ ہماری نئی شاعرات کی نظمیں ان کے نام کے ساتھ شامل ہیں جو انہوں نے بطورِ خاص کرداروں کے حوالے سے لکھ کر ہمیں بھیجی تھیں۔ اس ضخیم ناول کے صفحات 576 ہیں اور قیمت صرف پانچ سو روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ القریش پبلی کیشنز۔ سرکلر روڈ۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔

☆ ہماری مایۂ ناز مصنفہ صائمہ اکرم چوہدری کا ناول بند مٹھی میں سلگتی ریت شائع ہو گیا ہے۔ صفحات 300 سے زائد ہیں اور قیمت صرف 300 روپے۔ آپ اسے القریش پبلی کیشنز لاہور سے حاصل کر سکتے ہیں۔ (مبارک باد) صائمہ اکرم کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی پوسٹنگ واہ کینٹ میں ایف جی پوسٹ گریجویٹ کالج میں ہوگئی ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ شاعرہ اور ناول نگار غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ کے دو ناول شہرِ دل کے موسم اور سیپ کے سوداگر ان دنوں زیرِ طبع ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری لاہور کا پہلا شعری مجموعہ نظرِ کرم عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ شاعرہ فریدہ خانم لاہور کے حوالے سے یہ نیوز ہمارے پاس آئی ہے کہ ان کی شاعری کے پہلے مجموعے مختلف کو علامہ اقبال کے پوتے محترم ولید اقبال نے بے حد سراہا ہے۔

☆ جناب ملک مقبول احمد کی نئی کتاب شناسائی شائع ہو گئی ہے۔ کتاب در کتاب کا یہ خوب صورت

تجربہ پہلی مرتبہ ہم نے دیکھا ہے اور ایسا لگتا ہے مقبول احمد ایک ایسا درخت ہیں...... جس میں کتابوں کے پھول اگتے ہوں۔ مقبول صاحب نے اپنی آپ بیتی سفر جاری ہے شائع کی تو اس پر ایسے مضامین ہندوستان' پاکستان سے آئے کہ اس کتاب پر مزید دو کتابیں شائع ہو گئیں۔ شناسائی اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے...... اور ابھی اور آئیں گی مزید کتابیں...... کہ یہ کتب اپنے اندر ایک خزانہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ کتاب کی قیمت 450 روپے۔ اس معلوماتی اور دلچسپ کتاب کو منگوانے کا ایڈریس مقبول اکیڈمی۔ سرکلر روڈ۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔

☆ ہماری طنز و مزاح کی نئی کتاب کھری کھری حاصل کرنے کے لیے علامہ عبدالستار عاصم سے آپ اس نمبر پر رابطہ کر سکتی ہیں۔ 0333-4393422۔

☆ ہماری نئی کتاب انمول خزانے اور آزمودہ ٹوٹکے اور وظائف شائع ہو چکی ہے کتاب حاصل کرنے کے لیے آپ اس نمبر پر ہم سے رابطہ کر سکتی ہیں۔ 021-36981952۔

☆ ہماری پیاری سی شاعرہ پروین عذرا تشنہ، کراچی پردادی بن گئی ہیں۔ ماشاء اللہ ان کی بیٹی کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ پروین کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ان کا بیٹا قمر اور بہو طلعت حج کی سعادت حاصل کر کے وطن واپس آ گئے ہیں۔ (مبارک باد)

☆ شاعرہ اور افسانہ نگار نسیم نیازی کے افسانوں کا نیا مجموعہ بہت جلد آنے والا ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ شاعرہ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی کے بیٹے نے نویں جماعت کے امتحان میں اے ون گریڈ حاصل کیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

انتقالِ پُرملال

☆ نامور ادیب اور اسلام آباد میں قائم حلقہ اربابِ ذوق کے پہلے سیکریٹری محمد منشا یاد انتقال کر گئے۔

☆ نامور ادیب اور صحافی (روزنامہ ایکسپریس لاہور سے وابستہ) حمید اختر انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، شاعرہ، مصنفہ، شگفتہ کنول (ڈیرا غازی خاں) انتقال کر گئیں۔

☆ لاہور کے معروف پبلشر محمد علی قریشی کے بہنوئی سعید احمد انتقال کر گئے۔

☆ معروف افسانہ نگار طلعت جبیں نیاز کے والد نذیر حسین' اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

☆ میری ممانی ساس برجیس فاطمہ (مسز شوکت علی) انتقال کر گئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور صرف ایک، ایک بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

* * *

✍ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور سے۔ ''میرے داماد لیفٹیننٹ کرنل منیب حج کی سعادت حاصل کر کے آ گئے ہیں۔ نومبر کا شمارہ مصروفیت کے باوجود پڑھا۔ ساجدہ حبیب کے پاس اگر افسانہ لکھنے کا ٹائم نہیں ہے تو تبصرہ لکھنے کا تو ہوگا۔ عمیرہ احمد کے ناول کی قسط پسند آئی۔ شیریں حیدر نے بھی اچھا لکھا۔ میری مبارک باد عالیہ بخاری کو بھی پہنچا دیں کہ انہوں نے بہت اچھا ناول لکھا۔ جلترنگ اور بہنوں کی محفل کی تعریف کی نہیں جا

سکتی کہ بعض مرتبہ یہ دونوں چیزیں بار بار پڑھتی ہوں۔'' (نوازش)

✍ ثریا انجم، کراچی سے۔ ''اس مرتبہ مجھے جس بات نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر ہے۔ میرے اس خیال سے آپ یقیناً متفق ہوں گی کہ کہانیاں تو سب ایک سی ہی ہوتی ہیں چند ایک کو چھوڑ کر...... اصل کمال لکھنے والے کا ہوتا ہے کہ اس نے کس کہانی کو کس انداز سے تحریر کیا، اس میں آنے والے اتار چڑھاؤ کو کیسے بیان کیا...... یہی بات ایک رائٹر کو دوسرے سے جدا کر کے اس کی الگ پہچان بناتی ہے۔ عالیہ بخاری کا اپنا ایک انداز ہے جو کہ یقیناً بہت خوب صورت ہے اور اسی لیے انہیں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ خوشبو کا سفر، حرص اور حسد کی ایک عام کہانی ہے مگر عالیہ بخاری کے اندازِ بیاں، ان کے جملوں کی بُنت اور ان کے لفظوں کے چناؤ نے اسے بہت خاص بنا دیا تھا مگر آخری قسط پڑھ کر شدید مایوسی اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جو بات مزید دو قسطوں میں بیان ہوتی تھی وہ اچانک ایک قسط میں سمیٹ دی گئی۔ آخر کے دو صفحے تو اس انداز میں لکھے گئے کہ پڑھنے والا حیرت سے سوچتا ہی رہ جائے کہ یہ کیا ہوا۔ یہ تو وہی بات ہو گئی کہ ایک تھا راجا ایک تھی رانی دونوں مر گئے ختم کہانی۔ اب خود ہی سوچ لیں کہ دونوں کیسے مرے۔ بالکل یہی حال خوشبو کا سفر کا ہوا، برقی ٹرین کی طرح اس قدر تیز رفتار اختتام۔ سب کچھ پڑھنے والے کی سوچ پر چھوڑ دیا۔ سمیعہ کو کیا ہوا کہ اسے ٹریٹمنٹ کی ضرورت پیش آئی؟ زین اتنا بڑا دھچکا کھانے کے بعد فوراً روما سے شادی پر کیسے آمادہ ہوا؟ اور زارا اور ہارون کے درمیان آنے والی خلیج کیسے پُر ہوئی؟'' (پیاری بہن ثریا...... آپ کے تبصرے کا شکریہ...... مگر ہم رائٹر سے اپنی پسند اور اپنے حساب سے ناول کا اختتام نہیں کروا سکتے...... ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں شروع سے ہی اپنے ناول کا یہی اختتام ہو...... کہ کوئی بھی رائٹر نیا ناول لکھنے سے قبل اس کا خاکہ تو پہلے سے ہی تیار کیا کرتا ہے)

✍ مہوش عبدالمجید، کراچی سے۔ ''جلترنگ پاکیزہ کی شان ہے۔ پاکیزہ آنے پر سب سے پہلے جلترنگ پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد عمیرہ آپی کا عکس بہت اچھا ہے۔ مگر بہت عجیب بھی لگا۔ البتہ ہمیشہ عجیب ہی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ چڑیا کا کردار بہت اچھا جا رہا ہے۔ چڑیا کو پلیز تکلیف میں نہ رکھا کریں۔ افسانوں میں عتیقہ کا افسانہ اچھا لگا نئی تحریر لگی مگر دل کو چھو گئی۔ عالیہ بخاری بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آپی میں بھی شاعری کی شوقین ہوں۔ اپنی شاعری آپ کو ارسال کرنا چاہتی ہوں۔'' (نیکی اور پوچھ پوچھ۔ فوراً سے پہلے اپنی شاعری بھیجو...... پاکیزہ کا ایڈریس اب میں ہر ماہ ہی بہنوں کی محفل میں لکھ رہی ہوں)

✍ زم زم، بورے والا سے۔ ''پاکیزہ کی ٹائٹل گرل معصوم سی لگی۔ اس کے علاوہ اسی طرح عمیرہ احمد کا ناول عکس اور شیریں حیدر کا شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں جیسے مجھے بھی کسی مسیحا کی تلاش ہے۔ بہت اچھا جا رہا ہے۔ نئی رائٹرز کی مختصر کہانیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ اسے جاری رکھیے گا۔ پتھر کو تراش کر ہی ہیرا بنتا ہے اور ہماری نئی رائٹرز بھی ایسی ہی ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ آنٹی انجم مجھے آپ کا اور عذرا رسول صاحبہ کا موبائل نمبر چاہیئے کیا آپ دینا پسند کریں گی میں اسے غلط استعمال میں نہیں لاؤں گی۔ آنٹی انجم میں اکیلی اور بیمار ہوں اپنے والدین اور آپی کو 9 اکتوبر اپنی سالگرہ کے دن حادثے میں مرتے دیکھا ہے۔ کوئی بہن، بھائی نہیں ہے۔ اکیلی گندی اور ظالم دنیا کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ بڑے تلخ تجربات سے گزری ہوں۔ خود کو کمرے تک محدود رکھا

ہوا ہے، لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ نماز، قرآن اور اس کے بعد پاکیزہ پڑھ کر دکھوں کو بھلانے کی کوششیں کرتی ہوں۔ آپ کا جلترنگ پڑھ کر اکیلے ہی مسکرانے لگتی ہوں اور پھر رونے کیونکہ آپ کے ساتھ مسکرانے والا کوئی ساتھی بھی تو ہو تنہائی بھی تو ایک عذاب ہے نا۔ بہنوں کی محفل میں خط لکھتی ہوں شاید کوئی میری دوست بن جائے مگر آپ میرا خط شامل نہیں کرتیں۔ غمِ تنہائی میں کوئی نہیں پوچھتا، ہاں آپ کے جنازے میں سب شامل ہو جاتے ہیں جسے آپ جانتے بھی نہیں۔ آہ آنٹی آپ میرا خط شامل کریں یا نہ کریں آپ کی مرضی۔'' (پیاری بیٹی زم زم میرا فون نمبر اس محفل میں ہر ماہ ہی شائع ہوتا ہے اور میرا موبائل میرے پرس میں بند، الماری میں پڑا رہتا ہے...... تو اس کا نمبر لے کر کیا کریں گی...... ہاں یہ زندگی رو کر گزارنے کے لیے نہیں ہنس کر مقابلہ کرنے کے لیے ہے اس لیے نا امیدی کو پاس مت آنے دینا)

میمونہ ذیشان، روات سے۔ ''کچھ عرصے قبل بہنوں کی محفل میں فرزانہ سعید راول پنڈی کا خط پڑھا بالکل ان کا طرزِ تحریر پسند نہیں آیا۔ فرزانہ صاحبہ اگر آپ کو پاکیزہ پسند نہیں آیا تو اپنی ناپسندیدگی کسی اور طرح سے بھی ظاہر کر سکتی تھیں۔ آپ نے تو بالکل ہی غلط طریقے سے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی، آپ کا طرزِ تحریر مجھے کیا یقیناً کسی بھی بہن کو پسند نہیں آئے گا۔ اس لیے آئندہ احتیاط کیجیے۔ تنقید تو ساری بہنیں ہی کرتی ہیں لیکن اس طرح تو کبھی نہیں پڑھا، نہ سنا۔ بعض اوقات کچھ تحریریں نہیں بھی پسند آتیں لیکن، ہم انہیں بکواس کی نذر بھی نہیں کر سکتے۔ انجم آپی! آپ کا ناول کب آ رہا ہے؟ بے چینی سے انتظار ہے۔ میں چاندنی کا اینڈ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ آپ یقین کریں میں اس کا اینڈ پڑھ کر بہت دیر تک استغفار پڑھتی رہی۔ بہر حال، میمونہ خورشید نے اچھا لکھا۔ ایک ننھی نیناں ابھی تک کھل کے سامنے نہیں آ رہا۔ اس کے علاوہ پاکیزہ کے تمام سلسلے ہی اچھے لگے۔ صائمہ اکرم کدھر چھپ گئیں بھئی؟'' (صائمہ اکرم...... بہت جلد پاکیزہ میں حاضر ہوں گی)

نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر جان سے۔ ''میری بک جلد آنے والی ہے انشاء اللہ آپ کو بھجواؤں گی، بس دعا کیجیے گا۔ آنٹی مجھے آپ سے بات کر کے بہت اپنائیت کا احساس ہوا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور اچھا لگا کہ آپ نے بھی میری شاعری کی بک وجہ ہے محبت پر مجھے اپنی قیمتی رائے دی تبصرہ کیا۔ میں آپ کی ممنون ہوں آنٹی۔ قسط وار ناولز اور ناولٹ سب ہی شان دار ہیں۔ عمیرہ احمد کا عکس ہمیشہ کی طرح ان کا منفرد انداز زبردست۔ شیریں حیدر، راحت وفا، عالیہ بخاری، رضوانہ پرنس بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت عمدہ لکھ رہی ہیں اور اس دفعہ تو ہماری پیاری سی سدرۃ المنتہیٰ بھی قسط وار ناولٹ محبت کی شام کے ساتھ آئی ہیں جناب۔ سدرہ کے لکھنے کا انداز مجھے شروع سے ہی بہت پسند آیا۔ پھر جوں جوں سدرہ کی تحریریں نظر سے گزرتی رہیں پسندیدگی کی سند حاصل کرتی رہیں۔ سدرہ کا فلسفیانہ اندازِ تحریر مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔ محبت پرسے جمی گرد صاف کر رہی ہوں۔ واہ کتنا متاثر کن اور منفرد سا ہے نا کیپ اٹ اپ سدرہ جی اینڈ ویری ویل ڈن یار۔'' (سدرہ تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے)

ثنا، نزہت قریشی، عروج، صائمہ، عائشہ، کراچی سے۔ ''یہ خط ہم بینک الفلاح میں جاب کرنے والی دوستوں کی طرف سے مشترکہ ہے۔ آپ کا پرچہ ہر لحاظ سے ایک معیاری اور منفرد پرچہ ہے۔ اس کے تمام سلسلے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ افسانوں کی سلیکشن لاجواب ہوتی ہے۔ پاکیزہ ہم تمام دوستوں کا

پسندیدہ پرچہ ہے اور آپ نے ہماری پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کا ناول عکس شروع کر کے تو ہمارے دل جیت لیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے پڑھنے والوں کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ مستقل سلسلوں میں باجی انجم انصار کے تحریر کردہ جلترنگ کا تو کوئی جواب نہیں۔ انجم باجی سے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ اتنے دلچسپ ٹاپکس کہاں سے لاتی ہیں، آپ کے مشاہدے کے تو ہم قائل ہو گئے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے آپ اتنی اچھی سچویشن کری ایٹ کرتی ہیں کہ ہمارا ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا ہے۔ ٹو بی ویری فرینک رضوانہ پرنس کے افسانوں سے زیادہ ہمیں ان کا تحریر کردہ آپ کا ناولٹ نما انٹرویو از حد پسند آیا تھا۔ باجی اس پر تو پورا ناول لکھا جا سکتا تھا آپ نے یہ سلسلہ بہت جلد ختم کر دیا۔ انٹرویو کے آخری حصے نے ہمیں بہت دکھی کر دیا، ہماری پُر خلوص دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، ہم سب دوستیں معراج رسول صاحب کے لیے بھی دعائیں کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحتِ کاملہ عطا کرے، آمین۔'' (آپ کی پُر خلوص دعاؤں کے لیے ممنون ہیں...... پسندیدگی کا شکریہ)

رعنا خان نارتھ ناظم آباد، کراچی سے۔ ''مجھے پورا پاکیزہ ہی پسند ہے مگر ناولوں کی کیا بات ہے۔ عمیرہ احمد تو میری جان ہیں۔ ان کا عکس بے حد شاندار جا رہا ہے۔ خوشبو کا سفر بھی بہت خوب صورت رہا۔ عالیہ بخاری تو میری جان ہیں۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر میں آپ کے بارے میں سوچا کرتی تھی کہ آپ نہ جانے کیسی ہوں گی...... شادی کی ایک تقریب میں، میری بیٹی نے آپ کو دیکھا بھی تھا...... مگر وہ آپ سے مل نہیں پائی...... ہاں جلترنگ تو سپر ہٹ ہے...... وہ تو میری جان ہے۔'' (پیاری رعنا...... اس محفل میں خوش آمدید میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس محفل میں باقاعدگی سے اپنی رائے دیں اور سب بہنوں کی جان بن کر رہیں)

ناہید قاضی، رسالپور کینٹ سے۔ ''دوسری بار بہنوں کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ پہلے خط کے شائع ہونے پر حوصلہ بڑھا۔ سب سے پہلے حضورﷺ کی سیرت پاک اور قرآنی آیات کا ترجمہ پڑھنے کے بعد مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا۔ آپ کے الفاظ پُر اثر ہوتے ہیں۔ نصیحت آموز ہوتے ہیں۔ اگر واقعی ہر انسان پریشانی کے وقت حوصلہ نہ ہارے...... تو یقیناً پریشانی، پریشانی نہیں رہتی۔ بہنوں کی محفل' یہ سلسلہ میرا پسندیدہ ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کی تعریف اور تنقید ہوتی ہے۔ شیریں حیدر کا شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، آگے کی طرف تیزی سے جا رہا ہے اور اب کہانی کے تمام کردار اپنی کہانی خود سنا رہے ہیں۔ خوشبو کا سفر، پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام کردار جیتے جاگتے ہیں۔ کہانی نہیں بلکہ حقیقت میں یہ سب ہم دیکھ رہے ہیں۔ عمیرہ احمد کا ناول عکس جنات اور بونوں کی کہانی ہے۔ عظمیٰ آفاق سعید جس طرح پاکیزہ ڈائری سجاتی ہیں تو جلترنگ بجنے لگتی ہے۔ آخر بٹی کس کی ہیں؟ اس کے علاوہ رضوانہ پرنس کا قربتوں کی دوری آخر اختتام کو پہنچا۔ امینہ نے ہمت دکھائی اور فضل کے چنگل سے نکل آئی۔ مجھے محترمہ انجم انصار کی دعاؤں کی کتاب انمول خزانے چاہیے۔ اس کا ہدیہ کیا ہے۔ محترمہ عذرا رسول صاحبہ کو تصاویر میں دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح سر پر دوپٹا لیے ہوئے بارعب شخصیت محفل کی جان بنی ہوئی نظر آئیں۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے اور ان کی جوڑی ہمیشہ سلامت رہے۔ انجم انصار صاحبہ سے گزارش ہے کہ یا تو اپنا انٹرویو کروائیں یا پھر خود ناولٹ، ناول لکھیں۔'' (گڑیا میری کتابیں ہر بڑے شہر کے اردو بازار میں مل جائیں گی۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنا ناولٹ لے کر آ رہی ہوں)

شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ''پاکیزہ کے ہر شمارے کی خاص بات یہ نظر آ رہی ہے کہ اب ہر ماہ کا

سرورق ایک سے بڑھ کر ایک ہے، قیصرہ حیات کا حضورؐ کے اسمائے گرامی ...... ہمیں معلومات دینے کے لیے جزاک اللہ۔ اداریہ پسند آیا۔ عمیرہ احمد کا ناول دلچسپ ہے۔ عالیہ بخاری کے ناول کی آخری قسط یقیناً ان کے حساب سے لکھی گئی ہے، رائٹر جو بہتر سمجھتا ہے، اس کا ویسا ہی اختتام کرتا ہے...... میری جانب سے مبارک باد۔ بکروں کے بارے میں دونوں افسانے اچھے لگے کہ یہی حقیقت ہے...... بہنوں کی محفل کے اس ماہ 19 صفحات تھے۔ بہت مزہ آیا دیگر مستقل سلسلے بھی بہترین رہے۔ محبت بھری شام اس لحاظ سے بڑی کارآمد لگی...... کہ ہمیں نئے فیشن کے بارے میں آگاہی ہوگئی۔'' (شکریہ)

✍ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ''آپ سے رابطہ کبھی نہیں ہو پاتا کہ مصروفیات نے بے حد جکڑ کر رکھا ہوا ہے مگر پاکیزہ پڑھنے میں کبھی ناغہ نہیں کرتی۔ عمیرہ احمد ہماری ہارٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کے ناول کی قسط بہت اچھی لگی...... مگر بونے کیا کہیں گئے ہوئے ہیں اور چڑیا...... تو ٹھیک ہی رہے گی نا...... بہنوں کی محفل پڑھی تو اس کا لطف بھی کسی مزے دار ناول کی طرح ہی آیا۔ میرا انتخاب بھی اچھا تھا اور پاکیزہ ڈائری بھی۔ اب تو سندیسے بھی مزے کے لگتے ہیں کارنرز بھی اچھے تھے۔ ہاں لبنیٰ عروج کا مکمل ناول تو بہت ہی اچھا لگا تھا۔ ویل ڈن لبنیٰ...... سب سے آخر میں جلترنگ پڑھا۔ اس لیے کہ منہ کا مزہ خوب اچھا ہو جائے اور دل و دماغ سے پریشانیاں بھی بھاگ جائیں۔ سالِ نو نمبر کے لیے بھی آپ خوب زبردست سا لکھیے گا۔'' (انشاءاللہ، ضرور)

✉ عتیقہ محمد بیگ، سیالکوٹ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے افسانے پر آپ کے نام کے بجائے عتیقہ رانا شائع ہوا۔ ایسا دراصل صرف غلط فہمی کی بنا پر ہوا...... کہ جب آپ نے ہمیں فون کیا تھا تو ہم آپ کو عتیقہ رانا سمجھے تھے۔

✍ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''نومبر کا پاکیزہ پسند آیا۔ عمیرہ احمد کا بہترین ناول ایک نشست میں پڑھ ڈالا۔ یوں بھی میں بہت جلدی پڑھ لیتی ہوں۔ بکروں سے متعلقہ دو افسانے اچھے تو تھے...... مگر اچھے نہیں لگے...... کہ یہ کوئی بکرا نمبر تھوڑی تھا۔ قیصرہ حیات کا مضمون آنحضرتؐ کے اسمائے گرامی کے بارے میں پڑھ کر نہ صرف پسند آیا بلکہ معلومات میں اضافے کا باعث بھی رہا۔ سدرۃ المنتہیٰ اور عالیہ بخاری کی تحریریں اچھی لگیں۔ قرۃ العین اور شمیم فضل خالق کے افسانے اچھے تھے۔ شیریں حیدر کے ناول کی قسط بھی ٹھیک تھی۔ شاید یہ بھی اختتام کی جانب ہے۔ ایک محبت بھری شام کا احوال پڑھ کر خود کو بھی ہم نے وہیں محسوس کیا۔ یاسمین رشید کے عمدہ مشورے اس تقریب کی جان تھے۔'' (ہاں، یہ تو ہے)

✍ ارم احتشام، کوئٹہ سے۔ ''سب سے پہلے عالیہ بخاری کے ناول کی آخری قسط پڑھی اور بہت بوریت ہوئی...... مجھے لگتا ہے کہ وہ چند اہم صفحات لکھنا بھول گئیں۔ صرف بیمار کر دینے سے بات نہیں بنی۔ ایک اچھے ناول کا اختتام نہ جانے انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس محفل میں ایک بہن نے لکھا تھا کہ سوائے عمیرہ احمد کے کوئی ناول ایسا نہیں شائع ہو رہا جس کی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہو۔ میں ان بہن سے متفق ہوں۔ عظمیٰ آفاق نے ایک افسانہ ہی لکھ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ایسے ہی موضوعات پر وہ دوسرا افسانہ بھی لکھیں۔ ایک محبت بھری شام اچھی لگی...... کہ اس میں شریک ہو کر ہم اب اپنے شادی کے جوڑے کو دوبارہ استعمال کرنے کے

بارے میں سوچ رہے ہیں۔ جلترنگ پڑھ کر مزہ آگیا۔ آپ پلیز اپنا ناول جلد شروع کریں اور یادوں کی مالا میں سینئر مصنفات کو لے کر آئیں۔ جس طرح ذکیہ بلگرامی نے اپنے بارے میں لکھا...... اسی طرح دیگر مصنفات بھی لکھیں۔'' (آپ بہت جلد رضوانہ پرنس کا انٹرویو...... ایک حقیقت ایک افسانہ میں پڑھیں گی)

✍ رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ''عمیرہ احمد کے ناول کی قسط اچھی لگی۔ عالیہ بخاری کو مبارک ہو کہ ان کا ناول خیر و عافیت کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ عتیقہ محمد بیگ، مدیحہ، شمیم فضل خالق اور لبنیٰ عروج کی تحریریں اچھی لگیں۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل واقعی لاجواب ہے...... اور اس طرح سے خطوط پر قینچی چلتی ہے کہ کسی کو محسوس تک نہیں ہوتی۔ خصوصاً انجم اپنے بارے میں تعریف کو حذف کر دیتی ہیں۔ اس محفل کا اپناپن مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' (اب آپ بھی اسی محفل کا حصہ بن گئی ہیں)

✍ فضائلہ لاشاری، کراچی سے۔ ''میری امی پاکیزہ کی مستقل قاری ہیں اور باقاعدگی سے اس کو طویل عرصے سے پڑھ رہی ہیں۔ میری بڑی بہنیں بھی اس کو باقاعدگی سے پڑھا کرتی ہیں اور اب میں بھی اس کی تحریروں کی فین ہوں۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک پڑھتی ہوں اور اب میں کوشش کروں گی کہ اس محفل میں شامل بھی ہوتی رہوں۔ میں ان دنوں ایک رومینٹک اور گھریلو سوپ اٹکھیلیاں میں کام کر رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میری بہنیں فیس بک پر میرے سوپ کی تصویریں دیکھ کر مجھے اپنی رائے دیں۔ ہاں عمیرہ احمد کو بتا دیں کہ چڑیا کو نہ ماریں۔ وہ بہت اچھی ہے۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ غزل ہاشمی، حضرو، ضلع اٹک سے۔ ''نومبر کا پاکیزہ اچھا لگا۔ بہنوں کی محفل کے اس ماہ 19 صفحات تھے...... اور بار بار پڑھے۔ افسانے، ناول سب پڑھے۔ عالیہ بخاری کا ناول ختم ہوا۔ اینڈ اچھا ہی تھا۔ لبنیٰ عروج، سدرہ کی تحریریں اچھی تھیں۔ دیگر تحریریں بھی پسند آئیں اور خاص طور پر یاسمین رشید کے مفید مشوروں کا شکریہ۔'' (نوازش)

✍ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''پاکیزہ میں ہم زیادہ سے زیادہ افسانے پڑھنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کا بے حد شکریہ کہ کون کیا کر رہا ہے جیسا سلسلہ ختم کر دیا۔ آپ کی تحریر کی کمی بے حد محسوس ہو رہی ہے۔ دیگر بہنیں بھی فرمائش کر رہی ہیں...... تو آپ کوئی زبردست سا ناول شروع کر دیں۔'' (آپ بہنوں کے اصرار پر اس ماہ میرا ناولٹ شامل ہے۔ پسندیدگی کا شکریہ)

✍ ایس فریدہ، لاہور سے۔ ''عمیرہ کا ناول پڑھا...... اس میں بونوں کا ذکر پڑھا تھا۔ حقیقی زندگی میں بونے کس کے گھر میں ہوا کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ بونوں کا ذکر اس میں کیوں کیا گیا تھا۔'' (پیاری فریدہ، عمیرہ احمد کا ناول شروع ہونے کے بعد مجھے بہت سی بہنوں نے فون کر کے بتایا کہ ان کے گھر بھی بونے رہتے ہیں۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ انہیں تنگ کرتے ہیں اور چند کو نہیں۔ اگر ہماری یہ بہنیں یا دیگر بھی جن کے ساتھ ایسے کوئی تجربے ہیں اپنے یہ تجربے بے شک نام بدل کر ہی ہمیں لکھ کر بھیجنے چاہیں تو لکھ کر بھیج دیں۔ ہم انہیں شائع کریں گے)

✍ زبیدہ حبیب، لاہور سے۔ ''عالیہ بخاری کے ناول کی آخری قسط پڑھی۔ مجھے حیرت ہے مصنفہ نے اس کا اختتام اس طرح کیوں کیا۔ زارا سے اسحٰق کے میاں کو معافی مانگنی چاہیے تھی۔ سمیعہ کو شرمندہ دکھانے

کے بجائے بیمار کیوں دکھا دیا۔ میری بیٹیاں بھی پاکیزہ بے حد شوق سے پڑھتی ہیں اور ان سب کی یہ فرمائش ہے کہ نیوز ریڈر فرحانہ اویس کا انٹرویو پڑھنا ہے۔ عذرا کو مبارک باد دیجیے گا کہ ان کا بیٹا ماشاءاللہ حج کی سعادت حاصل کر کے آنے والا ہوگا۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ عروج ذکی، کراچی سے۔ "پاکیزہ پہلی فرصت میں پڑھا، اچھا لگا۔ روحانی مشورے اس قدر عمدہ ہوتے ہیں کہ میں لوگوں کو بھی بتاتی ہوں۔ خوشبو کا سفر پڑھ کر اچھا لگا۔ عمیرہ احمد کا ناول بھی بہت پسند آ رہا ہے اور آپ کب اپنا ناول دے رہی ہیں۔ بہنوں کی محفل بہت بڑی تھی اس لیے مزہ بھی زیادہ آیا۔" (شکریہ)

☒ نوشابہ رئیس، لاہور۔ کیسی ہیں آپ؟ اب آپ کے شوہر کی طبیعت کیسی ہے؟ اور آپ کی بیٹی ڈاکٹر عظمیٰ...... امریکا سے کب آ رہی ہے آپ کے پاس؟

☒ نادیہ خان وسیر، کرم پور۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ...... آپ کی خصوصی مبارک باد عمیرہ احمد کو پہنچائی جا رہی ہے اور یاسمین رشید کو بھی کہ انہوں نے فیشن کے ملبوسات کے بارے میں آپ کو مفید مشورے دیے۔ ہاں آپ کا یہ خط پانی میں بھیگا ہوا ملا ہے کہ آپ کا نام بھی بہ مشکل پڑھ سکی ہوں۔

✍ ثوبیہ ناز، کراچی سے۔ "نومبر کے پاکیزہ میں اداریہ پڑھ کر تو میں اچھل ہی پڑی کہ آپ نے ایک چھوٹی سی بات میں کتنی بڑی بات کی۔ یہ میں سچ کہہ رہی ہوں کہ اس مرتبہ کا اداریہ اے ون ہے...... کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جسے یہ اداریہ اچھا نہ لگے...... میں نے کئی مرتبہ خود پڑھا۔ فون کر کے اپنی چاروں بہنوں کو سنایا...... کہ اس بات کو پلو سے باندھ لیں تو کوئی پریشانی ہی نہیں۔" (پیاری ثوبیہ...... اداریہ پڑھنے والے لوگ کم ہی ہوتے ہیں...... اور ہر ایک کی پسند بھی مختلف ہوا کرتی ہے...... جیسے ہمیں سیما یاسمین مجتبیٰ نے فون کر کے کہا...... اس دفعہ کیا عجیب سا اداریہ لکھا ہے...... تب ہم نے کہا اسے تم دوبارہ پڑھو...... تب وہ ہنس دیں اور بولیں...... اب ایسا ہوتا کہاں ہے۔ ہم نے کہا تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ اب لوگوں میں برداشت نہیں رہی ہے مگر ہونی تو چاہیے نا)

☒ پرہ عون، ٹنڈو باگو۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی بھیجی ہوئی غزل پڑھی نہیں جا سکی۔ آپ اپنے دوسرے مراسلات ذرا اچھی طرح سے لکھ کر بھیج دیجیے۔

☒ سمعیہ امجد شیخ، لالیاں۔ تم مزے مزے کے مراسلات نثر میں لکھ کر بھیجو۔ میں منتظر ہوں، ہاں۔

☒ دیا مغل، سرگودھا۔ آپ کے پوچھے گئے سوالات کے ترتیب وار جواب حاضر ہیں۔ 1 اللہ پر پورا یقین رکھیے کہ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے صرف اسی سے مانگیے۔ 2 درود ابراہیمی کثرت سے پڑھیں اور نماز کی پابندی کریں۔ نرم آواز میں بات کریں۔ 3 میرے پاس ایسا کوئی وظیفہ نہیں ہے جو کسی کو بھی ٹاپ کروا سکے۔ 4 خوش رہیں اور بال کی کھال نکالنا چھوڑ دیجیے، یہ مسائل ہیں ہی نہیں جو آپ کو لگ رہے ہیں۔ کھل کر جواب نہیں دے سکتی۔

☒ عالیہ تصور طاہر، لاہور۔ تمہارا اتنی پریشانی کا فون آیا تھا کہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ اب بچے کی طبیعت کیسی ہے؟ میں متفکر ہوں، مجھے فون پر بتا دینا۔

☒ ایک بہن، بیرون ملک۔ پیاری بہن نہ تو آپ نے اپنا نام مجھے بتایا تھا اور نہ ہی اس ملک کا نام جہاں آپ رہتی ہیں۔ آپ کی روتی ہوئی گفتگو سے یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یورپ کی کسی جگہ سے تعلق ہے اور حال ہی میں آپ کی جوان بیٹی کا انتقال ہوا ہے...... اور میں یہ بات دیگر بہنوں کو بھی بتانا چاہتی ہوں کہ اپنی اولاد کی شادی کرتے وقت...... آپ لڑکے، لڑکی کو دیکھیے...... ان کے اخلاق اور ان کی انسانیت کو جانچیے...... روپیہ، پیسہ، اسٹیٹس کو ہرگز اہمیت مت دیجیے...... کہ یہ چیزیں ثانوی ہیں اور یہ زندگی میں سچے پیار کا متبادل کبھی ثابت نہیں ہوا کرتیں۔

☒ ریحانہ شہزاد، کراچی۔ آپ کو اپنی لاڈلی بہن کنزالایمان کی سالگرہ اس ماہ مبارک ہو۔

☒ شگفتہ حسین، لاہور۔ آپ اپنی کزن کا انٹرویو ضرور بھیج دیجیے جو ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرتی ہیں۔ پاکیزہ میں ہر بہن اپنا انٹرویو بھیج سکتی ہے۔ چاہے...... وہ ہاؤس وائف ہو یا ہاؤس جاب پر...... ہمارے لیے ہر قاری بے حد اہم ہے اور ہم آپ کی تحریروں کو جگہ دینے کے لیے ہمہ وقت تیار بھی ہیں۔

✍ مسز رضوانہ، کراچی سے۔ "پاکیزہ کی فیس بک میں پہلی مرتبہ شامل ہو رہی ہوں۔ اور یہ بات میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ اس محفل کو خواہ کتنی ہی بار پڑھوں اس کا مزہ اپنی جگہ علیحدہ اور نیا سا ہوتا ہے۔ میں ایک مصروف اور بہت بڑی مونٹیسوری میں ٹیچر ہوں مگر میں ایک بات تمام ماؤں کو بتانا چاہتی ہوں کہ بچوں کا جو ڈیڑھ سال، دو سال اور ڈھائی سال کی عمر میں مونٹیسوری میں داخلہ کروا دیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس میں زیادہ تر بچوں کو پڑھنے سے ہی نفرت ہو جاتی ہے اور جب وہ پڑھنے کی عمر میں پہنچتے ہیں تو وہ پڑھنا چاہتے ہی نہیں ہیں۔ ہاں ان بچوں کی تعداد بہت کم ہے جو بہت شوق سے آتے ہیں اور بہت تیزی سے ہر چیز سیکھ بھی لیتے ہیں مگر کیا کریں...... کہ یہ بات یا یہ فیشن ہمارے ہاں ایک وبا کی طرح عام ہو گیا ہے کہ معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں کا مونٹیسوری میں داخلہ کروا دیا جاتا ہے۔ دوسری اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پر بھیجا جاتا ہے کہ فلاں بڑے اسکول میں ٹیسٹ کی تیاری کے لیے ایک سال کے لیے فلاں ٹیچر کے پاس بھیجنا ہوگا...... یا فلاں کے پاس۔ اتنے چھوٹے بچوں کو صرف گھر میں ہی پڑھانا چاہیے۔ اس کا جواب مائیں یہ دیا کرتی ہیں کہ ہمارے بچے ہم سے نہیں پڑھتے۔ ایسی تمام ماؤں کو میں ناکام اور نااہل ماں کہوں گی۔ بچوں کو اسکول میں پڑھانے کی صحیح عمر پانچ سال ہے۔ جو اسلامی لحاظ سے چار سال، چار ماہ، چار دن کے قریب ترین ہے۔ آج امریکا جیسے ملک کی ہم ہر معاملے میں نقالی کرتے ہیں مگر ان کے ہاں بھی اسکول میں پانچ سال سے چھوٹا بچہ داخل نہیں ہوا کرتا۔ براہِ کرم اپنے ننھے بچوں پر ایسا بوجھ مت ڈالیں...... جو وہ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ مجھے خوشی ہوگی کہ آپ وقتاً فوقتاً یہاں شرکت کریں اور ہماری بہنوں کو اپنی کارآمد باتوں سے مستفید کریں۔ آپ کی بات سے کوئی دو بہنیں تو ضرور اتفاق کر ہی لیں گی)

✍ سمیرا مجاہد، صادق آباد سے۔ "آپی قربانی کی گائے...... کے پہلے اور بعد میں کیا فرق ہے آپ کی نظر میں...... میرا مطلب ہے...... پہلے لوگ اپنے جانور کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور پھر قربانی کے بعد کے کیا احساسات ہوتے ہیں۔" (کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی...... احساسات خوشی کے ہی رہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پہلے اپنا جانور...... دروازے پر کھڑا نظر آتا ہے...... اور بعد میں ڈیپ فریزر میں چلا جاتا ہے)

منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ ”ہمارے گوجرانوالہ میں آپ سب لوگ بہت مشہور ہو...... پاکیزہ گھر گھر پڑھا جاتا ہے اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے، جب میں ان سلسلوں میں حصہ لیتی ہوں۔“ (پیاری منور ہماری سب تبصرہ نگار بہنیں...... مصنفات کی طرح مشہور ہیں نہ صرف پاکستان میں بلکہ دیگر ممالک میں بھی...... اور آپ تو ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں)

ایک ناراض بہن، پنجاب سے۔ ”مغرور آپی...... میں درجنوں ایس ایم ایس آپ کو کرتی ہوں مگر آپ کسی کا بھی جواب نہیں دیتیں...... آپ یہ جان لیں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ (پیاری بہن...... میں واقعی کسی بھی بہن کے ایس ایم ایس کا جواب نہیں دیتی اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا...... مگر آپ بہنوں کے ہر خط کا جواب تو دیتی ہوں اس لیے ناراضی چھوڑ دو...... اور آج میرے گلے لگ جاؤ)

یاسمین نشاط، لاہور۔ اللہ کا شکر کہ تم نے اپنی ناراضی خود ہی ختم کر دی۔ اس لیے فوراً سے پہلے آجاؤ...... تم مجھے ہمیشہ سے عزیز ہو اور رہو گی...... یہ بات تم یاد رکھنا۔

ستارہ شیخ، سندھ سے۔ ”باجی میں عرصہ دراز کے بعد اس پیاری سی محفل میں شامل ہو رہی ہوں...... اور آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں...... گو کہ مجھے شرم بھی آ رہی ہے مگر میرے ساتھ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ شاید میں کم تعلیم یافتہ ہوں یا شاید مجھے مانگنے کا طریقہ نہیں آتا...... کہ جب نماز پڑھتی ہوں تو مجھ سے دعا صحیح طریقے سے نہیں مانگی جاتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے رب سے ہر بات کہہ دوں...... مگر یوں لگتا ہے کہ میرے لفظ میرے سینے میں ہی گھٹ جاتے ہیں کیا آپ کوئی آسان سی دعا بتائیں گی۔“ (پیاری بہن...... آپ نے جو بات لکھی ہے وہ صرف آپ ہی کے ساتھ نہیں ہے...... ہم سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں...... تو لفظ گونگے ہو جاتے ہیں...... اور اکثر دنیا داری کے جھمیلے بھی ہمیں کھینچ لیتے ہیں۔ جلدی سے نماز پوری ہو تو سالن چولھے پر سے اتاروں، کہیں جل نہ جائے۔ ٹی وی کا ڈراما بھی بس شروع ہونے والا ہے۔ مہمان آنے ہی والے ہیں۔ ڈرائنگ روم پر ایک نظر ڈالنی باقی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی صورت میں ہم سب کو سجدے میں سر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے ہر وہ بات کر لینی چاہیے...... جو ہم کسی کو بتایا کرتے ہیں۔ اپنی ہر مشکل اپنی ہر پریشانی آسان لفظوں میں بلکہ اپنی مادری زبان میں اس وحدہ لاشریک سے کہہ دینی چاہیے جو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ ایک آسان سی دعا میں لکھ رہی ہوں۔ بے شک آپ اور دیگر بہنیں بھی اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیں۔ ”اے اللہ! میں تیری ایک ادنیٰ اور گناہ گار بندی ہوں۔ مگر میری تمام تر امیدیں تجھ سے ہی وابستہ ہیں کہ تو ہی ہر شے پر قادر ہے اور تو ہی وحدہ لاشریک ہے۔ اے پاک پروردگار تو میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے، آمین۔ یا مجیب یا مجیب یا مجیب)

بشریٰ سہیل، یو اے ای سے۔ ”سب سے پہلے عذرا رسول کے انٹرویو کی مبارک باد اتنی محبت کرنے والی خدمت گزار بیوی اور اتنی سادہ باتیں یہ تو الگ سے شائع کر کے ہر نئے شادی ہونے والی لڑکی کو دینا چاہیے۔ عمیرہ احمد کا ناول اچھا ہے مگر چڑیا نام اور چپس وغیرہ کی بار بار تفصیل بور کر رہی ہے آپ کی بار ہا تاکید کے باوجود مصنفات دین اور شرعی مسئلوں کو ناول، افسانے میں غلط پیش کر دیتی ہیں۔ شیریں حیدر نے ناول میں غلط بتایا کہ ایسی حالت میں طلاق نہیں ہوتی حالانکہ طلاق ہر حال میں ہو جاتی ہے اور جو بہت باریک مسائل ہیں وہ علما سے پوچھنا ضروری ہے کیونکہ پاکیزہ دنیا کے ہر کونے میں جاتا ہے تو صحیح علم ضروری ہے ویسے بھی یہ پنجابی فلم نما ناول پڑھ کر طبیعت بھاری ہی ہو جاتی ہے ایک ٹھی نیناں شاید اختتام تک سمجھ آ ہی جائے ابھی تو سر پر سے گزر رہا ہے۔ کون کیا کر رہا ہے پلیز بند کر دیں ساری پاکیزگی ختم کر رہا ہے۔ خوشبو کا سفر تا حال بہترین ہے اس دفعہ سب ہی افسانے اچھے تھے سعدیہ کی بیٹی کی پیدائش پر لوگوں کے ردِعمل کا سوچ کر واقعی بہت افسوس ہوا۔ جلترنگ اور روحانی مشورے بھی بہت اچھے تھے رضوانہ پرنس کے ناول کا اختتام اچھا تھا مگر ابینہ کی انٹری کا سمجھ نہیں آیا کہ دو کرداروں میں کیا تعلق تھا عروسہ عالم نے بھی بہت اچھا لکھا واقعی ہر جگہ عورت کو ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ سعدیہ رئیس کا بس سو سو تھا۔“ (کون کیا کر رہا ہے یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ رہی بات آپ کی پسند اور ناپسندیدگی...... تو ہر بہن کی پسند مختلف ہوتی ہے...... بہرحال آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

شمائلہ سہیل جاوید۔ کراچی۔ ”عالیہ جی کا خوشبو کا سفر اختتام کو پہنچا مگر آخری قسط میں وہ مزہ نہیں آیا معذرت کے ساتھ...... آخری صفحوں میں لگ رہا تھا سب کچھ جلدی جلدی سمیٹا گیا ہو۔ نہ ہی رضا کا کچھ پتا چلا۔ نہ ہی سیف کی پہلی بیوی اور اس کے سابقہ شوہر کا اینڈ دکھایا۔ اس کے علاوہ ہارون اور زارا دوبارہ اسی جذبے کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف پلٹے کچھ تو ہارون کی شرمندگی دکھاتے۔ زین کس طرح راضی ہوا روما کے ساتھ۔ کچھ تشنگی سی محسوس ہوئی۔ بہرحال ایک اچھے ناول کا اختتام ہوا۔ باقی دونوں ناول بس ٹھیک ہیں۔ شیریں حیدر کے ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے۔ لہٰذا کبھی کبھی تمام رشتوں کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دفعہ سب سے اچھی بات مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے گُر کی بات بتا دی۔ میاں بیوی اگر انا کے پرچم تھام لیتے ہیں تو پھر گزارہ بڑا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ رشتہ جتنا پیارا ہے اتنا ہی نازک مگر سمجھ دار لوگ ہی اس راہ پر کامیاب ہوتے ہیں۔ عکس میں کچھ نئے عکس نظر آ رہے ہیں۔ آخر میں چڑیا کو عقاب کے پنجے میں دیکھ کر دل یک دم ہی لرز گیا۔ خدا کرے یہ خواب ہو۔ چڑیا کو کچھ نہ ہوا ہو۔ لیٰنی عروج ہم اور تم میں ٹاپ پر رہیں۔ اتنے پیارے محبت کرنے والے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک بہت ہی دل دکھا۔ یہ انسان کا نفس ہی ہے جو اسے پل بھر میں کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ببول کا سایہ شمیم صاحبہ کی اچھی تخلیق، اچھائی اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ محبت کی شام ابھی تبصرہ محفوظ ہے۔ اختتام کے بعد سدرہ صاحبہ کے ناولٹ کے بارے میں کچھ کہیں گے مگر ساحرہ صاحبہ نے اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے اب پچھتاوا کیسا ہے۔ آگ اور تیل قریب قریب اور پھر بھی نہ تپش پہنچے ایسا ہو نہیں سکتا۔ باقی تمام سلسلے حسبِ روایت شاندار سب سے زیادہ خوشی اور دل سے دعا نکلتی ہے روحانی مشورے پڑھ کر۔ تمام ادارے کے لیے واقعی یہ کام صدقۂ جاریہ ہے۔ اس دفعہ ڈینگی سے بچاؤ تمام بہنوں کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔“ (نوازش)

عطیہ ہدایت اللہ، پشاور سے۔ ”عمیرہ احمد کا ناول پسند آ رہا ہے۔ ہما بیگ کے شعری مجموعے کی اطلاع آپ کے رسالے سے ملی، اسے منگایا پڑھ کر اچھا لگا۔ کیکٹس کے روپ بہت معنی خیز سا نام ہے۔ عورت

کے دکھ، صبر اور حوصلہ ہر صفحے پر بکھرا پڑا ہے۔ وہ خود اندر سے زخم زخم ہو تب بھی اپنے پیاروں کے لیے پھول ہی کھلاتی ہے۔ مجھے آپ کی کتاب انمول خزانے اور دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ ہماری کتابیں حاصل کرنے کے لیے ہمارے پبلیشر کو فون کو دیں وہ آپ کو وی پی کر دیں گے۔ فون نمبر یہ ہے 042-37668958)

مدیحہ ندا، کراچی سے۔ ''آپی پاکیزہ پڑھتے ہوئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر جب سے پڑھنا شروع کیا ہے یہی خیال بار بار آیا کہ اتنی دیر کیوں کر دی لیکن خیر دیر آید درست آید اور آپی جب سے میں نے پڑھنا شروع کیا ہے خط لکھنے کا بھی تب ہی سے سوچ رہی ہوں مگر دیکھیں ہمت اب ہوئی ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے آپ کو فیس بک پر تلاش کر کے فرینڈ ریکوئسٹ بھیجی اور دعا کرتی رہی کہ آپ ایڈ کر لیں۔ (جی ضرور) سب سے پہلے قسط وار ناول کی جانب دوڑ لگائی۔ کیا بات ہے عمیرہ احمد کی مگر یہ کیا چڑیا کے ساتھ یہ کیوں......؟ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ راحت وفا کا ایک تھی نیناں بھی اچھا جا رہا ہے مگر رابعہ بیگم کا رویہ ہمیں بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ شیریں حیدر کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ خوشبو کا سفر عالیہ جی یہ کیا...... کہاں تو آپ تمام کرداروں کو وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی تھیں اور کہاں آپ نے ایک صفحے میں پوری بساط لپیٹ دی۔ عجیب سا ہی ہو گیا کچھ...... خیر سدرۃ المنتہیٰ کا ناولٹ اچھا ہے مگر ساحرہ پہ بہت غصہ آ رہا ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے مگر قرۃ العین رائے کا ہوتا ہے شب و روز پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ کس کی جیت کس کی مات اچھا لکھا واقعی ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ ببول کا سایہ بھی اچھی تحریر تھی۔ مستقل سلسلے تو ہوتے ہی زبردست ہیں مگر کیا بات ہے آپی جلترنگ کی...... واہ واہ اور یہ واہ، واہ آخری لفظ تک ہم ادا کرتے ہی رہتے ہیں۔ دیور کے نام خط بہت اچھا تھا۔ میرا انتخاب میں حنا عزیز کا انتخاب پسند آیا۔ آپی اداریہ پڑھا ایک ایک لفظ کی سچائی دل میں اثر کر گئی۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان سے۔ ''اب اللہ کے فضل و کرم سے طبیعت کچھ بہتر ہے تو سوچا کہ قلم اٹھا کے محفلِ پاکیزہ کا حال احوال لیا جائے لیکن اب سوچیں اس قدر الجھی ہوئی اور منتشر رہتی ہیں کہ میں باوجود کوشش کے زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ قلم ہاتھ میں اٹھا کے حیران و پریشان سوچتی رہتی ہوں کہ کیا لکھوں......؟ محفلِ پاکیزہ میں نواب شاہ سے جمالی سسٹرز کی آمد اچھی لگی شاید کہ وہ ہمارے بعد محفلِ پاکیزہ میں اپنی جگہ بنوا سکیں اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنا آپ منوا سکیں۔ محفل میں اکثر گنگناتی ہوں کے بارے میں اس حقیر کی اس گزارش کو قابلِ توجہ سمجھا جائے اور قاری بہنوں کی توجہ اس جانب مبذول کرائیں کہ جو بھی شعر لکھیں اس کے ساتھ شاعر کا نام ضرور دیں تا کہ یہ پتا چل سکے کہ فلاں شعر کس شاعر کا ہے اور کیا میں اکثر گنگناتی ہوں میں ہم اپنے شعر بھی بھیج سکتے ہیں جنہیں شعر کہتے ہوئے بھی ہمیں ندامت ہو رہی ہے۔'' (بالکل بھیج سکتی ہیں)

رعنا شاہ، امریکا سے۔ ''آپ کا پاکیزہ بلکہ ہمارا پاکیزہ ماشاءاللہ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے اور پڑھے بغیر چین نہیں ہے۔ سلسلے تو سارے ہی اچھے ہیں، آپ کا جلترنگ بہت مزے دار اور ہر درد کی دوا ہے۔ کہانیاں تو میرے پاس بھی کئی ہیں زندگی کے حقائق ہی سے کہانی بنتی ہے۔ آپ کو ایک پرانا خط بھی بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس وقت لکھا تھا 2007ء میں جو آج تک mail نہیں کیا تھا کہ ساتھ آپ کو پوری داستان لکھ کر پھر

بھیجوں گی لیکن ابھی اس بیماری کے بعد خیال آیا کہ اب تو یہ بونس زندگی ہے یہ خط آپ تک پہنچ جائے پر کوشش کر رہی ہوں یادیں جمع کر کے لکھوں۔ میری ازدواجی زندگی پہ بھی فلم بن سکتی ہے کیونکہ یہ 25 سالوں میں بھی بہت سے موڑ آئے اور وہ خواتین جو پاکستان میں بیٹھی یہ سوچتی ہیں کہ امریکی بیگمات کی موجیں ہیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ اصل میں ایسا نہیں ہے یہاں بھی ہم عورتیں مجبور ہیں اور حالات کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن جاتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے حالات کا مقابلہ کیا چار بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کی اور ان کو اس طرح پروان چڑھایا کہ آج لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ کو داد دینی چاہیے آپ نے یہاں رہ کر بچوں کی اتنی اچھی تربیت کی۔ اسلامی تعلیم بھی دی قرآن، نماز، روزہ، اردو لکھائی اور اسکول کالج میں بھی ماشاءاللہ اچھے ہیں۔ خود ملازمت کرتی رہی ہوں بچوں کو پالنے کے لیے۔ بہر حال آپ کا ساتھ آپ کی باتیں مشعلِ راہ اور بہت حوصلہ افزا ہیں۔ میری ماں بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دو بہنیں ہیں دونوں دور ہیں آپ سے بہنوں والا دوستوں والا رشتہ ہے تبھی ہر بات کر سکتے ہیں ہم لوگ۔'' (پیاری بہن! آپ اپنی کہانی بے شک ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھ کر بھیج دیں اسے میں ری رائٹ کر کے شائع کروں گی)

فریدہ فری، لاہور سے۔ ''نومبر کا پاکیزہ ملا ٹائٹل پر بے حد خوب صورت ماڈل اچھی لگی۔ اپنی غزل پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا بہت اچھی باتیں تھیں میاں بیوی میں پیار و محبت اور ذہنی ہم آہنگی ضروری ہے۔ بہنوں کی محفل بہت ہی پسند ہے اس کے بعد جلترنگ پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ پاکیزہ کے افسانے اور ناول تو بے حد اچھے ہوتے ہیں۔ شمیم فضل خالق بے حد اچھا لکھتی ہیں اور اپنی فیورٹ رائٹر عمیرہ احمد کا قسط وار ناول تو بہت شوق سے پڑھتی ہوں مکمل ناول ہم اور تم، کس کی جیت کس کی مات، ببول کا سایہ، خصوصی مضمون ایک محبت بھری شام پڑھ کر اچھا لگا۔ خوش ذائقہ میں مٹن کنا بہت مزیدار لگا۔ سندیسے میں امینہ عندلیب کا سندیسہ پسند آیا۔ سب دوستوں کو دعا اور سلام۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہیں)

عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے۔ ''نومبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اداریہ سے لے کر ہومیو کلینک تک سب پڑھ لیا ہے۔ آنٹی آپ نے محفل میں جس اہم مسئلے کی طرف دھیان کرایا ہے، وہ قابلِ غور ہے اور قابلِ فکر بھی۔ سب سے پہلے اہم بات کہنا چاہوں گی کہ ایک لڑکی کی تربیت میں اس کی ماں کا بڑا عمل دخل ہے پھر ماحول اور معاشرے اپنے فعال سرانجام دیتے ہیں۔ خداوندِ کریم نئی نسل کو ہدایت دے کہ جو نیٹ، ٹیلی فون اور دیگر سائنسی سہولیات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک لڑکی کی زندگی میں اس کی عزت و کردار ہی سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر ہر عورت کو یہ احساس ہو جائے تو یقیناً وہ ان راہوں پر چل کر اپنی نسوانیت پامال نہ کرے۔ ہاں آنٹی اور انکل کو ذیشان بھائی کے راہِ مبارک میں سفر کی مبارک باد۔ قانتہ رابعہ، عظمیٰ عنبرین اور دیگر بہنیں جو اس مبارک سفر پر روانہ ہو چکی ہیں انہیں تہہ دل سے مبارک باد بلاشبہ ہمیشہ کی طرح پاکیزہ اے ون رہا خداوند کریم اس کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔'' (آمین)

آصفہ سحر، لاہور سے۔ ''اس دفعہ پاکیزہ عید سے پہلے ہی مل گیا سو چھٹیوں میں خوب مزہ آیا۔ کھانا پکایا اور پاکیزہ لے کر بیٹھ گئے پھر کھانا کھایا اور پاکیزہ لے کر بیٹھ گئے۔ سب بچے چڑتے رہے آج بھی آنٹی رسالہ ہی گیٹ ٹو گیدر ہوئی اور رات کو پھر رسالہ لے کر بیٹھ گئے لیٹ نائٹ تک آدھا پڑھ لیا مجھے نیا ناول بہت اچھا لگا

ہے۔'' (شکریہ)

✍ گیتی آرا، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی باجی بہت کچھ کہہ گئیں۔ واقعی محبت زندگی میں ہوا پانی سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ باجی کی باتیں دل میں گھر کر گئیں اور اب باری تھی اپنی پسندیدہ رائٹر کے پسندیدہ ناول پڑھنے کی جس کا ہم کیا پاکیزہ کے تمام قارئین بے تابی سے انتظار کرتے ہیں۔ عکس کی کہانی اپنے اندر ڈھیروں دلچسپی اور سسپنس لیے تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور اب انکل کا چڑیا کے ساتھ گھناؤنا رویہ اور روپ ہمیں ایبک کی طرح حیران و پریشان کیے ہوئے ہے اور اگلی قسط کے لیے بے تاب ہیں کہ کب اگلا مہینہ آئے اور کب ہمیں عکس کی اگلی قسط پڑھنے اور چڑیا کے ساتھ انکل کے اس رویے کا راز پتا چلے۔ بہرحال عمیرہ احمد ہماری توقع کے مطابق کہانی کی دلچسپی اور سسپنس برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں میں شیریں حیدر نے رشتے اور کرداروں کی بھرمار نے رشتوں اور کرداروں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ مدیحہ عدنان کس کی جیت کس کی مات میں مہربانو جی دولت مندوں کو دل کی غریبی اور کم ظرفی کا آئینہ خوب دکھایا اور ساتھ ہی بظاہر غریب نظر آنے والی زرمینے کی اعلیٰ ظرفی اور دل کی غنی اور سخاوت ہمیں متاثر کیے بنا نہ رہ سکی۔ رفاقت جاوید نے ہمارے بکرے میں بقرعید سے پہلے ہی بقرعید کا سماں باندھ کر رکھ دیا اور کیا خوب باندھا کہ گھر گھر کی بقرعید کا سماں کھینچ کر رکھ دیا۔ رفاقت جاوید کے خوب صورت طرزِ تحریر کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ ہم اور تم کے درمیان معروف شاعر شگفتہ شفیق کے اعزاز میں استقبالیہ اور بہت کچھ سوچتے ہیں ہم بہت پُرلطف رہی اور اب بات ہو جائے محبت بھری ایک شام کی جس میں یاسمین رشید کی فیشن سے متعلق مفید باتیں ہم جیسی ہاؤس وائف کے لیے خاصی فائدہ مند رہتی ہیں، گھر بیٹھے بٹھائے ہمیں آج کل کے نئے نئے فیشن کا پتا چلتا رہتا ہے اور یہ مشورہ کہ شادی بیاہ کے لیے لمبی قمیص جو آپ غرارے یا لہنگے کے ساتھ بنائیں اس کے ساتھ کوئی چوڑی دار پاجامہ یا پتلون بھی بنالیں۔ جوڑے کو ایک نئی لک اور نیا انداز دینے کا یہ کام بہت عمدہ ہے۔ پاکیزہ ڈائری کے سبھی انتخاب۔ حمد باری تعالیٰ سے لے کر سچی دوستی اور سوالاً جواباً زبردست اور بہترین تھے اور اب باری تھی اپنی پسندیدہ صفحے جلترنگ کی جس کے پُرمزاح خاکوں نے ہنسنے پر مجبور کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن رائٹر کے خوب صورت طرزِ تحریر اور جملوں کی داد دینے اور واہ واہ کرنے پر ضرور مجبور کر دیا خاص کر یہ جملے شبانہ نے اپنی جھر جھر بہتی ہنسی سے نمٹ کر کہا۔ لہجے میں خفگی کی افشاں چھڑکی ہوئی تھی۔ غصے کو آنچ سی لگ گئی۔ آنچ پر پانی کا چھینٹا پڑا۔ جملے کیا تھے گویا طنز و مزاح اور خوب صورت لفظوں، استعاروں، تشبیہات میں ڈوبے شاہکار واہ مزہ آگیا۔ میرا انتخاب کے سارے ہی انتخاب لاجواب تھے خاص کر فیض احمد فیضؔ کی غزل اور ساتھ ہی مشتاق احمد قریشی کی تجدیدِ وفا۔'' (نوازش)

✍ صدف آصف، کراچی سے۔ ''انٹرنیٹ کے دور میں جب دومنٹ میں ای میل بھیج دی جاتی ہے اور فوری ای میل کے ذریعے جواب بھی موصول ہو جاتا ہے آپ کو خط لکھنے میں ایک الگ طرح کا مزہ آرہا ہے۔ پاکیزہ پڑھنے کے بعد جلترنگ کا ذائقہ منہ پر اس طرح رہتا ہے جیسے دعوت میں نمکین کھانے کے بعد میٹھا کھایا جائے۔ مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی تحریر کو بھدا بنا سکتی ہے یہ آپ کا کمال ہے کہ اپنے کردار کے ذریعے آپ مزاح کا حق ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ عالیہ بخاری کا خوشبو کا سفر پڑھنے کے لیے

ہر مہینے پاکیزہ خریدتی ہوں باقی چیزیں بونس کے طور پر پڑھ لیتی ہوں۔ ہاں اب عکس بھی پاکیزہ خریدنے کی وجہ بنتا جارہا ہے۔ 28 نومبر کو میری شادی کی سالگرہ ہے۔'' (سالگرہ مبارک ہو اور تبصرے کا شکریہ)

✍ ازکیٰ صدیقی، کراچی سے۔ ''نومبر کا شمارہ شوق سے پڑھا۔ بہنوں کی محفل میں اپنا خط دیکھنے سے زیادہ اس بات کی خوشی ہوئی کہ آپ نے پہچان لیا۔ میری بیٹیوں کو بھی خوشی ہوئی گو کہ وہ ابھی چھوٹی ہیں۔ عکس کی یہ قسط بھی دلچسپ رہی لیکن بونوں کے ذکر کی کمی محسوس ہوئی ایسے انوکھے کردار کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ سچا دوست اور کس کی جیت کس کی مات دونوں تحریریں لاجواب تھیں۔ ہم اور تم پڑھ کر افسوس ہی ہوا، شمیم فضل خالق نے بھی اچھا لکھا۔ خوشبو کا سفر کی آخری قسط پسند آئی سیف کی اعلیٰ ظرفی پسند آئی۔ جلترنگ نے ہمیشہ کی طرح جلترنگ بجا دیے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ لاجواب تھا۔'' (شکریہ)

✍ شمسہ ارشاد محمد علی، ہٹیاں بالا سے۔ ''میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری نگارشات شائع کی ہیں۔ میری امید پہلے تو ختم ہو گئی تھی مگر دل میں پھر بھی ایک امید تھی کہ اگر آپ کو میری چیزیں ملیں تو آپ ضرور شائع کریں گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو صحت و ترقی عطا فرمائے ہر دکھ سے بچائے، آمین اور پاکیزہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔'' (آپ اپنی تحریریں باقاعدگی سے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی)

✍ ہما شاہ، بہاول نگر سے۔ ''پاکیزہ کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ عمیرہ جی کا خوب صورت ناول دل میں اترتا جاتا ہے، ان کی تحریریں ہمیشہ ہی متاثر کن رہی ہیں اور اب ان کا مخصوص اسٹائل ذرا سی تبدیلی کے ساتھ جو شاید ان کو بہت پڑھنے والوں نے محسوس کیا ہوگا بہرحال مزہ آرہا ہے۔ ایک تھی نیناں' راحت جی کیوں ہمیں نامناسب لگ رہا ہے۔ کس کی جیت کس کی مات کا اختتام اچھا رہا انسان خود کو اعلیٰ اور دوسروں کو کمتر سمجھتا ہے مگر اس ذات کے ہاتھ میں عزت اور ذلت ہے جسے چاہے نواز دے۔ ہم اور تم مکمل ناول انسان اپنے کیے کی سزا ضرور حاصل کرتا ہے جلد یا بدیر اسے ان تمام کاموں پر پچھتانا پڑتا ہے جو اس نے جوش اور نادانی میں کیے ہوں۔ ہمارے بکرے ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر تھی۔ ببول کا سایہ اچھی تحریر رہی۔ جلترنگ میں ایک بکرا آیا سچ میں بہت مزہ دے گیا۔ شگفتہ شفیق کو بہت مبارک۔'' (شکریہ)

✍ مریم طارق، ڈسکہ سے۔ ''پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں۔ ماشاء اللہ سے پاکیزہ کا معیار بہتر سے بہتر قائم رہا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔ عمیرہ آپی کا عکس زبردست چل رہا ہے اور چڑیا کا کردار مجھے بہت پیارا لگ رہا ہے۔ عمیرہ کی تعریف کے لیے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ سچا دوست .... افسانہ کمال کا تھا۔ کہانی کا پلاٹ بہت منفرد سا لگا اور باپ نے گلے میں رسی ڈال دی۔ بہت دکھ بھی ہوا مگر یہی سچ ہے آمدنی کم اور ضرورت زیادہ خصوصی مضمون آپ کا بہت اچھا لگا۔ ببول کا سایہ بھی اچھا افسانہ تھا۔ ایک تھی نیناں سو سو چل رہا ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ مسز ثمینہ نسیم، بہاول پور سے۔ ''میں 1980ء سے جب میں اسٹوڈنٹ تھی' آپ کے مختلف سلسلوں میں ثمینہ خلیل کے نام سے شرکت کیا کرتی تھی پھر شادی ہو گئی اور میں نے ایک دوبار ثمینہ نسیم کے نام سے شرکت کی مگر پھر گھر اور بینک کی جاب کی مصروفیت کی بنا پر شریکِ محفل نہ ہو سکی مگر پاکیزہ آج بھی میرا

پسندیدہ رسالہ ہے۔ جس کا معیار ماشاء اللہ بہتر سے بہترین ہوگیا ہے۔ پچھلے سال میرے ساتھ ایک سانحہ ہوا جب میرے میاں سید نسیم الدین مجھے اور میری بیٹی ایمن کو 28 اگست کو چھوڑ کر راہی عدم ہوئے۔ اس غم نے ہمیں توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔'' (ثمینہ نسیم آپ اپنی تحریریں، نثر، نظم سب بھیجیں ہم ضرور لگائیں گے۔ اس ماہ آپ کی نظم جب ملی اس وقت پاکیزہ ڈائری ترتیب دی جا چکی تھی)

فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''ذیشان، قانتہ رابعہ اور عظمیٰ عنبرین کو حج کی بہت مبارک باد قبول ہو۔ آپ کی شادی کے موضوع پر کارآمد باتیں بہت مفید رہیں۔ شادی کا دوسرا نام خاموشی، صبر و برداشت ہے جسے ان کا مفہوم سمجھ آئے گا وہ کامیاب و پُرسکون ازدواجی زندگی کے معانی سے آگاہ ہوگیا ورنہ چیخ چیخ اور کل کل تو مقدر ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک و بابرکت کلام اور محترمہ قیصرہ صاحبہ کے دلکش انداز میں لکھے گئے اسمائے مبارک کو دل کی گہرائیوں سے پڑھا اور بے اختیار درود پاک وردِ زباں ہوگیا۔ عکس کا تھوڑا سا راز کھلا شیر دل کی بے قراریاں دل کو بھاتی ہیں، شہربانو کو اس کا مطلب ہے ابھی اور زیادہ دکھوں کا بوجھ سہنا ہے۔ چڑیا کے بارے میں تجسس ہوا خیر دین کا کردار کسی ماہر استاد سے کم کا نہیں۔ ہوتا ہے شب و روز قرۃ العین نے بقرعید کی مناسبت سے دل گداز افسانہ لکھا۔ سچا دوست اگر کوئی غیر مسلم پڑھ لے تو مجھے امید ہے کہ وہ رب کریم کی وحدانیت و یکتائی کا قائل ہوکر مسلمان ہوجائے گا۔ اس کی مہربانی و رحم اس کی صفات میں سرفہرست ہیں۔ عنیقہ نے اچھوتے انداز کی سبق آموز تحریر پیش کی۔ مدیحہ عدنان نے بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ غرور کے لالچ میں انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ ہم اور تم مہ نور کو برا بھلا کہیں یا اس کے مقدر کو یا کم عقلی سب نے مل کر اس کا حال تباہ کیا۔ لبنیٰ عروج نے کامیاب تحریر لکھی۔ شمیم فضل خالق کا ببول کا سایہ شمشاد جیسی کینہ پرور عورتوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اسٹار پلس جیسی صفات چھپ کر ہنسنا اور راز کے افشا ہونے پر معاملہ درست ہونا مزیدار تحریر تھی۔ خوشبو کا سفر کی آخری قسط اداس کرگئی۔ عبدالعزیز سب پہ بازی لے گئے یہ سب کرداروں کو عالیہ جی نے مناسب انداز میں بھگتا دیا۔ اِک محبت بھری شام کے تاثرات پسند آئے۔ ہما بیگ کی نظم پسند آئی۔ بہنوں کی محفل تو ہے ہی رسالے کی جان۔ نت نئی خبریں اور حالت سے آگہی ہوتی ہے۔ جلترنگ میں آپ کے لکھے ہوئے خطوط اداس لمحوں میں مسکراہٹ کی چاشنی بھر دیتے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☆ پیاری بہنوں آپ کو پاکیزہ میں افسانے بھیجنے ہوں، اپنے خط، اپنے انٹرویو یا ہمارے کسی بھی سلسلے میں حصہ لینا چاہتی ہوں اس کا ایڈریس ایک ہی ہے۔ نوٹ کر لیجیے۔ مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ 63-c فیز 2 ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹا ختم ہوا آئندہ شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا۔ اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی و سماوی آفات تمام پریشانیوں، بیماریوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین ثم آمین۔

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ ربِ ذوالجلال

لفظ جو خدا تیری حمد کو ترستے ہیں
آ کے تو خیالوں میں اس قلم میں رہتے ہیں
ہیں فقط قلم سے ہی حرف کو نہیں لکھتا
یہ تو اشک بن بن کر آنکھ سے برستے ہیں

مرسلہ: ناہید نبت نور، واہ سیمنٹ ورکس

نعت رسول مقبول ﷺ

یارب نبی ﷺ کے قرب کی سوغات ہو نصیب
ہو جس میں اُن کا ذکر وہی بات ہو نصیب
سیرت پہ اُن کی میں کچھ ایسے عمل کروں
مجھ کو بھی اُن کی معرفتِ ذات ہو نصیب
جو اشک بھی بہا سے نسبت ہو آپ ﷺ سے
اشکوں کی اُن کے در پہ وہ برسات ہو نصیب
نکلے نہ میرے ہونٹ سے ہو جائے مستجاب
میرے لبوں کو ایسی مناجات ہو نصیب
عشقِ عمرؓ ہو صدقِ ہو صدیقؓ کی مثال
حبِ علیؓ کی مجھ کو ہر اک بات ہو نصیب
آنکھوں کو ان کی صورت انور ﷺ کی ہے طلب
اِک بار خواب میں ہی ملاقات ہو نصیب
تو اور ترے نبی ﷺ کا کروں ذکر صبح و شام
محسن کو اپنے در سے وہ دن رات ہو نصیب

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: مسز عظمیٰ خورشید، لاہور

توبہ! لا الہ کا راز

توبہ عشقِ مصطفیٰ کا زینہ ہے۔ توبہ حبِ الٰہی کی کنجی ہے۔ توبہ عاشقوں کے دلوں کا سوز ہے جو درِ الٰہی پر جھکا دیتا ہے۔ توبہ روح کی آواز ہے۔ توبہ شوریدہ دل کا ساز ہے۔ توبہ لا الہ کا راز ہے۔ توبہ گوہر نایاب ہے جو محبّ اور محبوب کے درمیان حجابوں کو اٹھا دیتا ہے۔ توبہ امت کی وہ آتش ہے جو دامن کے داغ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ توبہ پژمردہ لوگوں کے لیے خبرِ بہار ہے یہ ایمان کی تروتازگی ہے۔ توبہ جرموں کا تریاق ہے۔ توبہ دلِ مضطر کی آہ و فغاں ہے۔ توبہ خدا کے حضور نفس کی شرمندگی ہے۔ توبہ ظلمت کدے سے نکلنے کا نظارہ ہے۔ توبہ رفعتِ پرواز کا سہارا ہے۔ توبہ سکونِ قلب ہے گویا کہ توبہ ماضی کی بے اعتدالیوں کا تدارک ہے۔

نوٹ: رات کو سوتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے توبہ مانگ کر سونے کی عادت ڈالیں۔

مرسلہ: نورین خاکوانی، بہاول نگر

خوابوں کی حقیقت

شریک بن عبداللہؓ خلیفہ مہدی کے زمانے میں قاضی تھے۔ ایک مرتبہ وہ مہدی کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں قتل کروانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا۔ ''امیر المومنین کیوں؟'' مہدی نے کہا۔

''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم میرا بستر روند رہے ہو اور مجھ سے منہ موڑے ہوئے ہو۔ میں نے یہ خواب ایک معتبر کے سامنے پیش کیا تو اس نے

یہ تعبیر دی کہ قاضی شریک ظاہر میں تو آپ کی اطاعت کرتے ہیں لیکن اندر اندر آپ کے نافرمان ہیں۔"

قاضی شریک نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم امیر المومنین، آپ کا خواب ابراہیمؑ کا خواب ہے اور نہ آپ کا تعبیر دینے والا یوسفؑ ہے تو کیا آپ جھوٹے خوابوں کے بل پر مسلمانوں کی گردنیں اتارنا چاہتے ہیں؟"

مہدی یہ سن کر جھینپ گیا اور قتل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

(الاعتصام ص 353)

مرسلہ: جمیلہ بلوچ، لوہی بلوچستان

فرمانِ مصطفی ﷺ

1۔ جس نے مجھ پر اک بار درود پاک بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے۔

2۔ جو شخص مجھ پر درود پاک پڑھنا بھول گیا۔ وہ جنت کا راستہ بھول گیا۔

3۔ تم جہاں بھی ہو مجھ پر درود پڑھو کہ تمہارا درود مجھ تک پہنچتا ہے۔

4۔ مجھ پر درود پڑھو کثرت سے...... بے شک یہ تمہارے لیے طہارت ہے۔

5۔ جس نے مجھ پر دس مرتبہ صبح اور دس مرتبہ شام درود پاک پڑھا اسے قیامت کے دن شفاعت ملے گی۔

مرسلہ: شمسہ ارشاد ہمدانی، ضلع ہٹیاں بالا

خالدہ نسیم سے ملاقات

آج آپ کی ملاقات افسانہ نگار اور شاعرہ خالدہ نسیم سے کروار ہے ہیں۔ جو رہتی تو لندن میں ہیں مگر پاکستان اپنے وطن میں ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ان کے شوہر مرحوم مایہ ناز ڈاکٹر تھے جو بہت مشہور بھی تھے اور ان کے تینوں بچے بھی ڈاکٹر ہیں...... اور سب شادی شدہ ہیں۔ شاعری ان کی روح کے ساتھ ساتھ ہے......وہ کہیں بھی جائیں...... وہاں کا احوال شاعری میں لکھا کرتی ہیں۔ نثر بھی بہت خوب صورت...... اور عام فہم انداز میں لکھتی ہیں۔ بچوں میں بیٹی کو پڑھنے اور لکھنے کا بھی شوق ہے...... مگر ڈاکٹر تہمینہ کی ابھی تک تمام تحریریں ان کی ڈائری سے باہر نہیں آئی ہیں۔ پاکیزہ کی تمام مصنفات انہیں بے حد پسند ہیں۔ عمیرہ احمد تو بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہنوں کی محفل بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ انجم انصار کے ناول محبت ہم سفر میری کے کرداروں کے لیے انہوں نے بطورِ خاص شاعری کی...... جو اُن کے ناول میں شامل ہے۔

پھول، بچے، اور کتابیں اور پرفیوم بہت پسند ہیں۔ کھانا سادہ مگر اچھا پکا ہوا ہونا چاہیے۔ خود بھی کوکنگ کا شوق ہے۔

آج کل اپنا شاعری کا مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں جو جلد کتابی صورت میں شائع ہوگا۔

تو کیسا لگا، آپ کو خالدہ نسیم سے مل کر۔ بتائیے گا......

دسمبر کی ہوا کے ہاتھ بھیجا ہوا اِک پیغام

اے دسمبر کی یخ بستہ ہواؤ
میرا پیغام اس تک پہنچا آؤ
اسے کہنا!
محبت میں بدگمانی کی اِک
دیوار سی کھڑی ہے
اور کہتے ہیں کہ
بدگمانی کی فضا میں
جذبے مرجاتے ہیں

سو اس دیوار کے مزید
بلند ہونے سے پہلے
جذبوں کے مرنے سے پہلے
تم لوٹ آؤ
تم لوٹ آؤ......

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

منطقی محبتیں

☆ اب ان کی نظر سے ہی دیکھے زمانہ
وہ دیتے ہیں سب مشورے مخلصانہ
جو دن میں ہنسا دیں تو شب کو رُلا دیں
سبھی فیصلے ان کے ہیں منصفانہ
ابھی وقت ہے، سوچ لے میرے ہمدم
ادائیں ستم گر کی ہیں ظالمانہ
انہوں نے ہی درجوں میں بانٹی محبت
کہ ہے عشق جن کا بڑا منطقانہ
وہ ڈھونڈیں ہیں فرصت تمہیں چاہنے کو
تو تم ان پر مرنے کا ڈھونڈو بہانہ
لگا ان کا انداز کچھ ساحرانہ
کیا گھر بدر، حکم! باہر نہ جانا

شاعرہ: نور العین ساحرہ، امریکا

ہنسنا منع ہے

☆ پرائیویٹ میڈیکل کالج میں جب تک طلبہ ہڈی اور کھال کے بارے میں پڑھ کر فارغ ہوتے ہیں۔ اس وقت تک ان کے والدین کی کھال اتر چکی ہوتی ہے۔

☆ یونیورسٹی کے ہاسٹل سے میرے بیٹے کا خط آتا ہے تو بہت سے الفاظ جاننے کے لیے مجھے ڈکشنری دیکھنی پڑتی ہے اور اکثر والدین کو اپنے بیٹے کا خط پا کر اپنا بینک اکاؤنٹ دیکھنا پڑتا ہے۔

☆ ہمارے پڑوسی کا بیٹا شادی نہیں کرتا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے بیچلر ڈگری جو لے رکھی ہے۔

مرسلہ: شبانہ شوکت، حیدر آباد

دل کی باتیں

میرے دل سے کس لیے سب خواہشیں گئیں
صحرا سے روٹھ کر جیسے بارشیں گئیں
کھنچا کھنچا سا رہتا ہے دل زندگی سے اب
جس دن سے مجھ سے ان کی سب نوازشیں گئیں
بے رخی نے ان کی مجھے برف کر دیا
ان کے تصور کی بھی گرمائشیں گئیں
پھونک پھونک کر رکھتے ہیں اس روز سے قدم
کانٹے بچھا کے راہ میں جب آزمائشیں گئیں
اِک دھول سی اڑتی ہے میرے اس مکان میں
اِک شخص کے سنگ گھر کی سب آرائشیں گئیں

شاعرہ: فاطمہ یونس، راولپنڈی

فرق

جگر مراد آبادی سے کسی نے پوچھا۔ "اچھی اور بری شاعری میں کیا فرق ہے؟"

جگر نے جواب دیا۔ "کسی اچھے شاعر کو سزا ملتی ہے تو اس پر کوئی گھٹیا شعر نازل ہوجاتا ہے اور جب کسی اچھے شعر کو سزا ملتی ہے تو وہ کسی گھٹیا شاعر پر نازل ہوجاتا ہے۔"

مرسلہ: طلعت رانا، چیچہ وطنی

غزل

جب تیرا درد میرے ساتھ وفا کرتا ہے
اِک سمندر میری آنکھوں سے بہا کرتا ہے
اس کی باتیں مجھے خوشبو کی طرح لگتی ہیں
پھول جیسے کوئی صحرا میں کھلا کرتا ہے
میرے دوست کی پہچان یہی ہے کافی
وہ ہر اِک شخص کو دانستہ خفا کرتا ہے

اور تو کوئی سبب اس کی محبت کا نہیں
بات اتنی ہے کہ وہ مجھ سے جفا کرتا ہے
جب خزاں آئے تو لوٹ آئے وہ بھی فراز
وہ بہاروں میں ذرا کم ہی ملا کرتا ہے

مرسلہ: فرزانہ جمالی، نواب شاہ

ضروری نوٹ بک

وہ خدا سے بہت قریب ہے جو خوش خلق اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا ہے۔ ملک ایک کھیتی ہے اگر عدل اس کا پاسبان نہ ہو تو کھیتی اجڑ جاتی ہے۔
اپنے آپ کو اتنا ہی ظاہر کر جو تو ہے یا تو وہ ہو جا جو تو اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر انسان جہنم سے اتنا ڈرتا جتنا افلاس سے تو دونوں سے بچ جاتا اگر وہ جنت کی خواہش اتنی ہی رکھتا جتنی دولت کی تو دونوں کو پالیتا اگر آپ تیس برس میں طاقتور اور چالیس برس میں عقل مند نہیں بنے تو آپ کبھی طاقتور اور عقلمند نہیں بن سکتے۔ دنیا کے سمندر سے بے خوف نہ رہ، اس میں بہت سے لوگ غرق ہو چکے ہیں۔ دولت حاصل کرو مگر وہ تمہارے ہاتھ میں رہے، دل پر قبضہ نہ کرنے پائے۔ ریاکار کا لباس صاف مگر دل گندا ہوتا ہے۔

مرسلہ: تانی چوہدری، آکسفورڈ یوکے

بہانے

ماضی کے قصے ہوئے پرانے
آؤ ڈھونڈیں نئے آشیانے
حب الوطنی، عزیز و اقارب
کبھی تھی محبت اب افسانے
قوتِ پرواز پر ہے بھروسا
ملک سے باہر ہیں اب ٹھکانے
جانا ہے ہمیں سات سمندر پار
ماں کی محبت باپ کا حوصلہ آزمانے
ملنا ہے ہمیں کچھ نئے لوگوں سے
پڑھائی، نوکری، سب ہیں بہانے

شاعرہ: خالدہ نسیم، لندن

دسمبر

مہینوں کی پرانی شال اوڑھے
جھیل کے پرانے کنارے پر کھڑا
سیٹی بجا کر چاند کو نیچے بلا رہا ہے
جنوری کے بدن پر
ماتمی تنہائیاں پینٹ کر رہی ہیں
اور نیچے پہاڑی گاؤں میں
نئے برس کا جشن تھا

شاعر: ابرار عمر
مرسلہ: عنبر وسیم گوجرانوالہ

اطمینان قلب

ایک سردار جی کو اپنی بیٹی کے کمرے سے ایک دن سگریٹ ملی تو بہت پریشان ہوئے...... دوسرے دن شراب کی بوتل ملی تو مزید پریشان ہو گئے۔ اس سے اگلے دن اس کے کمرے سے ایک نوجوان برآمد ہوا تو سردار جی اطمینان سے بولے۔
''شکر ہے یہ سب اس لڑکے کا تھا۔''

مرسلہ: سمیرا مجاہد، ٹنڈو آدم

رازداں

ایک صاحب نے شام کی چائے پیتے ہوئے تنہائی میں اپنے لڑکے کو بلا کر کہا۔
''آج تمہاری ٹیچر کی طرف سے مجھے ایک خط ملا ہے۔'' یہ سن کر لڑکا تیزی سے بولا۔
''ٹھیک ہے پاپا اسے رکھ لیں، میں امی کو نہیں بتاؤں گا۔''

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ



جلترنگ

انجم انصار

راج دُلاری

کتنا شوق تھا، انہیں گاڑی خریدنے کا......
یہ ان کی نظروں کا ہی اعجاز تھا کہ انہیں گاڑی میں بیٹھی ہر عورت کے چہرے پر خوش بختی کا لیبل صاف چسپاں نظر آتا تھا۔
گاڑی میں بیٹھی عورت کالی ہوتی یا کانی...... مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا وقار ہوتا ہے۔
ان کا یہ بھی خیال تھا کہ گاڑی خریدنے سے سفید پوشی کا نقاب اتنا دبیز مل جاتا ہے کہ بہت سی بدبختی کی علامتیں خود ہی چھپ جایا کرتی ہیں۔
بنا گاڑی کے وہ کسی تقریب میں جاتیں تو ان کو واپسی پر چوروں کی طرح نکلنا پڑتا تھا۔
سب عزیز، دوست اپنی گاڑیاں...... زن سے لے جاتے اور ان کی اڑاتی خاک میں وہ ذہنی طور پر ملیامیٹ ہو جاتی تھیں۔
میاں کلرک بادشاہ تھے۔
مگر وہ خاصی سلیقہ مند تھیں...... سلائی، کڑھائی اور بنائی سے...... وہ اپنی اچھی خاصی بچت کر لیا کرتیں۔
اور یہی وجہ تھی...... کہ ان کے گھر پر غربت کے سائے منڈلانے کے باوجود...... وہ ایک کھٹارا سی گاڑی خریدنے کے قابل تھیں۔
آخر ان کی روز روز کی بک بک سے عاجز آکر...... ان کے میاں 70 ہزار کی ایک کھٹکتی سی کار خرید لائے۔
''اللہ یہ لائے ہیں آپ......؟'' وہ اسے دیکھ کر دکھ سے بولیں۔
پڑوس کے بچوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر قہقہے لگائے۔
دروازوں سے خواتین نے منہ نکال کر یوں تمسخرانہ انداز میں دیکھا کہ وہ گاڑی نہیں کوئی ٹھیلا لے آئے ہوں، وہ بھی گیا گزرا سا۔
''سنو...... یہ بھی بہت مشکل سے ملی ہے۔
''اس کا مالک باہر جا رہا ہوگا۔'' ان کی بھاوج نے جب گاڑی خریدی تھی...... تو اس قسم کے ہی بیان دیے تھے۔
''نہیں، اس کا مالک...... انتقال کر گیا تھا۔''
''اچھا تو لواحقین میں ترکہ بٹنا ہوگا۔'' اس نے آکر لقمہ دیا۔
''نہیں...... کفن کا انتظام کرنا ہوگا...... ہے ناں!'' وہ غصے میں میاں پر چڑھ دوڑیں۔
''یہ سب تو مجھے نہیں معلوم...... مگر...... گاڑی بیچنے والا مجھ سے چمٹ گیا تھا...... اور ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بولا تھا خدا کے لیے...... تم اس گاڑی کو خرید لو...... اس کی وجہ سے میں کہیں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔''
''ضرور...... وہ تمہارا دشمن ہوگا...... جب ہی تو اس نے یہ گاڑی تمہیں بیچی ہے۔''
''نہیں...... وہ ہمارا دوست ہے...... ہم تو بسوں کے پیچھے بھاگتے تھے...... اب فور ویل والی

گاڑی میں ٹھاٹ سے سفر کریں گے اور تم بیگم صاحبہ کی طرح باہر کہنی نکال کر بھاگتے دوڑتے ٹریفک کو دیکھا کرنا۔"

"مگر یہ تو بہت بدشکل ہے...... اس موئی کی تو کھال بھی پھٹی ہوئی ہے۔"

"ہاں، اس کا کلر ہر جگہ سے پچکا ہوا ہے اور چوٹ کھائی ہوئی بھی ہے۔"

"کیا مطلب......؟" وہ بولائیں۔

"خاصی دکھیا ہے...... یعنی اس کے اوپر جگہ جگہ "ڈینٹ" پڑے ہوئے ہیں۔" میاں نے پانی کا گلاس ایک سانس میں چڑھا کر بتایا۔

"چلو...... کار تو آئی۔" انہوں نے اپنے لرزتے دل کو خود ہی سنبھالا دیا۔

"ہاں...... بس...... کار ہے۔" وہ مسکرائے۔

پہلی دفعہ وہ کسی کی شادی میں گئیں تو خوب اتراہٹ سے میرج ہال کے سامنے اتریں۔ کار کا دروازہ بھی اس زور سے بند کیا...... نہ صرف کئی لوگوں نے مڑ کر دیکھا بلکہ مسند پر بیٹھے دولہا نے گھبرا کے سہرا الٹ دیا۔

وہ کسی کو سلام کرتی، کسی کے سلام کا جواب دیتی...... بڑی ادا سے ہال میں داخل ہوئیں۔

مگر جب ان کی واپسی ہوئی تو انجن نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔

کئی عزیزوں نے دھکا لگایا تو گاڑی میں کچھ "غراہٹ" سی پیدا ہوئی۔

"بھئی...... یہ دھکا اسٹارٹ...... کب سے لے لی؟"

لوگوں کی مبارک باد بھی...... ان کو گالی لگی۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے تک وہ پسینے پسینے ہو چکی تھیں۔

لوگوں کے قہقہے دو دن تک ان کے کانوں میں زہر گھولتے رہے۔

تب اس واقعے سے انہوں نے یہ سبق حاصل کیا کہ جب وہ کسی بھی تقریب میں جاتیں تو اپنی راج دُلاری کار کو جائے تقریب سے فرلانگ بھر پہلے کھڑی کرتیں۔

"کار خریدنے کا فائدہ کیا ہوا آپ کو...... کہ آپ کو اس تک پہنچنے کے لیے میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے۔" ایک دن ہم نے ان کو چوری چھپے اپنی راج دُلاری کار تک جاتے دیکھ لیا۔

"سنو...... بعض چیزیں پردے میں ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"بالکل غلط......" ہم ہنسے۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے اپنی آنکھیں پٹ پٹائیں۔

"آپ یہ کہیے کہ بعض چیزوں کے لیے پردہ بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"جیسے آپ کی راج دُلاری کے لیے...... بھی۔"

تب وہ یوں زور سے ہنسیں...... جیسے کسی گاڑی کا ٹائر...... برسٹ ہو گیا ہو۔

بڑی مشکل ہے

نہ پیسے کی کوئی کمی تھی۔

اور نہ مزاج میں کنجوسی۔

ہر سال رمضان میں عمرے کی سعادت بھی وہ حاصل کیا کرتی تھیں۔

اس کے علاوہ بھی...... وہ گاہے بہ گاہے مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے جانے کی شوقین تھیں۔

اور دبئی جانا تو ہر دوسرے ماہ کا تھا۔ وہاں ان کا ایک بیٹا جو چلا گیا تھا۔

ایک شام...... میں اپنی ساس اور جیٹھانیوں کے ساتھ ان کے ہاں...... مبارک باد دینے گئی تھی۔

ہم چار عورتیں تھیں اور ان کے ہاں شاید گھر میں صرف چار ہی گلاس تھے۔

جیٹھانی...... صورتِ حال پانچ منٹ میں بھانپ لینے والی خاتون......

انہوں نے جھٹ...... کولڈ ڈرنک کے چار گلاسوں کی موجودگی...... اپنے سامنے دیکھنے کے بعد سادہ پانی مانگ لیا۔

اب ان کی بہو آدھے گھنٹے تک گلاس ڈھونڈتی رہی...... تب میں نے چائے کے مگ میں اپنی جیٹھانی کو پانی دیا۔

"بچے بہت شریر ہیں۔ روزانہ ایک گلاس توڑتے ہیں۔" وہ خفت سے کہہ رہی تھیں اور ان کے چہرے کی خجالت مجھے یہ سمجھا رہی تھی...... کہ گھر جانے کے بعد مجھے بھی ایک درجن گلاس خرید کر چھپا کر رکھنے ہوں گے۔

ہاں...... گزشتہ دو ماہ سے ہمارے گھر میں صرف تین گلاس ہیں۔ بچے...... چائے کے مگ میں پانی پی رہے ہیں...... اگر کوئی ناگہانی مہمان آ گئے تو میں کیا کروں گی...... مہمانوں کی تمسخرانہ نظریں تو لہولہان کر دیا کرتی ہیں۔ کیا ایسی صورتِ حال...... آپ کے گھر میں بھی ہوتی ہے؟

شوق کا مول نہیں

آکاش پہ بادل ہیں
پیاری ہیں میری بھابی
پر تھوڑی سی پاگل ہیں
آکاش پہ بادل ہیں

یہ گیت احسان بھائی کی شادی میں لڑکیوں نے چیخ چیخ کر گایا تھا۔

کئی چہرے

ہزاروں پھول کھلتے ہیں
کئی چہرے بھی ملتے ہیں
کئی وعدے بھی کرتے ہیں
دلوں میں بھی اترتے ہیں
وہی دل بھی دکھاتے ہیں
کہ وعدہ بھول جاتے ہیں
بہت چہرے ہیں یادوں میں
رکھوں کس کس کو نظروں میں
بھلا دوں کیوں نہ ہر چہرہ
مٹا دوں کیوں نہ ہر چہرہ
کہ جو مجھ کو ڈراتا ہے
تصور میں ستاتا ہے

کلام: یمنیٰ احمد

مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ انہیں تصویریں کھنچوانے کا شوق واقعی پاگل پنے کی حد تک ہوگا۔

بڑی خالہ اگر تیز ہوتیں تو اسی وقت تاڑ جاتیں کہ جب رشتہ طے ہوا تھا تو لڑکی کی ایک تصویر کے بجائے ان کی اماں نے ان کے تین البم دیے تھے۔

جس میں صرف ان کی ہی تصاویر تھیں۔

اور تصویریں بھی ایک قیامت کی تھیں۔

بالکل بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

کون سا پوز تھا...... جو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

سوتے، جاگتے، ہنستے، روتے...... ہر پوز مقید تھا۔

اس وقت تو سب لوگ بہت خوش ہوئے تھے اور احسان بھائی کا تو ان البموں کے سہارے ہی وقت گزرتا تھا۔

منی اور پپو نے تو بارہا احسان بھائی کو تصویروں سے باتیں کرتے تک دیکھا تھا۔

وہ تصویریں دیکھتے ہوئے کبھی ہنستے...... اور کبھی مسکراتے...... اور ہم چوری چھپے تاڑنے والے یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید جادو کے زور سے وہ تصویر میں سے برآمد بھی ہو جائیں۔

''ہائے بے چارے...... شادی سے پہلے ہی پاگل ہو گئے۔'' ہمیں ان پر خاصا رحم آتا۔

شادی اور ولیمے والے دن بے حیا سے بے حیا لڑکی بھی...... تھوڑا سا شرماتی ضرور ہے۔

بھابی...... بھی شرمائیں...... مگر تصویریں اور مووی بنواتے وقت اپنے لشکارے خود ہی مارتی رہیں۔

کبھی دائیں جانب دیدے گھماتیں۔

کبھی ٹھوڑی پر منہ سجا کر نظریں ترچھی کرتیں۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے...... تو ایک دفعہ خود ہی کھڑے ہو کر احسان بھائی کے کندھے پر اس طرح ہاتھ رکھا...... جیسے ان کی گردن دبا رہی ہوں۔

ان کے پوز کسی طرح ختم نہیں ہو رہے تھے۔

مہمان خواتین دھیرے دھیرے ہنس رہی تھیں اور احسان بھائی بے چارے سراسیمہ سے ہو گئے تھے۔

مگر شادی کے بعد احسان بھائی کا واحد شوق بھی رہ گیا تھا کہ بھابی کی ہر وقت تصویریں کھینچا کرتے۔

آتے جاتے۔

سوتے جاگتے۔

بھاگتے، دوڑتے...... ان کی صرف تصویریں ہی کھینچا کرتی تھیں۔

اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ بھابی لوٹا لے کر اوپر جا رہی تھیں۔

خالہ کے ہاں بیت الخلا مکان کی چھت پر تھا۔ (یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ پرانے لاہور میں رہا کرتے تھے)

احسان بھائی نے جب انہیں اوپر جاتے دیکھا تو نیچے سے ان کی تصویر لے لی۔

بھابی نے خوش ہو کر لوٹے سے ان پر پانی پھینکا۔

جو سارا کا سارا خالہ کے اوپر جا کر گرا۔

وہ تو شکر ہوا کہ وہ اس کو بارش کی پھوار سمجھیں۔

ورنہ تصویریں کھنچوانے کا شوق اسی دن ہوا ہو جاتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہر شوق کی شدت میں کمی آجاتی ہے مگر ان کے ہاں ایسا نہیں ہے۔

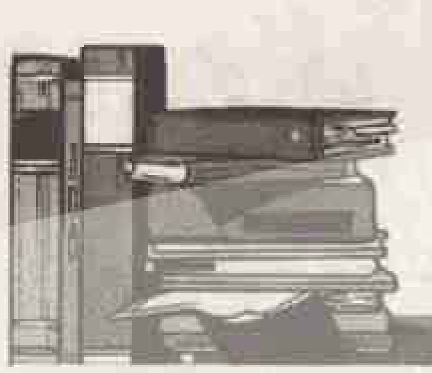
ہاں احسان بھائی...... ادھ موئے ضرور ہو گئے ہیں۔

مگر کیا کریں...... حسین بیوی کا شوق ہے۔

اس کو پورا کرتے رہتے ہیں۔

بیمار ماں کا کتھا، چھالیا تھوڑی ہے جس کو وہ اکثر لانا بھول جاتے ہیں۔

اور بے چاری خالہ کو جب پان کی طلب ہوتی ہے...... تو خالی چونا...... چاٹ کر صبر کیا کرتی ہیں۔



میرا انتخاب

آمنہ حماد

محبت میں کبھی اتنی وحشت ہوتی ہے کہ خود محبت بھی سکون نہیں دیتی...... اتنا تلاطم برپا ہوتا ہے کہ آنکھ سے لہو اُمڈ آئے...... دل جیسے کسی گرداب میں رہتا ہے...... محبوب کی یاد اور یاسیت کا مخصوص رنگ میرا جی کی شاعری کا خاص انداز ہے جو اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔ جس کا انتخاب حفصہ نے کراچی سے کیا ہے۔

تم کون ہو یہ تو بتاؤ ہمیں

تم کون ہو یہ تو بتاؤ ہمیں
کیا تم سپنوں کی مایا ہو
یا اس جیون کی چھایا ہو
یونہی جال میں مت الجھاؤ ہمیں
تم کون ہو یہ تو بتاؤ ہمیں
دھرتی پر پھیلا جنگل ہو
آکاش کا چنچل بادل ہو
یہ پہیلی آج بجھاؤ ہمیں
تم کون ہو یہ تو بتاؤ ہمیں
کیا کبھی نجوگ ہوا
یا آج ہی دل کو روگ ہوا
بولو بھی نہ اب ترساؤ ہمیں
تم کون ہو یہ تو بتاؤ ہمیں
کبھی آپ ہی آگ لگاتی ہو
کبھی آپ ہی اس کو بجھاتی ہو
کیسی ریت ہے آؤ سمجھاؤ ہمیں
تم کون ہو یہ تو بتاؤ ہمیں

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس ایک گوشے کو ویران کر دیتی ہیں جو کسی ایک خاص شخص کے لیے مخصوص ہوتا ہے...... جدائی اور کٹھن فیصلوں کا کچھ ایسا ہی تاثر جون ایلیا کی نظم میں نظر آرہا ہے۔ جس کا انتخاب ثمرینہ نعیم نے کراچی سے کیا ہے۔

تمہارا فیصلہ جاناں

تمہارا فیصلہ جاناں! مجھے بے حد پسند آیا
پسند آنا ہی تھا جاناں
ہمیں اپنے سے اتنی دور تک جانا ہی تھا جاناں
بجا ہے خانماں سوز آرزوؤں، تیرہ امیدوں
سراسر خوں شدہ خوابوں، نوازش گر سرابوں
ہاں سرابوں کی قسم یک سر بجا ہے
اب ہمارا جان و دل کے جاوداں دل جان رشتے کو
اور اس کی زخم خوردہ یاد تک کو بے نیازانہ
بھلا دینا ہی اچھا ہے
وہ سرمایہ، وہ دل سے بے بہا تر جاں کا سرمایہ
گنوا دینا ہی اچھا ہے
زیان جاودانی کے گلہ افروز داغوں کو
بجھا دینا ہی اچھا ہے
تمہارا فیصلہ جاناں مجھے بے حد پسند آیا

کبھی کبھی ہم محبت میں وقت اور فاصلے کے ہندسوں کو بدلتے ہوئے...... اپنی آنکھوں میں اترے خواب بکھرتے ہوئے اور ٹوٹے دیکھتے ہیں

لیکن کچھ کر نہیں پاتے...... محبت کے اتار چڑھاؤ کا یہی انداز سید واثق کی غزل میں نمایاں ہے۔ جس کا انتخاب صفیہ نے جہلم سے کیا ہے۔

غزل

ہجر خوں رُلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے کہاں ہوتے ہو
جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں جیسا
مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
مجھ سے بچھڑے ہو تو محبوبِ نظر ہو کس کے
آج کل کس کو مناتے ہو کہاں ہوتے ہو
شب کی تنہائی میں اکثر یہ خیال آتا ہے
اپنے دکھ کس کو سناتے ہو کہاں ہوتے ہو
سرد راتوں میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں
آگ سی دل میں لگاتے ہو کہاں ہوتے ہو
تم تو خوشیوں کی رفاقت کے لیے بچھڑے تھے
اب اگر اشک بہاتے ہو کہاں ہوتے ہو
ستم کہ لوگ بھی اب یہ سوال کرتے ہیں
اب کم کم نظر آتے ہو کہاں ہوتے ہو

دکھ، درد بے کلی اور چبھن نے جب لفظوں کا روپ اختیار کیا تو شاعری نے جنم لیا...... زندگی میں بعض لمحے ایسے آتے ہیں جب دل پر بوجھ بڑھ جاتا ہے...... ایسے میں شاعری مونس و غم خوار کی حیثیت سے ساتھ دیتی ہے...... امجد اسلام امجد کی یہ نظم بھی کچھ ایسا ہی تاثر دیتی ہے اس کا انتخاب میمونہ عزیز نے کراچی سے کیا ہے۔

نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی
نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اڑ کر
تمہارے قدموں میں آگرے تو
یہ جان لینا وہ استعارہ تھا میرے دل کا
اگر نہ آئے
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پہ نگاہ ڈالو
تو اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلاب کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمہیں ملوں گا
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں
خوشبوؤں میں نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو
تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے
ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال لینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا
کسی ان دیکھے جزیرے پہ رک کر
تم کو صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پر بھی اترنا
اگر کبھی میری یاد آئے.....!

محبت کا دور ماضی یا حال کا محتاج نہیں ہوتا...... لمحۂ محبت ہر وقت آپ کے وجود کا حصہ بن کر آپ

کے ساتھ ہوتا ہے...... کسی کا ساتھ زندگی کے لمحات کو خوب صورت ہی نہیں یادگار بھی بنا دیتا ہے جب کوئی غم یا پریشانی محسوس نہیں ہوتی...... ہر شخص اپنی زندگی میں ایسی ہی ہستی کی آرزو کرتا ہے جس کے ساتھ بتائے لمحے کبھی فراموش نہ ہوں...... محسن نقوی بھی ایسے ہی لمحوں میں گرفتار نظر آ رہے ہیں۔ جسے شگفتہ راحت نے اسلام آباد سے منتخب کیا ہے۔

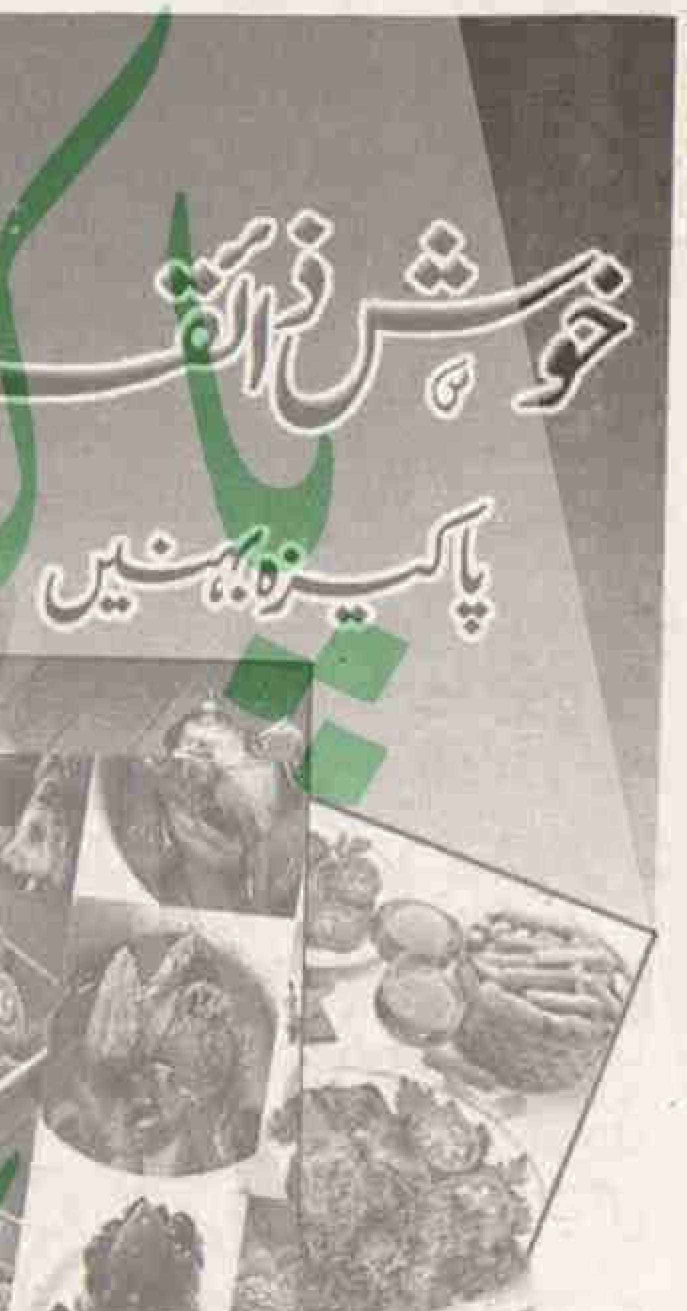
نظم

پلٹ کے دیکھنا چاہو
تو نفرتوں سے اِدھر
دنوں کی راکھ پر راتوں کی یخ ہتھیلی پہ
ہوا کے ناچتے گرداب کی تہوں میں کہیں
بجھا ہوا کوئی لمحہ
کسی چراغ کے داغ
کہ میں زندہ ہوں
کہ میں بھی زندہ ہوں
اپنے اجاڑ دل کی طرح
اجاڑ دل
کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر
ہر اک صبح دہکتے ہیں زخم زخم گلاب
اجاڑ دل کہ جہاں
آج بھی تمہارے بغیر
ہر اک پل میری آنکھوں میں
ڈھل کے ڈھلتا ہے
تپتی رت کی تپش سے
بدن پگھلتا ہے
اجاڑ دل کہ جہاں ڈوبتا ہوا سورج
جبینِ وقت پہ لکھتا ہے
دوریوں کے پیام
پلٹ کے دیکھنا چاہو
تو نفرتوں سے ادھر
درخشاں ہے کب سے ایک ہی نام
وہ نام جس پہ مسلسل ہے اعتماد مجھے
وہ نام لوحِ جاں پہ ابھر کے بولتا ہے
نظر پڑے تو سمجھنا
کہ تم ہو یاد مجھے

زندگی کے سفر میں یادوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے لیکن تمام یادوں میں سے کچھ لمحات زندگی کا حاصل قرار پاتے ہیں...... جو اپنی یاد کے نقش دل پر ثبت کر دیتے ہیں ایسے نقش جو وقت کی دھول سے بھی مٹتے نہیں...... ان لمحوں کی یاد میں ایسی طلسماتی کشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتی ایسے ہی کچھ لمحوں کی یاد کے سحر میں سلیم کوثر بھی جکڑے نظر آ رہے ہیں۔ اسے سعدیہ نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

ایک بھولی ہوئی یاد

تم بھی مجھ سے سارے رشتے توڑ چکی تھیں
میں نے بھی اک دوسرا رستہ دیکھ لیا تھا
تم نے مجھ سے عہد لیا تھا
میں نے بھی اک بات کہی تھی
تم نے میری سب تصویریں واپس دے کر
اپنے خط مجھ سے مانگے تھے
لیکن آج رسالے میں
اپنا اک شعر تمہارے نام سے
دیکھا ہے
تو سوچ رہا ہوں
چہروں کی پہچان ادھوری رہ جائے
تو یادیں آئینہ بن جاتی ہیں



مچھلی کے کباب

اشیا﴾ مچھلی کا قیمہ، آدھا کلو۔ آلو، آدھا کلو۔ زیرہ، ایک چمچ۔ کٹی لال مرچ، دو چمچے۔ نمک، ڈیڑھ چمچ یا حسبِ ذائقہ۔ ہری پیاز ایک عدد، ہری مرچ تین عدد، ہرا دھنیا چند پتے۔ کارن فلور، آدھی پیالی۔ لیموں، دو عدد۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ لہسن ثابت، چار جوے۔

ترکیب﴾ مچھلی بون لیس لے لیں اور اس کو ثابت لہسن کے ساتھ ایک ابال دے دیں پھر مچھلی کے ٹکڑوں کو میش کرلیں۔ آلو ابال کر گرم گرم میش کریں۔ اب آلو اور مچھلی میں تمام مسالے ڈال دیں۔ کارن فلور ڈالیں۔ لیموں اس میں نچوڑ لیں اور کباب یا رول کی شکل بنالیں۔ پندرہ منٹ فریج میں رکھ کر تیل میں فرائی کریں اور سلاد اور چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

راحیلہ انوار...... راول پنڈی

دہی مچھلی

اشیا﴾ مچھلی کے قتلے، آدھا کلو۔ دہی، آدھا کلو۔ سرکہ یا لیموں، ایک عدد یا ایک چمچ۔ لال مرچ پسی ڈیڑھ چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سویا ساس، چلی ساس، دو دو چمچ۔ پسا گرم مسالا، ایک چمچ۔ ہری مرچ، چھ سے آٹھ، کڑی پتا، چند پتے۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب﴾ مچھلی کو نمک یا بیسن سے دھولیں پھر دہی میں ہری مرچ اور کڑی پتے کے سوا تمام مسالے ملادیں اور آدھے گھنٹے تک رکھ دیں۔ اب تیل گرم کریں پتیلی میں اور ہری مرچ لمبائی میں کاٹ کر کڑی پتے کے ساتھ تیل میں تل لیں۔ ہری مرچ اور کڑی پتا تیل سے باہر نکال لیں اور اسی تیل میں مچھلی دہی سمیت شامل کردیں۔ پتیلی میں بار بار چمچہ نہ چلائیں، پانی خشک ہونے پر مچھلی کے سالن کو ایک پھیلی ہوئی ڈش میں نکالیں اور اوپر سے تلی ہوئی ہری مرچوں اور کڑی پتے سے سجا کر پیش کریں۔

میمونہ عزیز...... اسلام آباد

بیسن کی روٹی

اشیا﴾ بیسن، دو پیالی۔ پیاز، ایک چھوٹی۔ ہرا دھنیا، تھوڑا سا۔ ہری مرچیں، دو عدد۔ کٹی لال مرچ، ایک چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ گھی یا مکھن یا پانی، حسبِ ضرورت۔ گیہوں کا آٹا، آدھی پیالی۔

ترکیب﴾ ایک برتن میں دونوں آٹے ڈال کر نمک مرچ ڈالیں اور ہرا دھنیا، ہری مرچ، پیاز باریک کاٹ کر شامل کریں اور پانی سے گوندھ لیں۔ شروع میں کم پانی ڈالیں آٹا ذرا سا سخت گوندھیں۔ پانچ منٹ بعد چھوٹے گول پیڑے بنا کر احتیاط سے گول روٹی بنالیں۔ بیسن کی روٹی کو صافی یا صاف کپڑے سے سینکیں اور ہر روٹی پر پلیٹ میں رکھ کر گھی یا مکھن لگائیں۔ ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ٹماٹر کی چٹنی

اشیا﴾ ٹماٹر، چار عدد بڑے سائز کے۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ کلونجی، آدھا چمچ۔ سرکہ، ایک چمچ۔ کٹی لال مرچ، ایک چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ہری مرچ، تین عدد۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ پانی، آدھی پیالی۔

ترکیب﴾ ٹماٹر دھو کر باریک کاٹ لیں۔ پیاز بھی باریک کاٹ لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال دیں۔ جب پیاز ذرا کچی پکی ہوجائے تو ٹماٹر، کلونجی، زیرہ، نمک، مرچ ڈال دیں۔ دو منٹ چلانے کے بعد پانی شامل کردیں۔ پانی خشک ہونے کے بعد سرکہ ڈال دیں۔ ڈش میں نکال کر ہری مرچ کاٹ کر سرو کریں۔

ہرا دھنیا کی چٹنی

اشیا﴾ ہرا دھنیا، ایک گڈی۔ ہری مرچ، پانچ عدد۔ لہسن، چار جوے۔ کٹی لال مرچ، ایک چمچ۔ زیرہ، ایک چمچ۔ نمک، حسبِ ضرورت۔

ترکیب﴾ ہرا دھنیا اچھی طرح دھولیں پھر باریک کاٹ کر تمام اجزا کے ساتھ پیس لیں۔ مزے دار چٹنی تیار ہے۔ چاہیں تو ایک لیموں کا رس شامل کردیں۔

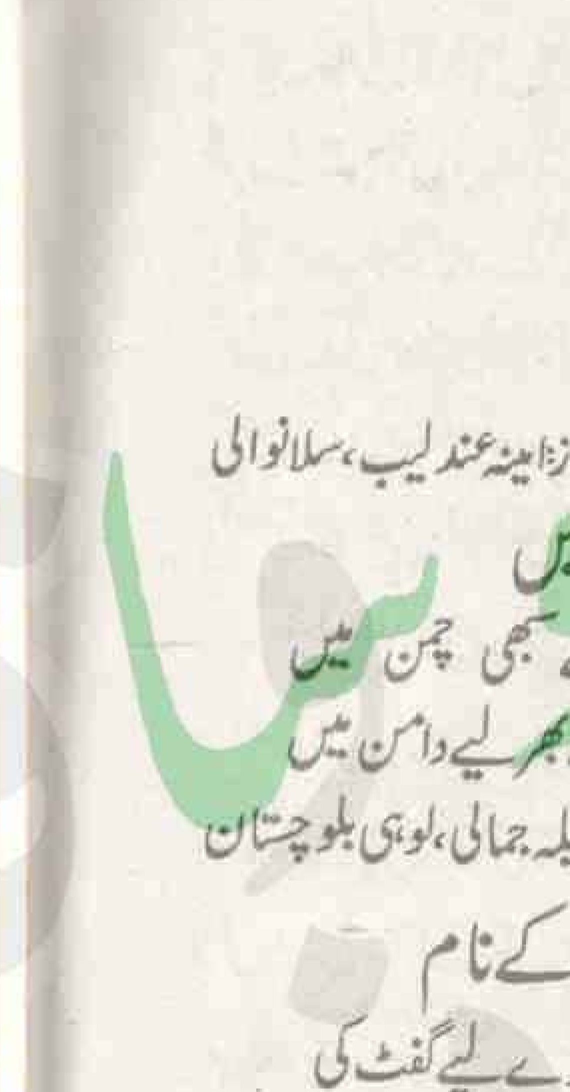
رضوانہ سمیع...... کوئٹہ

بڑے گوشت کے پسندے

اشیا﴾ پسندے، ایک کلو۔ گھی، ایک پاؤ۔ سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، ڈیڑھ پاؤ۔ نمک، لال مرچ، حسبِ ذائقہ۔ خشخاش، چائے کا ایک چمچ۔ چنے بھنے ہوئے، ایک بڑا چمچ۔ کچا پپیتا، ایک ٹکڑا۔ دھنیا، آدھا چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ زیرہ، ایک چٹکی۔ کالی مرچ، بارہ دانے۔ لونگ، چار عدد۔ ادرک، آدھی چھٹانک۔ دارچینی، ایک چھوٹا ٹکڑا۔ بڑی الائچی، ایک عدد۔

ترکیب﴾ پسندوں پر نمک اور سرکہ مل دیں۔ کالی مرچ، لونگ، لہسن، دارچینی اور الائچی پیس لیں اور دہی کو پھینٹ کر اس میں ملادیں۔ نمک، لال مرچ، خشخاش، پپیتا اور بھنے ہوئے چنے بھی پیس کر دہی میں اچھی طرح ملادیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر گھول لیں۔ اب پسندے اس دہی میں ڈال دیں۔ پسندوں پر دہی اچھی طرح لگ جائے۔ آدھے گھنٹے تک یوں ہی رہنے دیں۔ دیگچی میں گھی کڑکڑائیں۔ اس میں پیاز کے باریک لچھے بادامی رنگ کے تل لیں پھر ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر کا پانی خشک ہوجائے اور ٹماٹر گل کر حل ہوجائیں تو زیرہ ڈال کر بھونیں اس کے بعد دہی سمیت پسندے ڈال دیں اور ڈھکن مضبوطی سے بند کردیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں پھر بھون لیں۔ پانی خشک ہوجائے اور مسالا گھی چھوڑ دے تو اتار لیں۔ ذائقے دار اور لذیذ پسندے خود کھائیں اور دوسروں کی بھی تواضع کریں۔

شائستہ جبیں...... پشاور



یہ تو جاپانی کہاوت ہے اگر کوئی کام ایک شخص نہیں کرسکتا تو یہ سوچو کہ تم اسے ضرور کرسکتے ہو اور اگر کوئی کسی کام کے بارے میں یہ کہے کہ وہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تب تو تم اسے ہر حال میں کر کے دکھاؤ اور یہ پاکستانی عوامی سوچ ہے۔ اگر کوئی ایک کام کرسکتا ہے تو اسی کو کرنے دو۔ تم مت اس کے بارے میں سوچو۔ اگر کوئی کام کوئی بھی نہیں کرسکتا تو بات صاف ظاہر ہے کہ تمہیں بھی اپنا وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

از...... سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی

خوشگوار زندگی کا راز

وہ ہمیشہ وہی کرتا ہے جو اس کی بیوی چاہتی ہے اور اس کی بیوی وہی کرتی ہے جو وہ خود چاہتی ہے۔

از...... منور شہزادی، گوجرانوالہ

دوست کے نام

ہزاروں چہروں میں
تیری شباہت تو
ملی مجھ کو
اے دوست!
پر دل کی مرضی ہے اگر
تو ہی نہیں تو
کوئی تجھ سا بھی نہیں

از: امینہ عندلیب، سلانوالی

دامن میں

پھول چننے رکے تھے سبھی چمن میں
ہم نے مگر دکھ کے کانٹے بھر لیے دامن میں

از...... جمیلہ جمالی، لوہی بلوچستان

سپاس گل کے نام

تم نے اپنی نئی بک ہمارے لیے گفٹ کی
چلو چاہت نبھائیں گے جو کہ ہمارے
نام سے انتساب تھا بے حد شکریہ
تم مجھے بے حد عزیز ہو اللہ تعالیٰ
تمہیں زندگی کی ہر خوشی سے نوازے آمین
تمہاری دوست اینڈ آپی
فریدہ جاوید فری، لاہور

جدائی

یہ ماہ و سال پر پھیلیں
کٹھن گھڑیاں جدائی کی
گنوں۔ بے سود لمحوں کو
نہیں ممکن مگر پھر بھی
جدائی میں جو گزرا وقت
ہوئی کم زندگی اتنی
بچھڑ کر تم سے یہ جانا
نہیں ہے زندگی کچھ بھی
کہاں تھی میں کہاں ہوں اب
گریزاں اپنا سایہ بھی

دھڑکتا ہی نہیں اب دل
خاموشی چار سو تنی

شاعرہ...... خالدہ تسیم، لندن

کب

تیرے خیال کی لو تن سے جب اترتی ہے
بڑی خوشی سے میرے آنگن میں شب اترتی ہے
تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانوں کی لمحوں میں کب اترتی ہے

از...... صبا نور، لیہ

ایسا بھی ہوتا ہے

مالکن ملازمہ سے...... "یہ تم تین دن سے بغیر بتائے کہاں غائب تھیں"۔

ملازمہ...... "میں نے فیس بک میں بتا تو دیا تھا کہ دو دن کے لیے گاؤں جا رہی ہوں۔ صاحب نے تو جواب بھی دیا تھا کہ آئی ول مس یو کم سون ہنی ٹیک کیئر"۔

از: فرزانہ جمالی، نواب شاہ

کاش کوئی تو

جو مجھے اتنا بتا جائے
کہ انجانے راستوں
میں
چھوڑ کر اس زندگی کے سفر میں
تنہا چھوڑ کر جانے والا
میرے دل کے راستوں میں
اپنا فسانہ محبت کا سنا کر
مجھے اپنا بنا جائے

شاعرہ: رفعت خادم حسین
شہراوستہ محمد، بلوچستان

بیل

تیرا مجھ میں ہونا ایسا
جیسے تل میں تیل
کوئی تو مجھ سے لپٹی دیکھے
تیرے عشق کی بیل......

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

کاش

کوئی تو ایسا ہو
شانے پہ جس کے
رکھ کے سر
دکھ سارے بہا دیں
کرب دل کا سنا دیں

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

یاد

کوئی رت ہو کوئی موسم
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کو
سدا آباد رکھتے ہیں
ہماری شام غم دیکھو
نگاہوں کو بھی نم دیکھو
تو کیا جانے تو کیا سمجھے
جو ہم فریاد رکھتے ہیں

از...... تانی چوہدری، آکسفورڈ، یوکے

☆☆☆

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ زاہدہ بدر...... لاہور
بچھڑ کے مجھ سے کبھی تو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے
اسے گنوا کے میں زندہ ہوں اس طرح محسنؔ
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

☆ سحر زمان...... چکوال
نامرادانِ محبت کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں

☆ نیلوفر...... پیچہ وطنی
تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

☆ سلطانہ اختر...... حیدر آباد
نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

☆ فرحین آفتاب...... کوئٹہ
کاش وہ وقت بھی آئے کہ میں اپنے گھر میں
لوٹ کر آؤں، تجھے سامنے بیٹھا دیکھوں

☆ راحیلہ بیگ...... فیصل آباد
تمہارا کیا ہے تمہاری تو ایک کشتی تھی
ہمارے ہاتھ سے دریا گیا کنارہ گیا

☆ نعیمہ جبیں...... صادق آباد
خامشی ہی میں عافیت ہے فرازؔ
جب کوئی اپنا ہم زباں نہ ملے

☆ ناہید غفار...... سیالکوٹ
دنیا میں اب خلوص ہے بس مصلحت کا نام



بے لوث دوستی کے زمانے گزر گئے

☆ عالیہ ہما...... اوکاڑہ
ابھی پایا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو بھی دیا
اپنی عادت ہے ہر کام میں عجلت کرنا

☆ شمائلہ...... جہلم
زمیں کو میں نے کبھی آسماں نہ ہونے دیا
متاعِ خاک کو یوں رائگاں نہ ہونے دیا

☆ فرخندہ ریاض...... میاں چنوں
بھول جانے کا تجھے کیسے تصور کرلوں
میری ہر سانس سے یادیں تری وابستہ ہیں

☆ ثمرینہ نعیم...... کراچی
لب پہ آئے جو قتیلؔ اسمِ گرامی ان کا
چاندنی سی مری آنکھوں میں بکھر جاتی ہے

☆ سعدیہ شفیق...... گوجرانوالہ
نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کرلوں

☆ ماہ نور خان...... پشاور
پھول لمحوں کے مسافر خوشبوئیں خانہ بدوش
وقت کا دستِ ستم یوں مجھ کو تنہا کر گیا

☆ حفصہ عزیز...... کراچی
شکوہ تو ایک چھیڑ ہے لیکن حقیقتاً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

☆ ارم فراز...... راول پنڈی
مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
مری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے یہ برا ہوا

☆ نوشین رفیق...... اسلام آباد
تحریروں میں کہاں سمٹتے ہیں دلوں کے درد
بس یونہی دل کو بہلا رہے ہیں ان کاغذوں کے ساتھ

☆ ساجدہ شاہ...... نارووال
ہر لمحہ زندگی کا محبت میں اے سحرؔ
جذبِ جنوں کے ساتھ عبادت سے کم نہیں

☆ رفعیہ ناز...... چکوال
وہ اِک لمحہ جو منسوب تیرے ہجر سے تھا
اس اِک لمحے میں صدیاں گزار بیٹھے ہیں

☆ عفت ریاض...... جہلم
ہمیں یاد ہو تو سنائیں بھی ذرا دھیان ہو تو بتائیں بھی
کہ وہ دل جو محرمِ راز تھا کہاں رسم و راہ میں جل بجھا

☆ شائستہ قریشی...... لاہور
ایک وعدہ ہے جسے بھول گیا ہے کوئی
اک امانت ہے جو یادوں میں لیے پھرتا ہوں

☆ ارم...... حیدر آباد
پہلے مجھ سے جدا ہوا اور پھر
عکس نے آئینے سے ہجرت کی

☆ عطیہ سرور...... کراچی
ایک نہ ایک دن ہجر کا موسم گزر ہی جائے گا
روک سکتا ہے کوئی کب وقت کی رفتار کو

☆ نوشین ناز...... میر پور خاص
پھر گہرے پانیوں کی جانب سفر ہے میرا
پھر ڈوبنے چلی ہوں گردابِ آگہی میں

☆ افشین...... کراچی
سفر کا ساتھ ہے یہ منزلوں کا ساتھ نہیں
گزر ہی جائیں گے لمحے حساب رہنے دو
یہ خامشی بھی تمہاری انا کا پردہ ہے
سوال کرتے رہو اور جواب رہنے دو

☆ خالدہ ریاض...... چکوال
کسی کو کیسے بتائیں بھلا کہ ہم خود بھی
ترے بچھڑنے کے اسباب کم ہی جانتے ہیں

☆ نازش رحیم...... جہلم
ناگہاں ہم دل زدوں کو ڈھونڈ لے گی وہ نظر
اور کسی بھی رنگ میں ایجاد کردے گی ہمیں

☆ ارم آفتاب...... کوئٹہ
لہروں میں بھی گرہ پڑتی ہے جیسے دل میں
دریا کے سب بھید نہیں کھلتے پتوار کے ساتھ

☆ حمیرا اقبال...... کراچی
بہت دنوں میں کہیں ہجرِ ماہ و سال کے بعد
رکا ہوا ہے زمانہ ترے وصال کے بعد
ہم اہلِ خواب کی مجبوریاں سمجھتے ہیں
سو ہم نے کچھ نہیں سوچا ترے خیال کے بعد

☆ غزالہ رحمٰن...... ہری پور ہزارہ
شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو پکارتا ہوں
جو قافلہ ہم سفر تھا میرا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ

☆ نازیہ کنول...... حیدر آباد
مجھ سے بچھڑا تھا وہ پہلے بھی مگر
اب کے یہ زخم نیا ہو جیسے
یوں بہت ہنس کے ملا تھا لیکن
دل ہی دل میں وہ خفا ہو جیسے



روحانی مشورے

ادارہ

نظرِ بد سے بچاؤ کے لیے مجرب دعائیں

۱۔سورۂ قلم آیت (۵۲۔۵۱)

وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِ ھِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ وَمَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

ترجمہ: جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔ یہ دعا طاق اعداد میں پڑھ کر پھونکیں انشاءاللہ نظر کا اثر جاتا رہے گا۔

۲۔جب کسی چیز پر اپنی نظر لگ جانے کا اندیشہ ہو تو پڑھیں اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلَیْهِ ۝

۳۔ابن عباس کی یہ روایت احادیث میں آئی ہے کہ نبی ﷺ اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے۔

اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَامَّةٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّامَّةٍ

ترجمہ: میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظرِ بد سے۔

(مسند احمد، ترمذی ابن ماجہ بخاری)

۴۔سورۂ بقرہ آیت ۲۷۰

وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

ترجمہ: اور جو خرچ کرو گے کوئی خیرات یا قبول کرو گے کوئی منت سو اللہ کو معلوم ہے اور گنہگاروں کا کوئی نہیں مددگار۔

۵۔سورۂ طارق پارہ ۳۰ میں ہے جو نظرِ بد سے بچاؤ کے لیے پڑھی جاتی ہے۔

بچے بدتمیز ہیں

اپنے بچوں کی بدتمیزی کا صحیح معنوں میں اندازہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب آپ کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہوں اور بچے اپنی من مانی کا مظاہرہ کر رہے ہوں اور مہمان کے ہونٹوں پر بکھری تمسخرانہ مسکراہٹ آپ کا دل جلا رہی ہو یا آپ کے بچے کسی کے گھر گئے ہوں اور کسی طرح قابو میں نہ آ رہے ہوں۔ گھر میں خوشامدوں سے کوئی چیز چکھنے والے بچے دوسرے کے گھر میں اشیائے خورونوش پر ٹوٹ پڑے ہوں...... اور میزبان متوحش نظروں سے آپ کے بچوں کو کھا جانے والے انداز میں دیکھ کر ہذیانی انداز میں مسکرا رہے ہوں۔ بعض گھرانوں میں تین سے لے کر چودہ سال تک کے بچے اتنے بدتمیز نظر آتے ہیں کہ اکثر لوگ ایسے بچوں کو دیکھ کر خوف زدہ سے ہو جاتے ہیں۔

والدین کی پریشانی کتنی بڑی ہوتی ہے وہ تو بتانے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ ایسے تمام بچوں کے والدین اپنے بچوں کے دوست بنیں ان کے دوست بن کر ہی ان کی باتیں سنیں۔ ان کے ساتھ ایسے گیم کھیلیں۔ جس میں مصروف ہو کر ان کی اتھا چیخ والی مصروفیت میں کمی آئے اور رات کو جب وہ گہری نیند میں ہوں تو ان کے سرہانے کھڑے ہو کر اتنی آواز میں کہ ان کی آنکھ نہ کھلے اکیس مرتبہ سورۂ بروج کی آیت نمبر ۲۱،۲۲ اول آخر تین، تین مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر بچوں پر دم کر دیں اور دعا کریں۔ یہ عمل چالیس دن جاری رکھیں۔ انشاءاللہ بچوں پر ضرور فرق پڑے گا۔

بچے آپس میں لڑتے ہیں

اکثر گھرانوں کے بچے، اسکول میں پڑھتے ہوں، کالج میں یا یونیورسٹی میں...... ان میں آپس میں اتنی لڑائیاں ہوتی ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ میری شرٹ کیوں پہن لی، میری بائیک کو کیوں ہاتھ لگایا، میرے کمرے میں کیوں آئے، میری کرسی پر کیوں بیٹھے، میری بات میں کیوں بولے یا کوئی بھی معمولی بات جس کو وہ غیر معمولی بنانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان کی آپس کی لڑائیاں والدین کی زندگی کو عذاب بنا دیا کرتی ہیں۔ جب بچے گہری نیند سو جائیں تو ان کے سرہانے سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۲۸ اول آخر تین، تین مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر دم کریں۔ اور بچوں کو کبھی اشتعال میں نہ آنے دیں۔ کسی کی بات کسی کو نہ بتائیں۔ اگر بات بھی کریں تو تعریف کی ہو...... کہ تمہاری بہن تمہاری تعریف کر رہی تھی یا تمہارا بھائی تو تمہارے لیے بڑے اچھے خیالات رکھتا ہے۔ تم خواہ مخواہ اس سے لڑا کرتے ہو۔ یہ مائیں ہی ہوتی ہیں جو اپنے بچوں کو یکجا رکھنے میں معاون ہوتی ہیں اور وہ بھی مائیں ہوتی ہیں جن کی بے وقوفی کے طفیل سگے بہن بھائی (عمر کے کسی بھی حصے میں) ایک دوسرے کی شکلوں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ ان پر بھروسا نہیں کیا کرتے۔ اس لیے کبھی اپنے بچوں کے معمولی سے بھی راز ایک دوسرے کے سامنے ظاہر نہ کریں۔

شوابے ہومیو کلینک



آپ کی صحت میں حائل رکاوٹیں اوران کا حل

محترم قارئین!

ا۔آپ نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہوگا جو مستقلاً ڈاکٹروں کے ہاں نظر آتے ہیں یا جاتے رہتے ہیں۔

۲۔کچھ لوگ ایسے بھی آپ کے علم میں ہوں گے جو آج ایک ڈاکٹر کے ہاں کل دوسرے اور پھر تیسرے ڈاکٹر کے یہاں جاتے ہوں گے۔

اس تمام بحث میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ جلدی ٹھیک کیوں نہیں ہوتے؟

میں نے اپنے تجربے و مشاہدے میں بارہا اس بات کو نوٹ کیا ہے کہ ہمارے ہاں عموماً لوگ یعنی مریض علاج کا مفہوم نہیں جانتے۔جس کی وجہ سے نہ وہ کسی سے صحیح طور پر علاج کرواسکتے ہیں اور نہ ان کا صحیح علاج ہوتا ہے۔اس ماہ اس مسئلے پر ہم آپ سے بات کریں گے۔

۳۔جس معالج سے آپ کو اپنی بیماری کا علاج کرانا مقصود ہو اس کا سوچ سمجھ کر انتخاب کریں۔

ا۔انتخاب کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ باقاعدہ کوالیفائیڈ اور حکومت پاکستان سے رجسٹرڈ ہو۔ ۲۔اس پر بھرپور اعتماد کریں کہ وہ آپ کا علاج کرسکتا ہے۔ ۳۔اس کو اپنے مرض کے متعلق مکمل معلومات دیں یعنی (۱) اپنا حال بتائیں (۲) معائنہ کروائیں اگر ضروری ہو (۳) پیتھالوجیکل رپورٹس سے متعلق معلومات دیں وغیرہ۔ ۴۔معالج جو سوال پوچھے اس کا جواب بالکل سچ دیں، ٹالنے والا یا گول مول جواب نہ دیں۔ ۵۔اپنے معالج سے کسی بھی قسم کی بات کرتے وقت نہ جھجکیں نہ شرمائیں بلکہ پوری ایمانداری سے بتائیں۔ ۶۔معالج آپ کو جو ہدایت دے اور دوائی دے اور اس کو کھانے کا جو طریقہ کار بیان کرے بالکل اسی طرح عمل کریں۔جو احتیاطیں اور پرہیز کہے اس پر سختی سے عمل کریں اور وہ جب آپ کو بلائے اسے جاکر دکھائیں اس میں توقف نہ کریں۔

اس رجسٹرڈ کوالیفائیڈ ڈاکٹر سے دوائی لینے کے بعد کیا صورت ہوسکتی ہے؟

دوائی استعمال کرنے کے بعد ۴ صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ا۔مرض میں کمی واقع ہوگی یعنی مرض میں افاقہ ہوگا۔ ۲۔مرض ختم ہوجائے گا۔ ۳۔مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوگا۔ ۴۔مرض بڑھا ہوا محسوس ہوگا۔ان صورتوں میں کیا کرنا چاہیے؟

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جنوری 2011

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:

ہر صورت میں آپ اپنے معالج سے دوبارہ ملیں تاکہ وہ اس بات کو معلوم کرسکے کہ

ا۔آپ کو مزید دوائی کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ۲۔وہی دوائی دینی ہے یا۔ ۳۔تبدیلی کرنی ہے یا۔ ۴۔کچھ اور تشخیص کے ٹیسٹ کروانے ہیں۔

ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی دیکھا گیا ہے کہ پھر بھی جلد ٹھیک نہیں ہو پاتے اس کی کیا وجوہات ہوسکتی ہیں۔

ا۔مریض نے معالج سے اپنی کیفیت صحیح طور پر بیان نہیں کی یعنی اس نے کچھ باتیں چھپائیں کچھ کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا، کچھ بھول گیا، کچھ شرم میں رہ گئیں۔

۲۔مریض نے ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کیا یعنی دوا کو جس طرح استعمال کرنا تھا نہ کیا جو پرہیز و احتیاطیں بتائی تھیں ان پر عمل نہیں کیا۔بے قاعدگی سے علاج کرایا، طبیعت ذرا سنبھلی تو چھوڑ دیا بگڑی تو پھر دوڑے۔

۳۔معالج نے مریض کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔اسے جو پوچھنا چاہیے تھا وہ اس نے نہیں پوچھا، اسے جس چیز کا معائنہ کرنا چاہیے تھا اس نے نہیں کیا، اسے جو ٹیسٹ وغیرہ کرانے تھے وہ نہیں کرائے، اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔

۴۔صحیح سمجھا لیکن دوا صحیح تجویز نہ ہوسکی۔دوا نے کام نہیں کیا۔

۵۔دوا دیر سے کام کرتی ہے۔کیونکہ مرض بہت زیادہ بگڑا ہوا ہے۔مثلاً دمہ، شوگر، بلڈ پریشر وغیرہ۔

۶۔اینٹی بائیوٹک اور کارٹی زون ادویات کا استعمال یا خود دواؤں کا استعمال کرنا۔یہ وہ چیزیں ہیں جن پر مریض و معالج دونوں تھوڑی سی توجہ سے قابو پاسکتے ہیں۔

کچھ امراض مثلاً دمہ، ٹی بی، شوگر........، بلڈ پریشر، رسولیاں، جلدی بیماریاں، دل کی تکالیف، جوڑوں کا درد Arthritis ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیتے اور اگر ٹھیک ہو بھی جاتے ہیں تو بہت ہی تکلیف کے بعد اور ایک لمبے عرصہ بعد، ایسا کیوں ہے؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے سیب کی مثال لیں کہ سیب جب تک درخت پر لگا ہوا ہوتا ہے اس وقت تک وہ تروتازہ رہتا ہے اور مناسب روشنی، پانی، ہوا ملتی رہتی ہے پھر جب اس کو توڑ لیا جاتا ہے تو پہلے اس کی چمک پر اثر پڑتا، پھر رنگت پر اور پھر اس میں گول نشان سا بنتا ہے جو اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ اب گلنے سڑنے کا عمل شروع ہوگیا ہے۔

ایک زندہ جسم اور ایک مردہ جسم میں کیا فرق ہوتا ہے۔یقیناً اس میں آپ کہیں گے کہ مردہ جسم سے روح نکل جاتی ہے تو جسم مردہ ہوجاتا ہے۔روح کیا ہے روح ایک نظر نہ آنے والی قوت ہے جس کی بدولت ہم اپنے کام کرتے ہیں کھاتے پیتے ہیں، ہمارا جسم بڑھتا ہے، قائم رہتا ہے اور جب یہ قوت (روح) جسم سے الگ کردی جاتی ہے تو انسان مردہ ہوجاتا ہے اور اس کا جسم گلنے سڑنے لگتا ہے۔واضح رہے کہ جراثیم پہلے بھی تھے لیکن زندگی کی حالت میں ایسا نہیں ہوا تھا جبکہ مردہ حالت میں معاملہ بالکل الگ ہوگیا۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے جسم کی نشوونما، اس کے امور کی انجام دہی اور بیماریوں سے حفاظت کے لیے ایک روح جیسی قوت جس کو ہم قوتِ حیات کہہ سکتے ہیں جب تک صحیح حالت میں

رہتی ہے ہم صحیح رہتے ہیں اور یہ خراب ہوتی ہے تو پھر ہم یعنی جسم بھی خرابی کی طرف چلا جاتا ہے۔

جس طرح قوت حیات (روح) کوئی مادی شے نہیں ہے اسی طرح بیماری بھی کوئی مادی شے نہیں اور براہِ راست اس پر کسی مادی شے کا اثر نہیں ہوگا لیکن بلاواسطہ ہوگا اور اس میں ہماری سوچ کا کردار بھی بڑا اہم ہوگا۔

کیونکہ درحقیقت غلط سوچ، تفکرات، ذہنی دباؤ قوتِ حیات کو بے انتہا متاثر کرتے ہیں جس کا ردِعمل ہمارے جسم پر ہوتا ہے۔ خارش ہوتی ہے، تیزابیت بڑھتی ہے، قبض رہتا ہے، بھوک صحیح نہیں لگتی، جسم کے غدود جنسی غدود صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔ ڈاکٹر ہانمن جو بانی ہومیو پیتھک طریقہ علاج ہیں اس حالت کو "سورا" Psora کا نام دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا کیفیات بھی کسی بڑی بیماری کی طرف لے جاتی ہیں۔ اگر ہم اس کا صحیح طور پر علاج کرائیں اس کے لیے ہومیو پیتھی میں Anti Psoric Medicines (دافع سورا ادویات) ہوتی ہیں جن کے استعمال سے یہ مرض ختم ہوجاتا ہے اور اگر یہ مرض جسم میں موجود رہے تو یہ مزید امراض کا سبب بنتا ہے کیونکہ درحقیقت یہ ایک زمین تیار کرتا جو زرخیز ہوتی ہے اس لیے اسے اُم الامراض کہتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ یہ نسل درنسل منتقل ہوتا ہے۔ ایک اور مرض جسے سفلس Syphlis کہتے ہیں یہ بھی خاندانی ہوسکتا ہے اور نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ اس میں مبتلا مریض کی صحت زیادہ اچھی نہیں ہوگی۔ ذہنی طور پر بھی کمزور ہوگا، ہڈیوں میں درد کی شکایت ہوگی۔ جسم پر ایسے ابھار ہوں گے جن میں سے پیپ نکلتی ہوگی۔

یہ مرض کسی خراب عورت یا مرد سے مباشرت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ ایسے امراض کو Anti Syphlitic میڈیسن دے کر ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور مرض سائیکوسس Sycocis ہے جو گنوریا جنسی بیماری کے دب جانے کے بعد بھی مسوں، سوجے ہوئے غدود و ابھاروں وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

ان امراض کو Anti Sycotic ادویات دے کر ٹھیک کیا جاسکتا ہے بصورت دیگر یہ بھی نسل درنسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یہ امراض صرف علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پیچیدہ امراض بناتے ہیں۔ مثلاً السر، کینسر، ٹی بی، دمہ، ایڈز، رسولیاں، ناک کا گوشت بڑھنا، ٹانسلز وذہنی امراض، گٹھیا (Rehumatism) شوگر، وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ایسا مریض جو ان تینوں یا کسی دو امراض (میازم) میں مبتلا ہو تو وہ جلدی ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیوں؟ وہ اس طرح کہ کئی چھوٹے بڑے امراض جسم میں جمع ہوتے رہتے ہیں لیکن جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ جسم پر زیادہ اثر دکھاتا ہے اور اس کی وجہ سے مریض بھی زیادہ بے چین رہتا ہے لہٰذا وہ دیگر تمام تکالیف کو بھول کر صرف اسی کا علاج کرانے پر مُصر ہوتا ہے۔ جب اس مرض میں کچھ افاقہ ہوتا ہے یا وہ ٹھیک ہوتا ہے تو کوئی دوسرا دبا ہوا مرض ابھر آتا ہے اس طرح دوسرا، تیسرا ابھرتا رہتا ہے، اگر مستقل مزاجی کے ساتھ مریض علاج کراتا ہے تو پھر ایسا مریض بالکل تندرست بھی ہوجاتا ہے اور تمام عفونتیں (میازم) سے جان چھوٹ جاتی ہے۔ بصورت دیگر امراض جسم میں گھومتے رہتے ہیں اور مریض ڈاکٹروں کے

گرد اور یہیں مریض غلطی کر بیٹھتے ہیں؟

ایسی صورتوں میں چونکہ یقیناً مریض کو افاقہ نہیں ہوتا اور مریض سے زیادہ اس کے دوست اقرباء، واہل وعیال اس کو طرح طرح کے مشورے دیتے ہیں، کوئی اس کو دوائیوں کے متعلق بتاتا ہے، کوئی کسی اور حکیم اور ڈاکٹروں کا مشورہ دیتا ہے۔

یہ صورتِ حال اکثر اوقات بڑی زیادتی کا سبب بنتی ہیں کیونکہ مریض اپنے مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے لوگوں کی باتوں پر عمل شروع کردیتا ہے۔ یا تو وہ ان ادویات کا استعمال شروع کردیتا ہے جو لوگ اس کو دیتے ہیں یا بتاتے ہیں یا ان کے بتائے ہوئے ڈاکٹروں وغیرہ کے پاس جاتا ہے۔

اس تمام گفتگو سے یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ کی صحت میں حائل رکاوٹیں کیا ہیں لیکن ہم مختصراً اس کا پھر اعادہ کرتے ہیں۔

۱۔ اپنے کھانے پینے رہن سہن کی غلط عادات، کام و آرام کے درمیان توازن کا نہ ہونا، تفکرات، درحقیقت اسلام سے دوری اس کا سبب ہے۔

۲۔ ہماری روح سوچ وفکر، عادات واطوار سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہمارا جسم متاثر ہوتا ہے اور جسم کا کوئی اہم عضو متاثر ہونے سے پہلے چھوٹی موٹی بیماریوں کی صورت میں قدرت ہمیں الارم دیتی رہتی ہے۔

۳۔ جب ہم الارم کا احساس نہیں کرتے اور اس کے لیے صحیح علاج یا تدابیر اختیار نہیں کرتے تو پھر یہ بیماریاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں اور نسل درنسل بھی منتقل ہوتی رہتی ہیں اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہوسکتی ہیں۔

ان سے چھٹکارا بعض حالتوں میں زیادہ آسان نہیں ہوتا کیونکہ یہ عفونتیں (میازم) سورا فلس اور سائیکوسس کبھی مرکب حالت میں یا کبھی یکے بعد دیگرے نمودار ہوتی ہیں۔

۴۔ ان کا تدارک اسی طرح ممکن ہے کہ

۱۔ خود دواؤں کا استعمال نہ کریں جیسا کہ آج کل اخباروں میں دوائیوں کی اشتہار بازی کی جارہی ہے ان غیر معیاری ادویات کو استعمال نہ کیا جائے۔

۲۔ رجسٹرڈ کوالیفائیڈ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا انتخاب کریں، اس پر اعتبار کرکے اس کو اپنے خاندان کی اور اپنی بیماری کی کیفیات سے آگاہ کریں، باقاعدگی سے اس سے علاج کروائیں اور اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق عمل کریں اس طرح تکلیف یقیناً کم ہوگی اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کو جلد از جلد اور مستقل شفا حاصل ہوگی۔

آپ لوگوں کی جان کاری کے لیے یہ سلسلہ ہم نے شروع ہی اس لیے کیا ہے کہ بیماریوں کے اسباب کے متعلق آگاہی فراہم کریں تاکہ نہ صرف یہ کہ آپ ان سے بچ سکیں بلکہ جب مبتلائے مرض ہوں تو علاج بھی صحیح طور پر کراسکیں۔

طبی مشورے

ناک کا گوشت، ہڈی اور سائنوسائٹس

محترم ڈاکٹر صاحب: آداب!

میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور ہومیو کلینک ضرور پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ دس سال سے الرجی ہے۔ پہلے پہل مجھے زکام لگا۔ اور ناک بند ہوگئی۔ میں نے بہت علاج کروایا۔ ایکسرے بھی کروائے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ناک میں بائیں طرف ہڈی بڑھ گئی ہے۔ میں نے آپریشن نہیں

کروایا، لیکن ڈاکٹری، حکیمی..... اور ہومیو علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا، مجھے سردی گرمی زکام نزلہ رہتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں جو مجھے ریشہ نہ آیا ہو۔ اب جب الرجی کا دورہ ہوتا ہے تو ناک کے اندر والے سوراخ یعنی جو منہ کی طرف ہیں... بہت جلن ہوتی ہے۔ چھینکیں آتی ہیں۔ ناک فوراً بند ہوجاتی ہے۔ جلن اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جیسے آگ لگی ہو یا مرچیں لگ جائیں۔ ریشہ اتنا ہوتا ہے کہ قطرے گرتے ہیں۔ دو تین دن پہلے سو کر جب اٹھتی ہوں تو سر کے سائڈ اور پیچھے کی طرف درد ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سر میں روڑے ہوں۔ سجدے میں جاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ماتھا کھنچ رہا ہو اور چکر آتے ہیں۔ ریشہ گلے پر گرتا ہے تو کھانسی آتی ہے۔ لیکن کھانسی کچھ دن کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔

نوٹ: ریشہ بعض اوقات گٹھلیوں کی طرح ہو کر منہ کے راستے نکلتا ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے دماغ پگھل کر نکل رہا ہو۔ کبھی سبز اور کبھی سفید ہوتا ہے لیکن ریشہ ختم نہیں ہوتا۔ اب تو ناک بھی زیادہ بند ہونے لگی ہے۔ روزانہ گولی کھاتی ہوں لیکن الرجی اس کے باوجود بھی ہوتی ہے۔ میں نے ہر قسم کی گولیاں، ناک بند ہونے کے اسپرے قطرے سب استعمال کرلیے ہیں۔ لیکن آرام نہیں آیا۔ اب سب کہتے ہیں کہ اسلام آباد جاؤ۔ میری عمر 46 سال۔ قد 5.4 فٹ۔ وزن بہت زیادہ ہوگیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے جو کہ موروثی ہے۔ تقریباً 160/95 تو رہتا ہے۔ ..... میں گولی روزانہ کھاتی ہوں۔ میں ٹیچر ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گرد مٹی سے بچو لیکن یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمارے اسکول میں بہت گرد ہے۔ ناک پر کپڑا رکھنے کے باوجود بھی اثر ہوتا ہے۔ ریشہ اتنا آتا ہے کہ اکثر سر اور چہرے کی ہڈیوں میں درد رہتا ہے۔ دوائیاں بہت زیادہ استعمال کرتی ہوں، مجبوری ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جو میں گولی نہ کھاؤں۔ پنڈلیوں اور گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ ٹانگوں پر زور دے کر ٹیکسی پر یا اوپر نیچے نہیں چڑھ سکتی۔ ڈاکٹر صاحب میں نے بڑی امید سے یہ خط لکھا ہے۔ میں اب دوائیاں کھا کھا کر تھک گئی ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی ایسی دوائی دیں تاکہ میں بھی نارمل زندگی گزار سکوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں بڑی لیٹ خط لکھ رہی ہوں لیکن مجھے امید ہے آپ جواب ضرور دیں گے شکریہ۔ (والسلام: فقط نائلہ دین پور)

جواب! بی بی نائلہ آپ کو کرانک Sinusitis اور DNS. Polyps ہیں اس کے لیے دھول مٹی سے بچائیں، ماسک کا استعمال کریں......... نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کو ناک میں اوپر چڑھائیں صبح اور شام ساتھ میں ڈاکٹر ولمار شوابے کی Marum Varum 30 کے 5 قطرے 3 مرتبہ۔ Glonine 30 اور Calc carb 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

چہل قدمی کی عادت ڈالیں۔ کھانے میں مرغی نمک اور ٹھنڈی کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

☆......☆......☆